کردار کے غازی

مقبول جہانگیر

297.992
69 ک
96323

Marfat.com

Marfat.com

کردار کے غازی

مقبول جہانگیر

DATA ENTERED

خورشید مقبول پریس۔ کمال گنج، بلال گنج، لاہور

Marfat.com

297.9924
69
۹۶۳۲۳

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ

2008ء

ناشر ------ خورشید مقبول پریس

کمپوزنگ ------ بسم اللہ کمپوزنگ سنٹر

پرنٹر ------ خورشید مقبول پریس

قیمت ------ -/300روپے

خورشید مقبول پریس کمال گنج / بلال گنج ــ لاہور

Marfat.com

ملت اسلامیہ کے نوجوانوں کے نام

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

رسول صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی تمام زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ عمل ہے۔

تا تو ایں نکتہ نہ فہمی زسرنو، تو کجا
نے توانی کہ بہ منزل برسی' بے خبرا!

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

تعارف ---------------------------------- 9

مہر علی شاہ گولڑویؒ ------------------------ 13

نذیر حسینؒ ------------------------------ 35

سید وارث علی شاہؒ ------------------------- 54

مولانا محمد یعقوبؒ -------------------------- 76

مولانا اشرف علی تھانویؒ (1) ------------------ 86

مولانا اشرف علی تھانویؒ (2) ------------------ 102

توکل شاہ انبالویؒ -------------------------- 125

مولانا خلیل الرحمٰن مدنیؒ ---------------------- 147

مولانا محمد زکریاؒ -------------------------- 168

قاری عبدالرحمٰن پانی پتیؒ ---------------------- 189

Marfat.com

Marfat.com

تعارف

یہ 1950ء کے عشرے کی بات ہے' میں روزنامہ "تسنیم" لاہور میں کام کرتا تھا' برصغیر کے مشہور صحافی (سابق مدیر سہ روزہ "مدینہ" بجنور) ملک نصراللہ خاں عزیز مدیرِ اعلیٰ تھے اور موجودہ پاکستان کے صاحبِ طرز اداریہ نگار جناب ارشاد احمد حقانی اخبار کے رئیس التحریر' میں پہلے نیوز ایڈیٹر تھا پھر بعد میں ادارۂ تحریر کا رکن بنا نیوز ایڈیٹری میں رات کے وقت ڈیسک پر کام تھا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کرنا پڑتا اور پروف ریڈنگ بھی' عجیب بات تھی کہ پروف ریڈنگ پر ایک کاتب کی لکھائی میں کبھی کوئی غلطی نہ نکلتی۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ترجمہ کرنے والے احباب کی اردو میں کوئی جھول ہوتا تو ساتھ کے ساتھ اس کی بھی اصلاح کر دی جاتی۔ عمر تو میری بھی اُن دنوں کچھ زیادہ نہ تھی۔ 50ء کے آخری سالوں میں یہی کوئی سترہ اٹھارہ برس کی ہوگی مگر یہ کتابت کرنے والا نوجوان مجھ سے بھی زیادہ نو عمر تھا پھر چھوٹے قد قامت کی وجہ سے تو بالکل ہی بچہ لگتا۔ آہستہ آہستہ اس کے ادبی ذوق کی وجہ سے اس سے بے تکلفی ہوتی چلی گئی۔ اب جو اخبار کے دفتر کے علاوہ نشستیں جمنے لگیں تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت تو بلا کی چیز ہیں۔ ذہانت اور فطانت کا مجسمہ حافظے میں لاثانی' شعر و ادب میں بزرگوں کی نشانی' مطالعہ کے دھنی اور دل کے غنی .... اور دل کے اس غناء میں روحانیت اور تصوّف کا ذوق بھی شامل تھا جو جماعت اسلامی کے ترجمان اخبار میں کام کرنے والے اس ہیڈ کاتب میں ایسے نظر آتا تھا جیسے پت جھڑ کے موسم میں کسی شاخِ تازہ پر خوشبوئیں بکھیرتے ہوئے ایک گلاب کا وجود۔ روزنامہ "تسنیم" کے یہ

Marfat.com

نوجوان ہیڈ کاتب جناب مقبول جہانگیر تھے۔

پھر آہستہ آہستہ یہ مے کدہ ویران ہو گیا........ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند..........

"تسنیم" بند ہو گیا اور میں نے بھی سہ روزہ "کوثر" اور روزنامہ "تسنیم" میں کام کرنے کے بعد ہفت روزہ "شہاب" جاری کر لیا اُدھر مقبول جہانگیر بھی کتابت سے باقاعدہ صحافت میں آ گئے۔ قومی ڈائجسٹ 'اردو ڈائجسٹ' سیارہ ڈائجسٹ اور نہ جانے کن کن ڈائجسٹوں کے مدیر بنے ان کے رشحاتِ قلم آب و تاب سے شائع ہونے لگے۔ میں اسلام آباد آ گیا تو ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ تو ختم ہو گیا مگر ان کی علمی اور ادبی کاوشیں برابر نظر سے گزرتی رہیں پھر ایک وقت آیا کہ وہ روزنامہ امروز کے ادارتی عملے میں شامل ہو گئے اور "حرف و حکایت" کے زیرِ عنوان ان کا فکاہی کالم ہر خاص و عام سے خراجِ تحسین وصول کرنے لگا۔ پھر نہ جانے اس چاند کو کس کی نظر لگ گئی' جواں سالی میں مہم جوئی کی ٹھان لی۔ ابھی ان کے قدردانوں کو ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں کہ ملکِ عدم کی سیر پہ چل کھڑے ہوئے۔ تصوّف کا ذوق تو تھا ہی حضرتِ حق سے ملنے کی بے تابیاں انہیں ہمارے ہاتھ سے نکال لے گئیں۔

دیکھو جسے ہے راہِ فنا کی طرف رواں
تیرے محل سرا کا یہی راستہ ہے کیا

مقبول جہانگیر کسی مکتب یا کالج کی پیداوار نہ تھے' غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے شاید ان کے والدین تعلیم کے اخراجات ہی نہ اٹھا پاتے' انہوں نے جو کچھ پایا اپنی لگن سے پایا، کتابت کے میدان میں تھے تو "مقبول رقم" کہلاتے تھے' ادب و صحافت میں فتوحات حاصل کیں تو "جہانگیر" بن گئے۔ یوں تو ان کی سب تحریریں میں ہمیشہ ذوق و شوق سے پڑھتا رہا' ان سب میں ان کے مخصوص رنگِ تحریر کی دلآویزی پائی جاتی تھی مگر اکابر' صوفیا' علماء اور ادباء پر ان کی نگارشات کی شان ہی جداگانہ تھی' افسانوی اور رومانی ماحول میں ادب و عقیدت میں ڈوب کر بڑے بڑے علمی اور دینی حقائق وہ اس خوبصورتی سے لکھتے تھے کہ انہیں پڑھ کر دل و دماغ کی گرہیں کھلتی چلی جاتیں' مادیت زدہ فضاؤں میں روحانیت کی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگتیں' فرقہ پرستانہ جہالت کے حبس میں دین و دانش کا ابرِ گہربار برسنے لگتا یہ تحریریں لکھتے وقت ان کے اندر کا افسانہ نگار جاگ اٹھتا وہ پہلے سے موجود لمحوں کا تعلق قاری سے کاٹ دیتے اسے اپنے من پسند ماحول میں لے جاتے وہ یوں محسوس کرتا جیسے وہ یہ واقعات پڑھ نہیں رہا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ کردار اسے اپنے سامنے چلتے پھرتے نظر آتے۔ اسے لگتا جیسے وہ خود اس مضمون کا حصہ ہے اس پر یہ سب کچھ بیت رہا ہے' گزر رہا ہے' جو حلاوت اور سلاست میں نے مقبول جہانگیر کے ان مضامین میں پائی وہ مجھے اور کہیں نظر نہیں آئی۔

یہ مضامین اپنے لکھنے والے کی وسعتِ مطالعہ کا بھی منہ بولتا ثبوت ہیں ان میں جن شخصیات پر قلم اٹھایا گیا ہے وہ ہماری تاریخ کی تو متاعِ عزیز ہیں مگر بدقسمتی سے اس دور میں پڑھے لکھے کہلانے والے

Marfat.com

اصحاب بھی ان کے کارناموں (بلکہ بعض کے توناموں سے بھی) نا آشنا ہیں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ مخصوص حلقہ ہائے تصوّف سے وابستہ افراد کو چھوڑ کر دوسرے باخبر اصحاب میں سے توشاید ہی کسی نے برہان الدّین غریب، توکل شاہ انبالوی اور حضرت میاں نذیر حسین کا نام سنا ہو۔

مقبول جہانگیر کا کمال یہ تھا کہ وہ تاریخ کے انبار سے وہ گوہر ڈھونڈ کر لاتے جن کی آب و تاب پر وقت نے اخفاء کے پردے ڈال دیئے ہیں، یہ وسعتِ نظر بھی ان کا خاصہ تھا کہ وہ بیک وقت بریلوی، دیوبندی، اہلحدیث اور شیعہ تمام مکاتبِ فکر کے اکابر کا یکساں احترام کرتے اِس دور میں وہ لوگ کہاں ملتے ہیں جو ایک ہی وقت میں حکیمُ الامّت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا بھی ادب و عقیدت سے تذکرہ کریں اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلویؒ کے بھی حلقہ بگوش ہوں، حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ اور حاجی سید وارث علی شاہؒ سے بھی محبت کا تعلق رکھتے ہوں اور میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ اور حضرت مولانا محمد زکریاؒ اور حضرت رائے پوریؒ کے بھی والہ و شیدا ہوں یہ وسعتِ قلب اللہ تعالیٰ نے مقبول جہانگیر کو ان کے ذوقِ تصوّف کے عوض عطا فرمائی تھی وہ جانتے تھے کہ ہرچند کہ ان حضرات میں بعض ذوقی امور پر اختلاف پایا جاتا تھا مگر یہ سب کے سب ہماری تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہیں ان کا اختلاف نفسانیّت پر مبنی نہ تھا حقانیّت کے جذبے پر مبنی تھا۔ بڑے آپس میں کسی بات پر خفا بھی ہو جائیں تب بھی چھوٹوں کا کام یہی ہے کہ وہ سب کی عزّت کریں سب کا ادب و احترام کریں۔ ایک بزرگ کے حلیف بن کر دوسرے کے حریف نہ بن جائیں، وہ باتیں نہ دہرانے لگیں جو ان حضرات نے اختلاف اور خفگی میں ایک دوسرے کے بارے میں کہی ہیں، بھائی کبھی ایک بھائی کو سخت سست کہہ بھی دیتا ہے لیکن وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ وہی کلمات کوئی دوسرا بھی اس کے بھائی کے بارے میں کہنے کی جسارت کرے جن کا حق ایک ہم سر اور ایک بھائی کو تو پہنچتا ہے کسی کہتر اور کسی غیر کو نہیں پہنچتا۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے اولیائے کرام اور صلحائے امت کو صرف خوارقِ عادات اور کرامتوں کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے کوئی یہ نہیں سوچتا کہ شریعت کے سانچے میں ڈھل کر پوری زندگی گزار دینا ہی ان کی سب سے بڑی کرامت ہے۔ یہ زندگیاں کردار سے بھی عبارت تھیں اور پیار سے بھی، یہی تلوار تھی جس نے دلوں کو فتح کیا یہ حضرات گناہ گاروں سے نفرت نہیں کرتے تھے انہیں سینے سے لگاتے تھے، تکبّر انہیں چھُو تک نہیں گیا تھا یہ عاجز، مسکین اور مٹے ہوئے لوگ تھے ان کے نفس متورّم نہ تھے، سُوجے ہوئے نہ تھے، ان کی باگ ڈور ان کے نفس کے ہاتھ میں نہ تھی، نفس کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھی۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر تصوّف کے تمام سلسلے سیدنا علی مرتضیٰؓ پر منتہی ہوتے ہیں اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ابو تراب کی کنیت عطا فرمائی تھی۔ یہ مٹی کا باپ ہونا سیدنا علیؓ کی ذات والاصفات کے لئے بے شمار استعارے اپنے اندر رکھتا ہے مگر اس کا ایک واضح اور نمایاں پہلو آپ کی عاجزی اور خاکساری ہے کہ یہی تراب (مٹی) کا خاصا ہے جو چلنے والوں کے پیروں میں بچھ بچھ جاتی ہے انیس نے خوب کہا

Marfat.com

انیسؔ عمر بسر کر دو خاکساری میں
کہیں نہ یہ کہ غلامِ ابوترابؓ نہ تھا

خوشی کی بات ہے کہ مقبول جہانگیر کی ان تحریروں میں ان کا نقطۂ نظر بڑا متوازن ہے۔ وہ خوش عقیدگی اور ضعیف الاعتقادی میں فرق کرنا جانتے ہیں۔ انہوں نے ان اکابر کو فرشتہ بنانے کی کوشش نہیں کی 'انسان کے روپ میں دیکھا اور دکھایا ہے 'ان کے مسلکِ اتحاد کو اجاگر کیا ہے 'فراخدلی اور رواداری کی مثالیں دی ہیں 'ان کے عشقِ رسولؐ کی منظر کشی کی ہے انسان دوستی کے نظارے دکھائے ہیں وہی نظارے جنہیں دیکھنے کے لئے آج ہماری آنکھیں ترس رہی ہیں۔

یہ تحریریں اب تک ڈائجسٹوں اور رسالوں میں مدفون تھیں 'مقبول جہانگیر کی اہلیہ محترمہ امینہ عنبریں ہمارے شکریئے کی مستحق ہیں کہ انہوں نے جواں مرگ مقبول جہانگیر سے حقِ رفاقت نبھاتے ہوئے انہیں محنت اور سلیقے سے یکجا کر دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ کتاب ہمارے ادبی، دینی اور ثقافتی لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے اور مجھے امید ہے کہ دین و دانش سے تعلق رکھنے والے اصحاب اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کریں گے۔

کوثر نیازی

Marfat.com

مہرعلی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ

راولپنڈی سے گیارہ میل کے فاصلے پر کوہ مارگلا کے دامن میں ایک قصبہ آباد ہے جسے گولڑہ کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ یہاں کسی زمانے میں ایک قدیم قوم آباد تھی 'اسے گولڑہ کہتے تھے۔ یہ قصبہ اسی قوم کے نام پر مشہور ہوا۔ ایک صدی قبل یہ جگہ سکھوں کی عملداری میں، سکھ قلعے دار کا صدر مقام تھی۔ قلعے اور تحصیل کے کھنڈر اور آثار ابھی تک موجود ہیں۔ سکھوں سے قبل اس علاقے پر افغانوں کا قبضہ تھا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی کے آخر میں احمد شاہ ابدالی کے انتقال پر رنجیت سنگھ نے 'جو افغانوں کی طرف سے پنجاب کا صوبے دار تھا' خودمختاری کا اعلان کر دیا اور پنجاب کے ساتھ اس علاقے کو بھی اپنی عملداری میں شامل کر لیا۔ گولڑہ میں حسنی سادات کا ایک خاندانِ عالی مقام مدت مدید سے آباد تھا۔ اس خاندان کے مشائخ اور پیرزادگان کا قرب وجوار میں اپنے تقویٰ وورع اور پاکیزگیٔ نفس کے باعث نہایت احترام کیا جاتا تھا۔ اس عظیم اور محترم خاندان میں یکم رمضان المبارک 1275ھ مطابق 14 اپریل 1859ء بروز سوموار ایک آفتاب طالع ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان اپنی جنگِ آزادی کے خونیں دَور سے گزر کر مکمل طور پر انگریزوں کے پنجۂ استبداد میں آچکا تھا۔ سلطنتِ مغلیہ ہمیشہ کے لئے دم توڑ چکی تھی۔ دینِ اسلام کی ہدایت وعلم کے روشن چراغ انقلابِ زمانہ کے ہاتھوں یا تو گل ہو چکے تھے یا قید و بند کی صعوبتوں میں ایامِ حیات گزار رہے تھے یا ترکِ وطن کر کے برِ صغیر سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے تھے چنانچہ ایسے وقت جبکہ ایک غیر مسلم مادہ پرست قوم کے علم واقتدار اور نظریات کا عفریت مسلمانانِ ہند پر سوار ہو رہا تھا اور اس خطے

Marfat.com

میں اسلامی شریعت وطریقت اور روحانیت کے لئے گوناگوں مشکلیں پیدا ہو گئی تھیں اور اسلامی اقدار یکسر مٹتی نظر آتی تھی، اللہ تعالیٰ نے ایسی پاک ہستیوں کو عالم وجود میں لانا پسند فرمایا جن کی علمی اور روحانی قوت سے نہ صرف اسلام، مادہ پرستی کے مسموم اثرات سے محفوظ رہا بلکہ مسلمانوں میں حیاتِ نو کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے جو بالآخر اس برِّ صغیر میں مسلمانوں کی ایک آزاد حکومت کے منقۂ شہود پر آنے کا باعث ہوئے۔

اور انہی پاک ہستیوں میں سے ایک ہستی حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ جیلانی، رزّاقی، قادری، چشتی (نظامی وصابری) حنفی قدّس سرّہٗ کی ہے۔ یہ اوراق انہی کے تذکرے سے روشن ہیں۔ سیّد مہر علی شاہ کا نسبی سلسلہ پچیس واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور چھتیس واسطوں سے حضرت سیّدنا امام حسن رضی اللہ عنہ سے جا ملتا ہے۔ سیّد مہر علی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے منجھلے بیٹے سیّد تاج الدین عبدالرزّاق کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کے دوسرے فرزند سیّد ابو صالح جو مفتیٔ عراق کے منصبِ جلیل پر فائز تھےؒ ان کے صاحبزادے ہوئے ہیں سیّد علی بغدادیؒ۔ "تحفۃ الابرار" میں ان کے علم و فضل اور تصانیف کا تفصیل سے ذکر ملتا ہے۔ سیّد علی بغدادی قادریؒ کی چوتھی پشت میں حضرت سیّد تاج الدین محمود قادری رزاقیؒ نویں صدی ہجری میں سب سے پہلے سلسلۂ عالیہ قادریہ رزّاقیہ کا انعامِ الٰہی لے کر بنگال پہنچے۔ ان دنوں سلاطینِ بنگالہ کا پایۂ تخت گوڑ تھا۔ سلطانِ وقت فیروز شاہ نے آپؒ کی خانقاہ کے لئے جاگیر مقرر کی اور آپ کافی عرصہ تبلیغ فرمانے کے بعد اپنے صاحبزادے سیّد ابی الحیات کو مسندِ ارشاد پر چھوڑ کر واپس بغداد شریف چلے گئے۔

حضرت سیّد ابی الحیات ہمایوں ابنِ بابر بادشاہ کے دور تک زندہ رہے۔ ان کی وفات پر ان کے صاحبزادے میراں شاہ قادر قمیصؒ جانشین ہوئے اور برِّ صغیر ہند میں عظیم شہرت حاصل کی۔ ہمایوں اور شیر شاہ سوری میں جنگوں کے باعث ملک میں بدامنی پھیلی تو شاہ قمیصؒ بغداد چلے گئے اور کئی برس بعد امن بحال ہونے پر گنگوہ واپس پہنچے۔ اس وقت حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور ان کے خلفائے عظام کا بڑا شہرہ تھا۔ "لطائفِ قدوسی" میں لکھا ہے قطب العالم شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ نے بایں جلالت شان و کہولت عمری، شہر سے باہر نکل کر حضرت مخدوم شاہ قمیصؒ کا استقبال کیا اور کچھ عرصے اپنا مہمان بنا کر سلسلۂ عالیہ چشتیہ صابریہ کے اوراد و وظائف مرحمت فرمائے۔

حضرت مخدوم شاہ قمیصؒ گنگوہ سے بنگال گئے مگر وہاں حالات سازگار نہ پا کر موجودہ اضلاع انبالہ اور سہارنپور (بھارت) کے قصبہ ساڈھورا میں سکونت اختیار کی۔ 983ھ میں جب شہنشاہ اکبر نے بہار فتح کیا تو حضرت مخدومؒ کو بنگالہ کے سلطان بایزید کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ اسی زمانے میں بہار کا ایک ہندو راجہ اور اس کی رانی شاہ قمیصؒ کی روحانیت سے متاثر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ شاہانِ مغلیہ نے آپؒ کی خانقاہ کے لئے چھ گاؤں نذر کئے تھے جو انگریزی دور تک رہے۔ شیخ عبدالرزّاق المعروف شیخ بہلولؒ آپؒ

Marfat.com

ہی کے خلیفہ تھے جو علم شریعت وطریقت میں کامل بزرگ ہوئے ہیں۔

شاہ قمیص ؒ کی اولاد میں سے ایک بزرگ سید صادق علی شاہ ' حضرت مولانا فخرالدین فخر جہاں دہلوی چشتی نظامی کے خلیفہ مجاز ہو کر دہلی سے بہار اور بنگال کی سیاحت فرماتے ہوئے لنکا تشریف لے گئے اور تبلیغ دین فرماتے رہے۔ وہیں انتقال کیا۔ زمانۂ قریب میں شاہ قمیص ؒ کی اولاد میں سے حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی اور حضرت شاہ سلیمان صاحب پھلواروی (صوبہ بہار) جیسی مایۂ ناز ہستیاں گذری ہیں۔ مخدوم شاہ قمیص ؒ کی تیرھویں پشت میں پیر سید روشن دین ؒ اور پیر سید رسول شاہ ؒ ہوئے ہیں۔ یہ دونوں بھائی قصبہ ساڈھورا سے نکل کر قصبہ گولڑہ میں آباد ہوئے۔ ان دنوں دہلی کے تخت پر شاہ عالم ثانی بیٹھا ہوا تھا اور بنگال پر انگریزوں کا قبضہ تھا' پنجاب پر سکھ قابض ہو رہے تھے' مرہٹے اور انگریز دہلی پر نظریں لگائے بیٹھے تھے' اس لئے ان دونوں حضرات نے پنجاب کے اس شمال مغربی گوشے کو جائے امن اور مقاصدِ تبلیغ وارشاد کے لئے موزوں خیال کرتے ہوئے ساڈھورا سے نقل مکانی کر کے گولڑہ کو منتخب فرمایا۔ سید روشن دین ' سید مہر علی شاہ کے دادا حضرت سید غلام شاہ کے والد بزرگوار تھے۔ سید روشن دین کے بیٹے سید غلام شاہ کی شادی اپنے چچا پیر سید رسول شاہ کی صاحبزادی اور سید فضل دین شاہ کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی۔ اس رشتے سے پیر سید نذر دین شاہ تولد ہوئے جو سیّد مہر علی شاہ گولڑوی کے والد بزرگوار تھے۔ پوٹھواری زبان میں والد کو "اجی" کہتے ہیں' اس لئے آپ حضرت اجی صاحب کے نام نامی سے مشہور ہوئے۔ آپ مادر زاد ولی تھے۔

سیّد مہر علی کی ولادت کے بارے میں مشہور ہے کہ حضرت پیر سیّد فضل دین اس امر پر مطلع تھے کہ اس گھر میں ایک نورانی چراغ روشن ہونے والا ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ سیّد مہر علی کی ولادت سے چند روز پیشتر ایک عمر رسیدہ مجذوب خانقاہ میں آ کر مقیم ہو گئے تھے اور عنقریب پیدا ہونے والے ایک مقبولِ خدا کی زیارت کا ذکر کرتے تھے' چنانچہ جب سیّد مہر علی تولد ہوئے تو یہ مجذوب حرم سرائے کی ڈیوڑھی میں پہنچے' نومولود کو باہر بلوا کر ہاتھ پاؤں چومے اور رخصت ہو گئے۔

سیّد مہر علی کی پرورش آپ کے ماحول اور خاندان شریف قادریہ کی مسندِ ارشاد پر جلوہ فگن حضرت پیر فضل دین کی نگرانی میں ہوتی رہی' یہاں تک کہ سیّد مہر علی چار سال کے نہ ہوئے تھے اور عربی کا پہلا قاعدہ پڑھتے تھے۔ ایک روز سیّد فضل دین ظہر کی نماز کے لئے باہر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ سیّد مہر علی خانقاہ سے باہر جھاڑیوں میں قاعدہ لئے سو رہے ہیں۔ جگہ سایہ دار نہ تھی اور زمین آفتاب کی تمازت سے تپ رہی تھی۔ سیّد فضل دین نے اسی وقت اپنے چھاتے سے سایہ کیا اور اٹھوا کر گھر بھجوانے کے لئے خادم کو بلایا۔ جب تک خادم نہ آیا خود سیّد مہر علی شاہ پر سایہ کئے کھڑے رہے اور فرمایا یہ ابھی معصوم ہے' اسے معلوم نہیں کہ ایک روز یہ کیا ہونے والا ہے۔ بہت عرصے بعد خود سیّد مہر علی شاہ اپنا وہ زمانہ یاد کر کے فرمایا کرتے تھے بچپن میں مجھے آبادی سے ایک گونہ وحشت اور ویرانوں میں جی لگنے کا احساس ہوتا تھا۔ رات کو جب

Marfat.com

والدین سو جاتے تو دروازے کی زنجیر کھول کر باہر نکل جاتا اور رات کا بیشتر حصہ سامنے والے پہاڑی نالے کے کھڈوں اور جھاڑیوں میں گزارتا' ساتھ والے جنگل میں پھرتا تھا۔ جب ذرا بڑا ہوا تو اس وحشت کے ساتھ ساتھ طبیعت میں گرمی اور حدّت اس قدر زیادہ ہو جاتی کہ سخت سردی کے ایام میں بھی بعض اوقات نالے کے ٹھنڈے پانی میں غسل کرتا اور یخ بستہ یعنی جمے ہوئے پانی کے ٹکڑوں کو جسم پر ملا کرتا۔

سید مہر علی کو قرآن پڑھنے کے لئے خانقاہ کے درس میں' اردو فارسی کے لئے مدرسے میں داخل کیا گیا۔ عمر اتنی کم تھی کہ خادم اٹھا کر آپ کو لے جاتا اور واپس لاتا۔ مدرسے کے طالب علموں نے راولپنڈی جا کر امتحان دیا۔ ممتحن ایک انگریز تھا۔ اس نے سب سے پہلے سید مہر علی ہی سے پوچھا: "باید کا مصدر کیا ہے"؟ آپ نے فوراً مصدر بتادیا۔ اس نے ساری جماعت کو یہ کہہ کر پاس کر دیا کہ جب اس قدر کم سن بچہ ایسا صحیح جواب دے رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ استاد کی تعلیم اچھی ہے اور پوری جماعت لائق ہے۔ حافظے کی یہ حالت تھی کہ قرآن مجید کا روزانہ سبق آپ حفظ کر کے سنا دیا کرتے۔ جب قرآن کریم ختم کیا تو اس وقت تک تمام قرآن مجید آپ بلا ارادہ حفظ کر چکے تھے۔ عربی' فارسی اور صرف و نحو کی تعلیم کے لئے حضرت پیر فضل دین نے علاقہ پکھلی ہزارہ کے مولوی غلام محی الدین کو مقرر فرمایا تھا۔ انہوں نے سید مہر علی کو کافیہ تک تعلیم دی۔ کچھ عرصہ بعد مولوی صاحب نے پیر فضل دین سے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے صاحبزادے کو ایسا ذہن رسا اور اعلیٰ دماغ عطا فرمایا ہے کہ ہر سبق حفظ سنا دینے کے علاوہ بعض اوقات ایسے دقیق سوالات کرتا ہے کہ ان کا جواب دینے سے میں عاجز ہو جاتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اب سید مہر علی کی تعلیم کا صحیح حق ادا نہیں کر سکتا انہیں کسی بڑے فاضل استاد کے پاس جانا چاہئے۔ چنانچہ اس کم سنی کے زمانے میں موضع بھوئی علاقہ حسن ابدال جا کر فاضلِ اجل مولانا محمد شفیع قریشیؒ کے درس میں داخل ہوئے۔ یہاں سید مہر علی نے دواڑھائی سال میں رسائلِ منطق "قطبی" تک اور نحو اور اصول کے درمیانہ اسباق کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد موضع انگہ علاقہ سون ضلع شاہ پور سرگودھا میں مولانا سلطان محمود کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ موضع انگہ' گولڑہ سے سو میل کے فاصلے پر ہے۔ گھر والے سید مہر علی کو ہر ماہ جو خرچ بھیجا کرتے آپ اسے نادار طالب علموں میں تقسیم کر دیتے اور خود عموماً روزے یا فاقے سے رہتے۔ جب بھوک ستاتی تو طلبہ کے جمع کردہ ٹکڑوں میں سے کچھ تناول فرما لیتے۔ سید مہر علی کے اس جود و سخا اور ریاضت و مجاہدے کو دیکھ کر انگہ کے لوگ اور طالب علم آپ سے بے حد محبت کرنے لگے۔

ایک روز عجیب واقعہ پیش آیا۔ انگہ کے نواح میں قصیدۂ غوثیہ کے ایک عامل نے لوگوں میں اپنا اثر و رسوخ اور وجاہت قائم کر رکھی تھی۔ لوگ اسے دیکھتے ہی تعظیماً کھڑے ہو جاتے اور دست بوسی کرتے تھے۔ ایک روز وہ شخص انگہ کی مسجد میں آیا' سب لوگ تعظیماً کھڑے ہو گئے مگر سید مہر علی شاہ بیٹھے رہے۔ عامل نے ناراض ہو کر کہا: "او لڑکے! کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ پڑھوں قصیدہ؟" آپ نے کہا: "تم قصیدہ

Marfat.com

پڑھو اور میں قصیدے والے کو بلاتا ہوں"۔ ان الفاظ کا منہ سے نکلنا تھا کہ عامل صاحب پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی' اس نے آپ سے معذرت کی اور پاؤں چھوئے۔

سید مہر علی شاہ کی طبیعت پر ابتدا ہی سے عشقِ الٰہی کا رنگ غالب تھا۔ خود نہایت خوش آواز تھے اور جہاں کہیں آوازِ خوش سنتے اثر پذیر ہو جاتے۔ ان دنوں اکثر جنگل اور ویرانوں کی طرف نکل جاتے بلند آواز میں عشقیہ اور درد انگیز اشعار پڑھتے۔ تعلیم و تعلم میں بھی اس قدر انہماک تھا کہ خود پڑھنے کے ساتھ ساتھ چھوٹے درجے کے طلبہ کو بھی پڑھایا کرتے۔ بسا اوقات سردیوں کی طویل راتیں عشاء کی نماز کے بعد مطالعے میں کٹ جاتیں یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو جاتی۔ آپ کے استاد مولانا سلطان محمود حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی قدس سرہٗ سے بیعت تھے۔ وہ سال میں کئی بار سیال شریف ضلع سرگودھا اپنے پیرو مرشد کی زیارت کے لئے جایا کرتے تھے۔ سیال شریف' انگہ سے بائیس کوس کے فاصلے پر دریائے جہلم کے شرقی کنارے واقع ہے۔ سید مہر علی بھی ہمیشہ اپنے استاد کے ساتھ جاتے۔ حضرت خواجہ سیالویؒ بھی آپ پر بے حد شفقت فرمانے لگے' بالآخر سید مہر علی شاہ نے سلسلۂ چشتیہ میں حضرت ہی سے بیعت کی۔

تقریباً اڑھائی سال انگہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب آپ گولڑہ واپس آئے تو درسِ نظامی میں صَرف فلسفہ' معقول' ریاضی اور فقہ کی آخری کتابیں اور حدیث شریف میں صحاح ستہ اور تفسیر میں بیضاوی وغیرہ باقی رہ گئی تھیں۔ ان کتابوں کی تعلیم کے لئے ان دنوں عام طور پر طالب علم برِّ صغیر کے مشہور و معروف مدارس کا رخ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ سید مہر علی شاہ نے بھی آئندہ تعلیم کے لئے ایک روز "سکندر نامہ" سے فال نکالی۔ یہ شعر بر آمد ہوا ۔

ہمہ ملک ایران مرا شُد تمام
بہ ہندوستان داد خواہم لگام

اس نیک فال کو دیکھتے ہوئے 1290ھ میں سید مہر علی کانپور روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر 15 سال کی تھی۔ ارادہ تھا کہ معروف محدث مولانا احمد حسن کانپوری سے حدیث پڑھیں گے لیکن مولانا ان دنوں سفرِ حج کے لئے پابہ رکاب تھے فرمایا میاں صاحبزادے آج سے آٹھویں روز حج پر روانہ ہو رہا ہوں اس عرصے میں دو چار سبق اگر پڑھ بھی لو گے تو کیا ہو گا؟ بہتر ہے میرے استاد حضرت مولانا لطف اللہ کی خدمت میں علی گڑھ جاؤ اور ان سے پڑھو۔ سید مہر علی شاہ اس ہدایت کے مطابق علی گڑھ گئے اور مولانا لطف اللہ کے درسِ حدیث میں داخل ہوئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ' دیوبند' رام پور' کانپور' علی گڑھ' دہلی اور سہارن پور میں بڑے بڑے علمی مراکز قائم تھے۔ علی گڑھ میں مولانا لطف اللہ کی ذات گرامی شہرۂ آفاق تھی۔ آپ مفتی عنایت احمد کے شاگرد رشید تھے اور وہ مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی محدث کے مشہور شاگرد تھے۔ مولانا لطف اللہ اپنے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کے باعث برِّ صغیر کی علمی دنیا میں استاذ العلماء کہے جاتے تھے۔ مولانا کی شاگردی فضل و کمال کی سب سے اعلیٰ اور بلند ترین سند شمار ہوتی تھی۔ مولوی

Marfat.com

عبدالحق دہلویؒ مؤلف تفسیر حقانی، مولانا عبدالغنی کانپوریؒ، مولانا شاہ محمد علی رحمانی مونگیریؒ مولانا احمد حسن کانپوریؒ اور حضرت سید پیر مہر علی شاہ گولڑوی جیسی برگزیدہ ہستیاں آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔ ایک مرتبہ جامع العلوم کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر علمائے دیوبند کے مشہور پیشوا مولانا حسن محمود تقریر کر رہے تھے کہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی تشریف لے آئے۔ مولانا محمود حسن نے آپ کو دیکھتے ہی ادب واحترام کے تحت فوراً تقریر ختم کر دی۔ اسی طرح علمائے بریلوی کے مشہور پیشوا مولانا احمد رضا خاں بھی آپ کا بے حد احترام کرتے تھے۔

بہرحال علی گڑھ میں بھی سیّد مہر علی نے قریباً اڑھائی برس تعلیم حاصل کی اور اپنی قابلیت، بلند اخلاق اور مثالی کردار کے باعث اپنے استاد اور ہم مکتبوں میں نہایت مقبولیت اور توقیر پائی۔ سب آپ کی ذہانت اور نکتہ رسی کے معترف تھے۔ یہاں بھی طلبہ کا اس قدر رجوع آپ کی طرف ہوا کہ آپ کو اپنا ایک علیحدہ درس قائم کرنا پڑا۔ علی گڑھ میں تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے کوئی سند وغیرہ حاصل نہ کی کیونکہ مدارسِ اسلامیہ میں عام طور پر صرف سندِ حدیث کو کافی سمجھا جاتا تھا، جسے حاصل کرنے کے لئے آپ بالآخر سہارنپور میں حضرت مولانا احمد علی محدّثؒ کے درس میں شریک ہوئے۔ پھر کچھ عرصے بعد جب سیّد مہر علی شاہ نے اپنے استاد مولانا لطف اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے آپ کو قرآن مجید، کتب احادیث صحاح ستہ وغیرہ اور بعض خصوصی احادیث کی سندات عطا فرمائیں۔

سہارن پور میں شیخ الحدیث مولانا احمد علیؒ فنِ حدیث میں امام تصوّر کئے جاتے تھے۔ بخاری شریف پر آپ کے حواشی مولانا کی علمیّت اور قابلیّت کا بیّن ثبوت تھے۔ آپ مولانا عبدالحئیؒ لکھنوی (بحر العلوم) اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے شاگرد تھے۔ 1261ھ میں مکّے جا کر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے نواسے مولانا شاہ محمد اسحاقؒ سے دوبارہ درسِ حدیث لے کر سند حاصل کی۔ ان دنوں شیخ العرب و العجم حضرت مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکّیؒ بھی وہاں مستقل قیام رکھتے تھے۔ ایک دن حاجی صاحب نے مولانا سے کہا کہ چونکہ میں نے آپ سے گلستان کے اسباق پڑھے ہیں اس لئے آپ میرے استاد ہیں، اگر اجازت ہو تو مشورۃً عرض کرتا ہوں کہ دوسروں کے مدارس میں ملازمت کی بجائے اپنا درسِ حدیث شروع کیجئے تو زیادہ مفید رہے گا۔ مولانا احمد علیؒ نے یہ مشورہ قبول کیا۔ سرزمین حجاز سے واپس آکر سہارنپور میں حدیث کا درس شروع کیا۔ صدہا علماء کو محدّث بنا دیا۔ برِّ صغیر میں ہر طبقے کے علماء کی اکثر سندِ حدیث مولانا احمد علیؒ تک پہنچتی ہے۔ مولانا نے سیّد مہر علی شاہ کے حال پر بے حد توجہ فرمائی، ذہانت کا عالم دیکھا تو اسباق میں آپ کے ساتھ امتیازی سلوک فرمانے لگے اور نہایت محبّت ہو گئی۔ پھر سیّد مہر علی شاہ کی قلبی اور روحانی کیفیات سے آگاہ ہوئے تو مولانا نے محسوس کیا کہ یہ طالب علم ایک محققانہ بصیرت کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ عشقِ الٰہی کے بھی اعلیٰ مقام پر فائز ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے علومِ ظاہری و باطنی کے علاوہ شریعت و طریقت کی خدمت بھی لینے والے ہیں اس لئے اسے زیادہ دیر روکنا دین کی خدمت کے منافی ہے

Marfat.com

چنانچہ ایک روز اچانک اپنے دولت کدے پر سیّد مہر علی شاہ کی دعوت کی اور سندِ حدیث عطا کر کے فرمایا آپ کو مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں، وطن تشریف لے جایئے اور دین کی خدمت کیجئے۔

سیّد مہر علی شاہ نے بخاری اور مسلم شریف کی تعلیم لی تھی اس لئے سند بھی ان ہی مضامین سے متعلق تھی۔ اس پر سال 1295ھ تحریر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ تقریباً بیس برس کی عمر میں علومِ رسمیہ کی تکمیل کر کے وطن واپس آئے۔ اس کے دو سال بعد یعنی 1297ھ میں حضرت مولانا احمد علیؒ کا انتقال ہو گیا۔ گویا سیّد مہر علی ان کے دورِ آخر کے شاگردوں میں سے تھے۔ اس طرح آپ نے مولانا لطف اللہ سے بھی ان کے آخری دورِ عمر میں تکمیلِ علوم کی تھی اور شیخِ طریقت حضرت خواجہ شمس الدین سیالویؒ سے بھی خلافت ان کے آخری دور میں حاصل کی۔ یہ امر مسلّمہ ہے کہ اس عالمِ اسباب و تحصیل میں صاحبِ فن اپنے آخری دور میں ترقی و کمال کے انتہائی عروج پر ہوتا ہے اور طویل تجربے و مشاہدے کے باعث اپنے فن کی تعلیم و تدریس کے لئے مناسب ترین حالت رکھتا ہے۔

غرض واپس آتے ہی سیّد مہر علی شاہ کا نکاح اپنے ننھیال میں سیّد چراغ علی شاہ کی دخترِ نیک اختر سے بمقام حسن ابدال ہوا۔ آپ کی نانی حضرت مخدوم جہانیاں سیّد جلال بخاریؒ اوچی کی اولاد میں سے تھیں۔ گولڑہ میں سیّد مہر علی شاہ ہمہ تن درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ابتدا میں طلبہ کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی اور بہت جلد آپ کے طریقِ درس کی گرد و نواح میں دھوم مچ گئی۔ پھر تو طلبہ کے علاوہ اکثر ہمعصر علماء بھی استفادے کے لئے حاضر ہونے لگے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آپ نے سیال شریف حاضر ہو کر سلسلہ چشتیہ نظامیہ حضرت خواجہ شمس الدینؒ کے دستِ حق پرست پر بیعت کا شرف حاصل کیا۔ سلسلۂ عالیہ قادریہ جدیہ میں آپ اپنے ہی خاندان میں پہلے سے بیعت تھے۔

سیّد مہر علی شاہ فرماتے تھے کہ "مجھے ابتدا ہی سے جبرائیل علیہ السلام کے تمثلِ بشری کے واقعے سے وحدتِ وجود کی جانب ذوق گواہی دیتا تھا اور اس مسلک پر وحدت الشہود والوں کے اعتراضات و دلائل بھی میرے پیشِ نظر تھے۔ آخر مشائخِ عظام اور اپنے شیخِ طریقت کے روحانی تصوّف سے اسی عالمگیر مسلک یعنی وحدت الوجود پر طبیعت پختہ ہو گئی۔ بعد ازاں حضرت خواجہ سیالویؒ نے مجھے "فتوحاتِ مکیہ" کے مطالعے کی تاکید فرمائی، چنانچہ حضرت کی توجہ سے اس مسئلے کے بیشتر از بیشتر اسرار مجھ پر منکشف ہوتے چلے گئے"۔

اس کے بعد شیخ محی الدین ابن عربی کی یہ شہرۂ آفاق کتاب "فتوحاتِ مکیہ" ہمیشہ سیّد مہر علی شاہ کے مطالعے میں رہی اور زمانۂ ارشاد میں آپ نے سالہا سال فتوحاتِ مکیہ اور ابن عربیؒ کی دوسری کتاب "فصوص الحکم" کا درس دیا۔ حضرت خواجہ سیالویؒ نے سیّد مہر علی شاہ کے علمی اور عرفانی کمالات کے پیشِ نظر اپنے وصال سے کچھ عرصہ پہلے آپ کو تمام اشغال و وظائف کی اجازت اور بیعت و ارشاد کا منصب عطا فرما دیا تھا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سیّد مہر علی شاہ، خواجہ سیالویؒ کے آخری خلیفہ ہیں۔ یہ امر خاص

Marfat.com

طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حضرت خواجہ سیالوی ؒ کی آپ پر خاص نظرِ عنایت تھی اور انہوں نے سید مہر علی کی ' دوسرے مخلصین سے علیحدہ اور جداگانہ رنگ میں تربیت فرمائی۔ حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی ؒ متبحر عالم ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت بلند پایہ شیخِ طریقت بھی تھے۔ پیر سید مہر علی شاہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے شیخ علمِ طریقت کے مجتہد اور مجدّد تھے۔ آپ حضرت خواجۂ خواجگان سید محمد سلیمان تونسوی چشتی نظامی رحمتہ اللہ علیہ کے خلفائے عظام میں سے ہوئے ہیں اور آپ کے ارادت مندوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ سلسلۂ عالیہ چشتیہ نظامیہ کی اشاعت جس قدر حضرت سیالوی ؒ نے اپنے وقت میں کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت 1214ھ یعنی 1795ء میں بمقام سیال شریف ہوئی اور وہیں 1300ھ میں وفات پائی۔ آپ کے حالاتِ زندگی میں "مراۃ العاشقین" اور "انوارِ شمسیہ" دو کتابیں مشہور ہیں۔

حضرت سیالوی ؒ کی زندگی میں سید مہر علی شاہ کی توجہ زیادہ تر مقامی درس و تدریس ' ریاضت و عبادت ' وقتاً فوقتاً سیال شریف کی حاضری اور استفادے پر رہی۔ حضرت خواجہ سیالوی ؒ کے وصال کے بعد آپ کی بے قراری حد سے بڑھ گئی چنانچہ اربابِ فقر کے حسبِ معمول طلبِ مزید کے لئے تعلیم و تدریس کو خیرباد کہہ کر جہاں گردی اور صحرانوردی اختیار فرمائی۔ سید مہر علی شاہ کی عمر اس وقت پچیس برس کی تھی۔ شیخ ؒ کے فراق میں غم واندوہ کی عجیب کیفیت تھی۔ نماز ادا کرتے یا وظائف پڑھتے حتیٰ کہ اٹھتے بیٹھتے آپ پر گریہ طاری رہتا۔ کچھ عرصہ یہی حالت رہی پھر سفروں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ سید مہر علی کئی کئی مہینے متواتر غائب رہتے اور پتہ نہ چلتا کہ کہاں ہیں۔ کبھی اچانک واپس آ جاتے اور گولڑہ میں مختصر قیام کے بعد پھر کہیں روانہ ہو جاتے ' کبھی تنہا ہوتے کبھی کسی کو ساتھ لے جاتے۔ کہیں قیام زیادہ ہوتا کہیں کم۔ اسی دوران میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ؒ کے آستانۂ عالیہ پر بھی حاضر ہوئے اور وہاں کے کسی غیبی اشارے کے تحت واپس تشریف لا کر حجازِ مقدّس کا سفر اختیار کیا اور جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دربارِ گہربار سے محو و تمکین کے مرتبۂ عالی پر فائز المرام ہو کر بالآخر گولڑہ واپس آئے اور مسندِ ارشاد پر متمکن ہوئے۔

سفرِ حجاز کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ 1307ھ میں ایک روز اچانک اس سفر پر روانہ ہو گئے۔ لاہور کے کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں چند شوقیہ اور فراقیہ اشعار کہے تھے۔ یہ اشعار سید مہر علی شاہ کی نظر سے گذرے ' آپ پر رقت طاری ہو گئی۔ اچانک اٹھ کر ریلوے سٹیشن کی طرف چلے گئے اور ایک عقیدت مند کو کہلا بھیجا کہ میرے لوازماتِ سفر سٹیشن پر پہنچا دو۔ جب وہ صاحب ضروری چیزیں لے کر پہنچ گئے تو آپ نے لاہور کا ٹکٹ لیا اور ان سے فرمایا کہ سفر طویل ہے شام تک کسی سے ذکر نہ کرنا۔ گاڑی چلی تو وہ صاحب بے اختیار رو دیئے۔ ادھر گھر میں کسی کو خبر نہ تھی کہ آپ اتنے طویل سفر پر جا رہے ہیں۔ چند روز بعد خط آیا کہ بیت اللہ اور مدینہ منورہ کا قصد ہے۔ لاہور پہنچ کر اپنے ایک دیرینہ

Marfat.com

عقیدت منداور پیر بھائی سے فرمایا کہ حج کا ارادہ ہے۔ اسی روز انہوں نے اپنی اہلیہ کے زیور رہن رکھے اور ہمرکابی کا شرف حاصل کیا۔ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے اور جدہ پہنچ گئے۔ جہاز میں ایک صاحب درودِ مستغاث پڑھ رہے تھے 'ایک مکرانی عالم نے ندائے غائبانہ یارسول اللہ پر اعتراض کیا۔ درود پڑھنے والے صاحب نے سید مہر علی شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا تو آپ نے فرمایا جائز ہے۔ مکرانی عالم کو معلوم ہوا تو انہوں نے آپ سے اس کے جواز میں ثبوت مانگا۔ آپ نے فرمایا حدیث بخاری۔ وہ کہنے لگے حاجی رحمت اللہ مہاجر مکی تیس برس سے بخاری شریف کا درس دے رہے ہیں اور ایسی ندائے غائبانہ کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ سید مہر علی شاہ نے فرمایا حاجی صاحب بھی ہماری ہی طرح ایک انسان ہیں۔ مکرانی عالم نے کہا کیا ان کے سامنے آپ یہ فقرہ کہہ دیں گے۔ فرمایا ہاں' کہہ دوں گا۔

ان دنوں حاجی رحمت اللہ مہاجر مکی مدرسۂ صولیتہ کی صدارت پر متمکن تھے اور یہ آپ کی عمر شریف کا آخری سال تھا۔ جہاز میں سید مہر علی شاہ سے درودِ مستغاث پر گفتگو کرنے والے مکرانی عالم' حاجی صاحب کے شاگرد تھے اور وطن میں تعطیلات گزارنے کے بعد مکے واپس جارہے تھے۔ انہوں نے مکے پہنچ کر حاجی رحمت اللہ سے اس گفتگو کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا اچھی بات ہے' وہ صاحب ملیں تو انہیں لے آیئے گا' ان کے دلائل سنیں گے۔ مگر حاجی صاحب کے نائب مدرّس مولانا محمد غازی جوش میں آگئے اور انہوں نے سید مہر علی شاہ کے علم کا امتحان لینے اور آپ کو لاجواب کرنے کے خیال سے کئی مشکل کتابوں میں سے ادق علمی سوالات جمع کرنے شروع کر دیئے۔ مولانا محمد غازی موچی کڑی علاقہ اٹک کے خٹک پٹھان تھے۔ مولانا احمد حسن کانپوری سے تعلیم حاصل کی اور مکہ شریف میں حاجی رحمت اللہ صاحب سے علمِ حدیث کی تکمیل کر کے وہیں مدرسہ صولیتہ میں مدرّس ہو گئے۔ تمام علومِ متداولہ میں کمال رکھتے تھے خصوصاً علمِ تجوید و قرأت میں مہارتِ تامہ تھی۔ جب سید مہر علی شاہ سے ملاقات ہوئی تو محبت و شوق میں اس قدر خود رفتہ ہوئے کہ مدرسہ صولیتہ کی تدریس سے مستعفی ہو کر گولڑہ آگئے اور بقیہ تمام عمر اسی جگہ درس و تدریس اور فتاویٰ نویسی میں گزار دی۔ خود مولانا کا بیان ہے۔"میں نے ایک دوسرے بنگالی طالب علم سے مل کر کچھ علمی سوالات جمع کئے اور ارادہ تھا کہ سید مہر علی شاہ کا امتحان لیں گے۔ کافی تلاش کے بعد ہم نے آپ کو بیت اللہ کے سامنے مراقب پایا۔ جب قریب گئے تو آپ نے بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن آپ پر کچھ ایسی حالت طاری تھی کہ جونہی ہماری نظر پڑی' رقت طاری ہو گئی اور بحث مباحثے کا خیال دل سے جاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد آپ نے ہم سے حال پوچھا مگر ہم سے بات نہ ہو سکتی تھی۔ آخر کار میں نے آپ سے مدرسہ صولیتہ میں قیام کی درخواست کی۔ یہ درخواست قبول ہوئی اور آپ مدرسے میں تشریف لے آئے۔ ان دنوں آپ پر کچھ ایسی کیفیت طاری رہتی تھی کہ جو دیکھتا اس پر رقت طاری ہو جاتی۔ عموماً حرم شریف میں بیت اللہ کے بالمقابل یادِ الٰہی میں مستغرق رہتے۔ بہت کم گفتگو فرماتے اور جب کچھ کہتے تو اس میں بلا کی جاذبیت اور کشش ہوتی"۔

Marfat.com

وہیں مدرسے میں حاجی رحمت اللہ صاحب سے ایک دن درودِ مستغاث پر گفتگو ہوئی۔ سیّد مہر علی شاہ نے ندائے غائبانہ کے مسئلے پر صحیح بخاری کی ایک حدیث پر ایسی مدلّل، عالمانہ اور پُراثر تقریر کی کہ حاجی رحمت اللہ مہاجر مکّی مبہوت ہو گئے اور فرمایا:

"یہ تو علمِ لدُنّی ہے۔ ہم سالہاسال سے بخاری کی یہ حدیث درس میں پڑھا رہے ہیں لیکن ان معانی کی طرف کبھی ذہن نہیں گیا جو آپ نے استنباط کئے ہیں"۔ حضرت حاجی رحمت اللہ چونکہ نہایت محقق اور منصف مزاج عالم تھے اس لئے شرعی دلیل سے ندائے غائبانہ کی معقول وجہ سمجھ میں آجانے کے بعد فوراً اپنا سابقہ مسلک تبدیل فرمالیا اور پھر تو سیّد مہر علی کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ آپ سے بیعت کی استدعا بھی کی۔ مگر سیّد مہر علی شاہ نے حاجی صاحب کی عمر اور علم و فضل کا لحاظ فرماتے ہوئے بیعت لینے سے تو عذر فرمایا، البتہ وظائف اور اوراد تلقین فرمادیئے۔

ایک روز مولانا محمد غازی کی معیّت میں حضرت امداد اللہ مہاجر مکّی کے درس میں حاضر ہوئے۔ اس وقت مثنوی مولانا روم" کا سبق دے رہے تھے۔ اثنائے سبق میں ایک شعر ایسا آیا جس میں آرزوئے وصل کی شدت کا اظہار تھا۔ وہ شعر یہ تھا ۔

ہر کسے کو دُور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

ایک شاگرد نے سوال کیا کہ مولانائے روم تو وحدت الوجود کے قائل ہیں جہاں دوئی کا تصوّر ہی نہیں، پھر یہ وصل کی تمنا چہ معنی دارد؟ حضرت حاجی امداد اللہ نے جواب میں کچھ فرمایا مگر دریافت کرنے والے کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ سیّد مہر علی شاہ نے حاجی امداد اللہ سے عرض کیا کہ حضرت، طالب علم اپنے سوال کا مفہوم پوری طرح ادا نہیں کر پا رہا ہے اجازت ہو تو میں اس کے سوال کا منشا عرض کروں؟ حاجی صاحب نے فرمایا کیا مضائقہ ہے۔ چنانچہ سیّد مہر علی شاہ نے سوال کی یوں وضاحت فرمائی کہ وصل ایک امر اضافی ہے جو دوئی کا متقاضی ہے حالانکہ وحدت الوجود اس کے منافی ہے۔ یہ سن کر حاجی صاحب کی طبیعت بھر آئی اور فرمایا اچھا اب اس کا جواب بھی آپ ہی بیان فرمائیں۔ سیّد مہر علی نے عرض کیا وصل کے معنی ہستی موہومہ کو مٹانا ہے۔ غیریّت کی نفی نفس الامر میں ہے اور حقیقت میں محبوبِ حقیقی کے بغیر کوئی غیر موجود نہیں مگر وہم کے غلبے سے تغائر پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک فنائے کامل حاصل نہیں ہوتی۔ طلب اور عشق کے تمام منازل میں ایک وہمی غیریت باقی رہتی ہے اس لئے فراق بھی ہوتا ہے اور وصال کی طلب بھی ہوتی ہے۔

غرض شاہ صاحب نے اپنی جوابی تقریر کو خواجہ حافظ مولائے روم کے کلام اور حضرت شیخ اکبرؒ کے برجستہ ارشادات سے مزیّن و مرصّع کر کے کچھ ایسے پُرکیف انداز میں ادا فرمایا کہ حضرت حاجی امداد اللہ وجد میں آگئے اور آپ کو بے حد رقت ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد جب طبیعت سنبھلی تو کمرے کے اندر تشریف لے

۹۶۳۲۲

Marfat.com

گئے اور اپنا سلسلۂ چشتیہ صابریہ لا کر سید مہر علی شاہ کو عنایت فرمایا اور کہا اگرچہ آپ کو اس کی حاجت نہیں مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ کی وجہ سے شمالی ہند میں میرے سلسلے کی بھی ترویج ہو۔ شاہ صاحب نے عرض کیا آپ کی عنایت کا شکریہ۔ مجھے طوافِ کعبہ کی طرف قلبی توجہ نہیں ہوتی اگر ہو سکے تو اس قدر مہربانی فرمائیں کہ خدا کرے یہ ہو جائے۔ حاجی صاحب نے فرمایا میں بھی تقریباً تیس سال سے ایسی ہی کیفیت میں مبتلا ہوں۔

بہت عرصے بعد ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کا مطمعِ نظر ذات ہو وہ آثار و افعال اور صفات کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ شاہ صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب میں عرب سے واپس آیا تو ایک مدّت کے بعد دیوان سید محمد سجّادہ نشین پاک پتن شریف کے تقاضے پر انہیں سلسلۂ چشتیہ صابریہ کے وظائف تلقین کئے۔ اس وقت حاجی امداد اللہ مہاجر مکّی علیہ الرحمتہ کے اس عطیّے کی حکمت معلوم ہوئی۔ یہ بھی ارشاد ہوا عرب کے قیام کے دوران ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ مجھے اسی جگہ رہائش اختیار کر لینے کا خیال پیدا ہو گیا مگر حاجی صاحب نے ارشاد فرمایا کہ پنجاب میں عنقریب ایک فتنہ نمودار ہو گا جس کا سدِّباب صرف آپ کی ذات سے متعلق ہے۔ اگر اس وقت آپ محض اپنے گھر میں خاموش ہی بیٹھے رہے تو بھی علمائے عصر کے عقائد محفوظ رہیں گے اور وہ فتنہ زور نہ پکڑ سکے گا۔ حاجی امداد اللہ کا ارشاد درست تھا' اور اس فتنے سے مراد قادیانیت تھی جس کے ردّ اور تعاقب میں سید مہر علی شاہ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔

اس ذکر میں ایک مرتبہ فرمایا: "مکّہ معظمہ میں کتاب "فتوحاتِ مکیّہ" کے مطالعے کا شوق ہوا۔ ایک کتب فروش نے اس کی قیمت چالیس ریال بتائی جو میرے پاس نہ تھے۔ اس خیال میں بیٹھا تھا کہ ایک اجنبی افغان نے حرم شریف میں آن کر چالیس ریال پیش کئے۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگا اس وقت میرے دل میں خود بخود خیال پیدا ہوا ہے کہ یہ رقم آپ کو پیش کر دوں' چنانچہ اس کے اصرار پر وہ 40 ریال قبول کر لئے اور اشارۂ غیبی سمجھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کتاب خرید لی جو ہمیشہ زیرِ مطالعہ رہی"۔

بیت اللہ شریف اور دیارِ صاحبِ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری کے وقت ایک عام مسلمان کے ذوق و شوق کی جو کیفیت ہوتی ہے وہی بیان میں نہیں آسکتی تو اولیاء اللہ کی کیفیات کا کون اندازہ لگا سکتا ہے' چنانچہ حضرت مہر علی شاہ کے عشق و نیاز کی ایک معمولی جھلک آپ کی اس مشہور و مقبول نعت میں بھی پائی جاتی ہے جس کا مطلع ہے:

اَج سِک مِتراں دی ودھیری اے
کیوں دِلڑی اداس گھنیری اے
لُوں لُوں وِچ شوق چنگیری اے
اَج نیناں لائیاں کیوں جھڑیاں

Marfat.com

حضرت نے اس میں اس کیفیت کا نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو وادئ حمرا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ پُرانوار سے مشرف ہونے پر رونما ہوئی تھی۔ یہ تحریر فارسی زبان میں ہے جس کا اردو ترجمہ درج کیا جاتا ہے:

"مدینۂ عالیہ کے سفر میں بمقام وادئ حمرا ڈاکوؤں کے حملے کی پریشانی کی وجہ سے مجبوراً عشاء کی سنتیں مجھ سے رہ گئیں۔ مخلصی فی اللہ مولوی محمد غازی مدرسہ صولیتہ میں شغلِ تعلیم و تدریس چھوڑ کر حسنِ ظن کی بنا پر بغرضِ خدمت اس مقدس سفر میں میرے شریک ہوئے تھے۔ ان رفقاء کی معیت میں 'میں قافلے کے ایک طرف سو گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سیاہ عربی جبہ زیبِ تن فرمائے تشریف لا کر اپنے جمالِ باکمال سے مجھے نئی زندگی عطا فرماتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ میں ایک مسجد میں بحالتِ مراقبہ دوزانو بیٹھا ہوں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریب تشریف لا کر ارشاد فرمایا آلِ رسول کو سنّت ترک نہیں کرنا چاہئے۔ میں نے اس حالت میں آنجناب ؐ کی ہر دو پنڈلیوں کو جو ریشم سے بھی زیادہ لطیف تھیں اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر نالہ و فغاں کرتے ہوئے الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ کہنا شروع کیا اور عالمِ مدہوشی میں روتے ہوئے عرض کی کہ حضور کون ہیں؟ جواب میں وہی ارشاد ہوا کہ آلِ رسول کو سنّت نہیں ترک کرنا چاہئے۔ تین بار یہی سوال جواب ہوتے رہے۔ تیسری بار میرے دل میں ڈالا گیا کہ جب آپ ندائے "یا رسول اللہ" سے منع نہیں فرما رہے تو ظاہر ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر کوئی اور بزرگ ہوتے تو اس کلمے سے منع فرماتے۔ اس حُسن و جمال باکمال کے متعلق کیا کہوں؟ اس ذوق و مستی و فیضانِ کرم کے بیان سے زبان عاجز ہے اور تحریر لنگ...... البتہ بادہ خوارانِ عشق و محبت کے حلق میں ان ابیات سے ایک جرعہ اور اس نافۂ مشک سے ایک نفحہ ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔"

اَج سِک متراں دی ودھیری اے
کیوں دلڑی اداس گھنیری اے
لُوں لُوں وچ شوق چنگیری اے
اج نیناں لائیاں کیوں جھڑیاں
مُکھ چند بدر شعشانی اے
متھے چمکے لاٹ نورانی اے
کالی زلف تے اکھ مستانی اے
مخمور اکھیں ہن مدھ بھریاں
اس صورت نوں میں جان آکھاں
جانان کہ جانِ جہان آکھاں

Marfat.com

سچ آکھاں تے رب دی شان آکھاں
جس شان توں شاناں سب بنیاں
ایہہ صورت ہے بے صورت تھیں
بے صورت ظاہر صورت تھیں
بے رنگ دِسے اس مُورت تھیں
وچ وحدت پھٹیاں حد گھڑیاں
اِنہاں سکدیاں تے کُرلاندیاں تے
لکھ واری صدقے جاندیاں تے
اِنہاں بُردیاں مفت وکاندیاں تے
شالا آون وت بھی اوہ گھڑیاں
سبحان اللہ ما اجملک ما احسنک ما اکملک
کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا' گستاخ اکھیں کتھے جا اڑیاں

مولانا محمد غازی سے روایت ہے کہ مکّہ مکرّمہ میں سیّد مہر علی شاہ جب ان کے مکان پر تشریف فرما ہوئے تو دیکھا کہ آپ کے پاس صرف ایک قمیص ہے اور وہ اس طویل سفر میں مسلسل زیرِ استعمال رہنے کی وجہ سے عرق آلود ہو چکی ہے' چنانچہ ایک دن مولانا نے عرض کیا کہ غسل فرما کر میری نئی قمیص پہن لیجئے تاکہ میں آپ کی قمیص دھوڑالوں۔ آپ نے فرمایا اچھا' مگر غسل کے بعد دیکھا تو وہی پُرانی اور بغیر دُھلی قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر مولانا محمد غازی کو صدمہ ہوا اور زیرِ لب شکوہ بھی کیا۔ آپ نے فرمایا "مولوی صاحب اگرچہ میرے مذہب میں دوئی شرک ہے مگر میں نے خیال کیا تھا کہ یہ قمیص مولوی صاحب کی ہے۔ اچھا اب آپ کی قمیص پہنے لیتا ہوں"۔

سرزمینِ حجاز سے واپسی پر حضرت نے بہت کم کہیں سفر کیا۔ پہلے سیال شریف کے عرس پر اور پھر کچھ عرصے بعد پاک پتن شریف کے عرس پر سفر کرتے۔ کسی خاص دینی مقصد کے لئے بھی کوئی سفر اختیار فرما لیتے تھے۔ 1904ء میں آپ نے ریاست بھوپال کا سفر کیا وہاں مولوی خیر اللہ کے مکان میں نزد مسجد مدار المہام . قیام فرمایا اور خدّام کو منع کر دیا کہ کسی کو بتلایا نہ جائے کہ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں' لیکن چند دن ہی میں شہرت ہو گئی اور عقیدت مندوں نے ہجوم کیا حتیٰ کہ نواب صاحب بھوپال کے قریبی رشتے داروں نے حضرت کو اپنے ہاں لے جانا چاہا۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا اب یہاں لوگوں نے بے ذوقی پیدا کر دی ہے' رخصت ہونا چاہئے۔

یہ واضح ہو چکا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ مقبول اور منفرد تخلیق اور کل یوم ھو فی شان کے یہ مظہرِ صادق کس طرح علم و فقر کی تربیت میں کامل و مکمل ہو کر بیت اللہ شریف اور دربارِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں

Marfat.com

حاضر ہوئے' وہاں فیوض و برکات سے دامن مراد بھرے اور قبلۂ عالم اور قطبِ ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے۔ اس بلند مرتبت مسند شریف پر زمانۂ ماضی میں جہاں تک نگاہ دوڑایئے اکابر اولیاء اور اپنے اپنے عہد کے قبلہ گاہ عالم ہی جلوہ فرما دکھائی دیں گے۔ شمس العارفین حضرت خواجہ شمس الدین سیالوی' غوثِ زماں حضرت خواجہ محمد سلیمان تونسوی' قبلۂ عالم حضرت خواجہ نور محمد مہاروی' فخرِ جہاں حضرت مولانا فخر الدین دہلوی' قطبِ دوراں حضرت خواجہ نظام الدین اورنگ آبادی اور فانی فی اللہ باقی باللہ حضرت خواجہ کلیم اللہ جہاں آبادی بلکہ اور اوپر حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی' سلطان المشائخ حضرت خواجہ محبوب الٰہی' سلطان الزاہدین حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر' برہانِ چشتیہ و شہیدِ محبت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور خواجۂ خواجگان سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سپہرِ اسلام کے وہ درخشندہ ستارے تھے جن کی ضیاء پاشی سے کروڑوں گمرہانِ بادیۂ ضلالت نے ہدایت پائی۔ ان حضرات نے اپنی عمریں تدریسِ علومِ دینیہ اور تزکیۂ نفوسِ بشریہ میں بسر فرما دیں۔ جاہلوں کو عالم بنایا اور عالموں کو واصل باللہ کیا۔ اربابِ سیف نے ان سے عدالت کا سبق لیا اور اصحابِ قلم نے زورِ قلم حاصل کیا' غرض ان نفوسِ قدسیہ نے اس برِّ صغیر میں عرفانِ الٰہی اور عشقِ رسولؐ کے دریا بہا دیئے اور ایک عالم کو اللہ کے رنگ میں رنگ دیا۔

دہلی' بہاولپور' سنگھڑ اور کبھی بار کے بعد ارشاد و تبلیغ کا یہ سجادہ تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں کے آغاز میں کوہستان پوٹھوار کے دامن میں آراستہ ہوا۔ سیّد مہر علی شاہ کی ذاتِ گرامی میں وہ جملہ شرائط اور صفات جو ایک مجدّدِ وقت میں ہونا چاہئیں کماحقہٗ موجود تھیں۔ تعلیم الاسلام کے جو موضوعات آپ کے تجدیدانہ رنگ سے خاص طور پر متاثر ہوئے وہ مختصر الفاظ میں یوں ہیں:

حضرت سیّد مہر علی شاہ نے ایک لادینی حکومت کی الحاد پرور فضا میں ایک کاذب مدعیٔ نبوّت کے خلاف قلمی اور لسانی جہاد کیا حتیٰ کہ اس محاذ پر مسلمانوں کے تمام مکاتیبِ فکر کی جانب سے متفقہ طور پر آپ ہی کو قائد تسلیم کیا گیا اور آپ کی تصانیف ردِّ قادیانیت میں بہترین قرار دی گئیں۔ ان تصانیف کو مشعلِ راہ بنا کر تقریر و تحریر کے مجاہدین کا ایک جمِ غفیر کمربستہ ہو کر میدان میں اتر آیا اور ان کی مساعیٔ فی سبیل اللہ کی بدولت آج دنیائے اسلام کا ایک عام انسان بھی ختمِ رسالت کی قادیانی تاویل کو کفر سمجھتا ہے اور قادیانیت اس ملک میں ایک علیحدہ' بے اثر اور لاتعلق اقلیت بن کر رہ گئی ہے۔

حضرت شاہ صاحب کے زمانے میں مولوی عبداللہ چکڑالوی نے حدیث کی حجت سے انکار کرتے ہوئے ایک نیا فرقہ "اہلِ قرآن" کھڑا کر دیا۔ اس کے مقابلے میں سیّد مہر علی شاہ نے علمِ حدیث کی تدریس پر زور دے کر جابجا دورۂ حدیث کے درس جاری کرائے۔ اس کے علاوہ آپ نے نیچریت کی تردید میں بھی، جو برِّ صغیر میں انگریزی تعلیم و تربیت کے باعث فروغ پا رہی تھی، بعض مخلصین کے ذریعے ایک عرصے تک تعلیمی مضامین شائع کرائے تاہم سر سیّد احمد خان کے مخالف علماء کے ان نظریات کو بھی

Marfat.com

ناواجب قرار دیا کہ انگریزی پڑھنا حرام ہے اور برطانوی ہند دارالحرب ہے' یہاں جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ حضرت نے شہروں میں نماز جمعہ کو واجب کہا اور کئی مقامات پر' بالخصوص صوبہ سرحد میں از سرِ نو جمعہ کی نماز جاری کرائی۔ البتہ برطانیہ کی ایسی ملازمت کو جس میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اقدام لازم آتا ہو' ناجائز قرار دیا۔ اس امر کا اعلان آپ اس زمانے میں فرماتے رہے جبکہ پہلی جنگِ عظیم زوروں پر تھی اور انگریزوں کا ستارہ عروج پر تھا۔

دیوبندی' بریلوی اور دیگر اسلامی مکاتیبِ فکر کے اختلافی مسائل پر آپ اپنا مسلک تحریر و تقریر اور تالیفات کے ذریعے برابر واضح فرماتے رہے۔ اگرچہ فروعی مسائل میں اختلاف کی بنا پر ان کی باہمی کشمکش آپ کو ناپسند رہی تاہم فریقین کی حق بات کو برابر سراہا۔ حضرت نے اربابِ وحدت الشہود اور وحدت الوجود کے درمیان یہ کہہ کر ربط اور تعلق پیدا کیا کہ وحدت الشہود ابتدائے سلوک اور نفسِ ایمان ہے اور وحدت الوجود انتہائے مقام اور کمالِ ایمان ہے۔ اس مقام کے لئے نہ تو اُمم سابقہ ہی مکلف تھیں اور نہ ہی جمہورِ امتِ محمدیہ ہی ہیں۔ یہ اختص الخواص کا مشاہدہ اور حال ہے' قال نہیں۔

خلافت خلفائے اربعہؓ کی حقانیت بھی آپ نے دلائل قاہرہ سے ثابت فرمائی لیکن فضائلِ صحابہ کرامؓ اور اہلِ بیت عظام میں تشدّد اور تعصب ناگوار رہا خصوصاً ایک شخصیّت کی ایسی فضیلت جس سے دوسرے کی توہین لازم آئے' آپ کو سخت ناپسند رہی۔

بعض حضراتِ چشتیہ نماز فجر میں تاخیر کے قائل تھے۔ حضرت نے اورادِ چشتیہ کی تربیت کی بنا پر ثابت فرمایا کہ متقدمینِ سلسلہ اس نماز کو اوّل وقت میں ادا فرماتے تھے۔ سیاسی معاملات میں حضرت نے کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت اور کانگریسی جمعیت العلمائے ہند کی برپا کردہ تحریکاتِ خلافت و ہجرت سے اختلاف کرتے ہوئے ان کی تردید فرمائی' البتہ ترکوں کے محارباتِ طرابلس و بلقان میں گھر کے زیور اور لنگر کے گھوڑے تک چندے میں دے دیئے تھے۔ 1911ء میں دہلی میں منعقد ہونے والے برطانوی شاہی دربار میں شمولیت کی دعوت سے انکار پر انگریز حکومت نے آپ کو اپنا مخالف سمجھ کر ایذارسانی کی جانب میلان کیا مگر کچھ بگاڑ نہ سکی۔ بعدازاں حکومت نے سینکڑوں مربع اراضی بطور جاگیر دینا چاہی' مگر حضرت نے قبول نہ فرمائی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت پیر سید مہر علی شاہ کو قبولِ عام اور محبوبیّت کی خلعت عطا فرمائی۔ جن لوگوں نے آپ کی زیارت کا شرف حاصل کیا ہے' وہ بیان کرتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی آپ تشریف فرما ہوتے آپ کے وجود سے بڑھ کر دلکش اور جاذبِ نظر کوئی اور چیز وہاں معلوم نہ ہوتی تھی۔ سفر میں جب لوگ دست بوسی اور مصافحے کے لئے ہجوم کرتے تو مخلصین کو آپ کے گرد حلقہ بنانا پڑتا۔ قبل از وقت اطلاع ہونے کی صورت میں ریلوے سٹیشنوں اور سڑکوں پر لوگ کئی گھنٹے پہلے جمع ہو جاتے۔ 24 اگست 1900ء کو قادیانی مناظرے کے لئے جب لاہور تشریف لے گئے تو معلوم ہوتا تھا سارا شہر استقبال کے

Marfat.com

لئے نکل کھڑا ہوا ہے۔

حضرت کے ملفوظات میں ہے کہ آپ فرماتے تھے۔"جب مجھے تلقینِ سلوک پر مامور فرمایا گیا تو میں نے بارگاہِ ربّ العزت میں التجا کی تھی کہ الٰہی تو آپ جن بندوں کی میری طرف رہنمائی فرمائے ان کے آرام اور جمعیت کی کفالت بھی خود ہی فرما کیونکہ میرے پاس نہ تو فرصت ہے اور نہ مقدور"۔ چنانچہ حج سے واپس آ کر دعوتِ حق شروع کی تو اللہ تعالیٰ نے ہر بات کا انصرام اپنی قدرتِ کاملہ سے خود ہی فرما دیا۔ باکمال لوگ مختلف اطراف سے کھنچے چلے آئے اور عمر بھر کے لئے وابستۂ دامن ہو گئے۔ ابتدا میں ایک کوٹھڑی حضرت کی رہائش کے لئے، ایک لنگر کا سامان رکھنے کے لئے اور دو تین بڑے کمرے درویشوں اور مہمانوں کے لئے تیار ہوئے۔ اساتذہ نے تلامذہ سمیت پتھر، مٹی اور گارہ اٹھا اٹھا کر مسجد اور مکانات تعمیر کئے اور سخت پتھریلی زمین میں ایک خاصا گہرا کنواں کھودا۔ یوں پتھر، مٹی اور گارے کا فقیر خانہ 1895ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اگلے برس پختہ اور شاندار مسجد تیار ہوئی جس کی تعمیر میں حرم سرائے کے پردہ نشینوں تک نے رات کی تاریکیوں میں پانی بھر بھر کر حصہ لیا۔ ابتدائی ایام میں ملک کے بعض مشہور خطیب اور اہلِ علم و فضل حضرات رشتۂ اخلاص میں منسلک ہوئے، بعد ازاں اہلِ سلوک میں سے کئی مشائخ کرام کے صاحبزادے آپ کے سلسلۂ بیعت یا حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ ان میں حضرت دیوان غیاث الدین اجمیری، حضرت دیوان سید محمد پاک پتن شریف اور خواجہ حسن نظامی دہلوی کے اسمائے گرامی خاص طور پر مشہور ہیں۔

اس ابتدائی زمانے میں حضرت کی نشست پتھر کی ایک مصلّٰی نما سل پر ہوا کرتی تھی جو پرانی عمارت کے سامنے درختوں کے سائے میں رکھی رہتی تھی۔ فجر کی نماز اور وظائف سے فارغ ہو کر آپ مسجد سے نکلتے اور اسی سل پر آن کر تشریف رکھتے۔ ارد گرد چٹائیوں کا فرش بچھ جایا کرتا۔ علماء، درویش اور مہمان حسبِ حاجت استفادہ کرتے۔ یہیں مجلسِ ذکر منعقد ہوتی، یہیں آپ مناظرے کرنے والوں کو مسائل زیرِ بحث پر تقریریں لکھواتے، یہیں 1897ء میں آپ کی پہلی عظیم الشان کتاب "تحقیق الحق" قلمبند کی گئی اور قادیانی مذہب پر 1900ء میں "شمس الہدایت" اور 1902ء میں "سیف چشتیائی" منصۂ شہود پر آئیں۔ اسی جگہ مشائخ طریقت اور اساتذۂ مدارس نے حضرت سے مثنوی مولانائے روم اور حضرت شیخ اکبر کی کتابوں "فتوحاتِ مکیہ" اور "فصوص الحکم" کا درس لیا۔

آپ کی راتیں اسی پتھر کی سل پر مراقبے میں گزر جاتیں۔ حضرت جس پہلو پر بیٹھ جاتے صبح صادق تک اسی پہلو بیٹھے رہتے۔ ذرّہ برابر حرکت نہ کرتے۔ موسمِ سرما کی طویل برفانی راتیں صرف ایک کمبل میں کاٹ دیتے، صبح کے وقت کمبل پر برف جمی ہوتی جسے اٹھ کر جھاڑ دیتے۔ عشقِ الٰہی کی حرارت و حدّت اس قدر تھی کہ رات کو وادی کے منجمد تالاب میں غسل فرماتے اور برف ہٹا ہٹا کر غوطہ لگاتے تھے۔

قطرۂ دردِ دلِ من، گر بہ دریا افگنند
سینہ سوزاں، تن تپاں، ماہی ز آب آید بروں

Marfat.com

ان ایام میں عموماً عشاء کے وضوسے صبح کی نماز ادا کرتے۔ کثرتِ مراقبہ اور مسلسل دوزانونشست کے باعث ایک موقع پر رانیں بے سکت ہو گئی تھیں اور چلنا پھرنا دشوار ہو گیا تھا۔ طبیب نے مالش اور عصر کی نماز کے بعد گھوڑے کی سواری تجویز کی جس سے بالآخر افاقہ ہوا۔

خاندانِ چشتیہ کی روایت میں ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے برِ صغیر ہند میں تبلیغ اسلام کی خاطر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے باطنی طور پر سماع بالمزامیر کی اجازت حاصل کی تھی کیونکہ اہلِ ہند بہ لحاظ طبع و تہذیب غنا کی طرف راغب تھے' چنانچہ ان کے سامنے اسلام کی پیشکش انہی کے انداز میں کرنے سے بہت سُرعت سے کامیابی ہوئی۔ پیر سید مہر علی شاہ کا تعلق چونکہ سلسلۂ چشتیہ سے تھا اس لئے آپ غنا اور سماع کو جائز اور مباح سمجھتے تھے' لیکن چند پابندیوں کے ساتھ...... آپ کو بچپن ہی سے قوالی پسند تھی۔ ابتدائی تعلیم کے دوران جنگل میں جا کر خود بھی پُرسوز اشعار پڑھا کرتے تھے۔ اجمیر شریف کے ایک قوال نے ایک موقع پر عربی میں یہ مشہور نعت سنائی۔

اَلصُّبْحُ بَدَا مِنْ طَلْعَتِہٖ
وَاللَّیْلُ دَجیٰ مِنْ وَفْرَتِہٖ

یہ نعت سن کر آپ وجد میں آ گئے۔ قوال کو قیمتی چغے' کمبل اور قالین بخش دیئے اور جب آپ کے پاس ان سے بہتر کوئی چیز دینے کو باقی نہ رہی تو اصطبل کے گھوڑے بھی دے دیئے۔ کہتے ہیں اس روز آپ پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوئی کہ ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو کر بالکل مُسکر کی سی حالت ہو گئی تھی۔

آپ گاہے گاہے تخلیئے میں شغلِ سماع کیا کرتے ورنہ عام طور پر وظائف و اشغال کی کثرت اور زائرین کے ارشاد و افادے کی مصروفیت کے باعث سماع کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ ان اشغال میں روزانہ پندرہ سے اٹھارہ ہزار تک اسمِ ذات کا ورد اور اکثر اوقات کتابوں کی درس و تدریس بھی شامل ہوتے تھے۔ ذوقِ عالی کا انداز فقط رسمی سماع' حسنِ صوت اور رنگِ سخن ہی کا پابند نہ تھا بلکہ اکثر روزمرّہ کی باتوں میں سے محض کوئی نکتہ یا لفظ ہی عشقِ سرمدی کا ساز چھیڑنے کے لئے مضراب کا کام کر جاتا اور آپ کی طبیعت پر عجب کیفیت طاری ہو جاتی۔

ایک روز عصر کے بعد مسجد سے مہمان رخصت ہو رہے تھے کہ کسی نے موت کا ذکر کیا۔ آپ پر کیفیّت طاری ہو گئی۔ ایک لمبا ٹھنڈا سانس لیا اور حسرت بھرے لہجے میں فرمایا: "ابھی یہ نعمت کہاں"۔

ایک دفعہ رحمانی باغ علاقہ سرگودھا میں بارش کے لئے دعا کی استدعا پر قوالوں کو ایک خاص انداز میں غزل سنانے کا ارشاد ہوا۔ مطلع یہ تھا۔

تُرکِ من اے مَہ' غلامِ روئے تو
جملہ ترکانِ جہاں ہندوئے تو

آخری شعر تک پہنچتے پہنچتے بادل آنے شروع ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بارش ہونے لگی۔

Marfat.com

اس غزل کے دوران آپ نے یہ شعر بھی پڑھنے کو فرمایا۔

لئے پھرتی ہے بلبل چونچ میں گُل
شہید ناز کی تُربت کہاں ہے

آخری ایام میں وجد کی علامت یہ رہ گئی تھی کہ داہنے ہاتھ کو حرکت میں لا کر ایک دو بار جھٹک دیا کرتے اور اس روز اکثر ایسا ہوتا تھا کہ جو شخص مصافحہ کرتا یا بیعت سے مشرف ہوتا اس پر رقت طاری ہو جاتی۔ پاک پتن شریف میں آپ کی جائے قیام "موتی محل" میں صبح کے وقت محفلِ سماع ہوئی۔ حافظ شیرازیؒ کے اس شعر پر وجد کے آثار نمایاں ہوئے۔

شبِ تاریک و بیم موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

قوالوں نے اس شعر کی تکرار کے ساتھ ساتھ اس کا یہ پنجابی ترجمہ بھی دہرایا۔

رات اندھیری گھمن گھیری دریا ٹھاٹھاں مارے
اوہ کی جانن سار اساڈا جیہڑے رہن کنارے

حضرت وجد کی حالت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور مجلس میں ایک کُہرام برپا ہو گیا۔ حضرت دیوان سید محمد سجادہ نشین پاک پتن اپنے حجرے سے نکل آئے اور دریافتِ حال کے لئے ایک خادم کو بھیجا لیکن وہ بھی وجد کرنے لگا۔

امیر حبیب اللہ خان والیٔ کابل ایامِ شہزادگی میں خفیہ طور پر حضرت کی خدمت میں دعا کے لئے حاضر ہوتے تھے۔ حضرت نے ان کے لئے دعا فرمائی اور دو روز مہمان بھی رکھا مگر کسی کو امیر حبیب اللہ کے آنے یا جانے کی خبر نہ ہوئی البتہ حضرت کے ایک خادم کو معلوم تھا اور وہ بھی اس وقت جب امیر حبیب اللہ تخت نشینی کے بعد 1907ء میں ہندوستان کے سرکاری دورے پر آئے اور دہلی کے چاندنی چوک میں ان کا جلوس دیکھ کر حضرت کے اس خادم نے پہچانا کہ اس بادشاہ کو تو وہ دو دن اپنے ہاتھ سے چائے تیار کر کے پلاتے رہے ہیں۔

نواب صادق محمد خان سادس امیر بہاولپور کو بھی حضرت پیر سید مہر علی شاہ سے بڑی عقیدت تھی مگر ان کی بیعت کی تمنا پوری نہ ہوئی۔ ایک مرتبہ نواب صاحب نے گولڑہ شریف آنے کا ارادہ بھی کیا مگر نہ آ سکے۔ حضرت فرماتے تھے والیانِ ریاست کی آمد ورفت اور پیری مریدی کا تعلق مجھے پسند نہیں کیونکہ حاجت مند لوگ سفارش کی توقع رکھتے ہیں اور مجھے سفارش کرنا اچھا لگتا ہے نہ اس سے انکار۔

ریاست حیدر آباد دکن کے نواب ولی الدولہ ' حضرت سے بیعت تھے ' بیمار ہوئے تو ڈاکٹروں نے بحری ہواخوری کے لئے لندن جانے کا مشورہ دیا۔ نواب صاحب نے حضرت کی خدمت میں اجازت کے لئے عریضہ لکھا ' آپ نے جواب دیا اگر بحری ہوا ہی کھانی ہے تو بجائے لندن کے حج بیت اللہ اور مدینہ

Marfat.com

شریف کی زیارت کو جایئے۔ چنانچہ نواب صاحب نے اس حکم پر عمل کیا فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ پہنچ کر وفات پا گئے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ان کا جنازہ روضۂ عالیہ کے سامنے رکھا رہا۔ دیکھنے والے رشک کرتے تھے کہ یہ کون خوش نصیب انسان ہیں۔ حضرت پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری بھی وہاں موجود تھے 'انہوں نے فرمایا: "لوگو دیکھو' باخدا انسان سے تعلق و نسبت کے کیسے عمدہ نتائج پیدا ہوتے ہیں"۔

حضرت کے فیضانِ نظر سے بے شمار خوش نصیب دینی و دنیاوی اعزاز و مناصب پر پہنچے۔ ان میں نواب صاحب انب دربند' علاقہ گھیبی کے نامور رئیس سردار علی محمد' نواب سر عمر حیات اور سر خضر حیات ٹوانہ ' سرگودھا کے نواب میاں محمد حیات قریشی' سر سکندر حیات خان' میاں مشتاق احمد گورمانی' نواب عبداللہ خان آف خان گڑھ' حاجی میاں کریم بخش' میاں عبدالرحیم و میاں عبدالرشید سیٹھی پشاور' میاں امام بخش سوداگر ملتان وغیرہ شامل ہیں۔

حضرت کے معمولات اور مشاغل ایسے لگے بندھے تھے کہ ان میں بہت کم تغیّر ہوتا تھا۔ نمازِ فجر کی سنتیں پڑھ کر حجرے سے مسجد میں آتے اور امام کا انتظار کرتے۔ اگر امام صاحب کسی عذر کی وجہ سے نہ آ سکتے تو کسی دوسرے قابلِ امامت مخلص کو امام بنالیتے۔ دس بجے تک اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ اس دوران کسی سے کلام نہیں کرتے تھے۔ ساڑھے دس گیارہ بجے باہر دیوان خانے میں تشریف لاتے۔ اس وقت ہر شخص کو کہنے سننے کی اجازت ہوتی تھی۔ ارشاد و تلقین کا سلسلہ بھی جاری رہتا اور مختلف کتابیں بھی تلامذہ کو پڑھاتے۔ بارہ ساڑھے بارہ بجے حجرے میں چلے جاتے' کھانا کھا کر قیلولہ کرتے اور ایک گھنٹے بعد پھر واپس آ کر ظہر کی نماز کے لئے مسجد میں چلے جاتے۔ ظہر کے وضو ہی سے اکثر عصر پڑھتے۔ پھر گھوڑے پر سوار ہو کر تین چار میل دور سیر کرتے۔ مغرب اور عشاء کی نمازیں باہر ہی ادا ہوتیں۔ رات گئے واپس آ کر کھانا تناول کر کے سو جاتے' تہائی رات باقی ہوتی کہ بیدار ہو کر تہجد کی تیاری میں لگ جاتے۔

جس شخص کو اہل پاتے کچھ نہ کچھ عطا ضرور کرتے۔ باتیں کم کرتے اور گفتگو فصاحت و بلاغت سے لبریز ہوتی۔ بڑے بڑے سوالوں کا جواب ایک دو لفظوں میں دے کر مطمئن کر دیتے۔ اپنے متعلقین سے نہایت وفاداری کا معاملہ تھا۔ ان کے حالات دریافت فرماتے رہتے' دکھ درد میں ہر طرح شریک رہتے' بیماروں کی مزاج پرسی کرتے' عیادت کو جاتے' مخلصین سے زیادہ معاندین کے ساتھ حسن سلوک کی عادت تھی۔ سخاوت بہت پوشیدہ طور پر کرتے۔ دنیا کی طرف سے بے توجہی آپ کی ذات کا خاصہ تھا۔ زائرین کی طرف سے نذرانوں اور ہدیوں کا سلسلہ بارش کی طرح جاری رہتا لیکن آپ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ لانگری اٹھا کر لے جاتا اور لنگر پر خرچ کرتا رہتا۔ کبھی اس سے حساب تک نہ پوچھا کہ فلاں چیز کہاں سے آئی اور کہاں صَرف ہوئی۔

خوراک بے حد قلیل تھی' اس کے باوجود طاقتِ برداشت زبردست محسوس ہوتی' جسم فولاد کا معلوم

Marfat.com

ہوتا تھا۔ اپنے اساتذہ اور ان کی اولاد کا نہایت احترام کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی خبر گیری رکھتے اور ضرورت کے وقت کچھ نہ کچھ نذر کرتے رہتے تھے۔ آپ کا رنگ گندمی' پیشانی بلند اور چمک دار' آنکھیں مخمور اور رعب آفریں' ناک ستواں' ابرو گھنے اور کماندار' لب متوسط' دہن فراخ' دندان روشن اور جدا جدا' ریش گھنی اور تا بہ سینہ' گیسو گھنگھریالے کانوں تک دراز' سینہ کشادہ بطن خمیدہ' رخساروں پر زیادہ گوشت نہ تھا' انگلیاں ملائم اور باریک' قد میانہ' قدم نرم اور نازک' جسم گٹھا ہوا متوسط۔

آپ کو سفید لباس پسند تھا۔ لٹھے کی شلوار' موسم کے لحاظ سے ململ کا آستینوں والا کرتا اور سفید ململ کی ہلکی مایہ لگی ہوئی پگڑی باندھتے تھے۔ دستار پر نوکدار کلاہ ہوتی۔ کرتے کے اوپر واسکٹ اور لمبا کھلے کالر کا فراک کوٹ یا چغہ ہوتا۔ پاؤں میں گھیبی نمونے کی نفیس اور نصف طلا دار پاپوش استعمال کرتے۔ ہاتھ میں ہمیشہ تسبیح رہتی۔ گھوڑے کی سواری مرغوب تھی' شریر سے شریر گھوڑا بھی حضرت کے قریب آتے ہی رام ہو جاتا۔

آواز شیریں' پُرسوز اور باوقار تھی۔ یوں متانت سے گفتگو فرماتے کہ ایک ایک لفظ گنا جاسکے اور یاد رہ جائے۔ رفتار اور چال ڈھال میں اہلِ علم کو وقار اور سلامت روی نظر آتی اور اہلِ دل کو بانکپن اور محبوبیت۔ آپ کی نگاہِ لطف اور شفقت بھری مسکراہٹ میں ایک عجب کیف اور انداز تھا جسے محسوس تو کیا جاسکتا تھا' بیان کرنا ممکن نہ تھا۔ آپ کی پہلی نظر میں شکار ہونے والے آج بھی سینکڑوں باقی ہیں۔ حجرے کا نام ہی "عشق آباد" پڑ گیا تھا۔

اکہتر بہتر سال کی عمر تک حضرت کی صحت اچھی خاصی رہی مگر 1928ء سے ضعف کے آثار بڑھنے لگے۔ قلّتِ طعام' قلّتِ منام اور قلّتِ کلام ابتدا ہی سے آپ کے معمولات رہے۔ دائمی ذکر اور پاسِ انفاس کے شغل نے آپ کو خواب و خور سے بے نیاز کر دیا تھا۔ غالباً اسی وجہ سے آخر عمر میں معدے نے کام کرنا چھوڑ دیا اور ہچکی شروع ہو گئی تھی۔ یہ بے چین کر دینے والا مرض کبھی کبھی دَورہ کرتا اور ہفتوں پیچھا نہ چھوڑتا۔ قریباً دو تین سال پیشتر ہی سے یہ حالت تھی کہ خلوت ہو یا جلوت ایک وجدانی کیفیت طاری رہتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک آہ بھر کر سر اٹھاتے اور باطنی کیفیات کے باعث چہرے کا رنگ کبھی زرد' کبھی سبز اور کبھی سرخی مائل ہو جاتا۔ اپنے نظامِ اوقات کے تحت مجلس خانے میں بدستور گھنٹے دو گھنٹے کے لئے تشریف لاتے مگر محفل پر خاموشی طاری رہتی۔ حاضرین میں سے بعض پر گریہ طاری ہو جاتا اور بعض حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے رہتے۔

1936ء تک اس کیفیت کا ورود انتہا کو پہنچ گیا۔ پہلے نماز کے لئے مسجد جانے سے معذور ہوئے پھر بستر پر نماز پڑھنے لگے۔ اس کے بعد اشاروں سے نماز ادا ہونے لگی' آخر کار اشاروں سے بھی معذوری ہو گئی اور لگاتار استغراق کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ اس زمانے میں اربابِ سلوک اور صاحبِ منزل حضرات دُور دُور سے کھنچے چلے آتے۔ ان میں مجذوبوں اور اہلِ سُکر کی کثرت ہوتی تھی۔ حضرت کے حجرے

Marfat.com

"عشق آباد" میں داخل ہو کر پلنگ کی پائینتی کو بوسہ دیتے کچھ دیر چپ چاپ آپ کو دیکھتے رہتے اور پھر خود ہی دعا مانگ کر رخصت ہو جاتے۔ نہ سوال ہوتا نہ جواب۔

دس برس کی مدت تک یہ مختلف تکالیف رہیں اور آخر کے چار پانچ سال تو حضرت مسلسل صاحبِ فراش رہے۔ ہچکی کے شدید دورے اور تکلیف کی شدّت کے باوجود آستانے پر حاضر ہونے والے تمام زائرین کو حسبِ معمول تسلی بخش جوابات اور اطمینان دہ دعاؤں سے فیض یاب فرماتے رہے اور کسی کو توجہ سے کبھی محروم نہ رکھا۔ خلقِ خدا کی دلجوئی ہر حال میں حضرت کے مدِّنظر رہی۔ مارچ' اپریل 37ء میں حضرت نے متعدد مرتبہ سورۂ یاسین' سورۂ یوسف' سورۂ تغابن' سورۂ ملک' سورۂ مزمل' درودِ مستغاث' سلسلۂ مشائخ کرام' درودِ کبریّت احمر اور دعائے کبیر استماع فرما کر حاضرین' غیر حاضرین' متوسلین' غیر متوسلین اور تمام اُمت مرحومہ کے لئے بارگاہِ رب العزت میں دعا فرمائی۔ سنِ وصال کے ماہ محترم میں زائرین کی تعداد بتدریج بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ چھ سات سو یومیہ تک پہنچ گئی۔ ماہِ صفر میں حضرت کو زکام اور میعادی بخار کا عارضہ لاحق ہوا۔ آخری تین روز یہ کیفیت رہی کہ بار بار دستِ حق پرست دعا کے لئے اٹھاتے' پھر اپنے چہرے کے سامنے تک لے جاتے' کبھی صفحۂ پیشانی تک انگلیاں پہنچاتے۔ اس کے علاوہ مکمل سکوت۔

یوم سہ شنبہ 29 صفر 1356ھ مطابق 11 مئی 1937ء کی صبح نبض کی یہ حالت تھی کہ داہنے ہاتھ کی نبض رک رک کر چلتی تھی اور بائیں طرف یعنی قلب کی جانب نبض حسبِ معمول جاری تھی۔ گیارہ بجے حضرت کو مسند لگا کر تھوڑی دیر کے لئے بٹھایا گیا۔ عصر کے وقت ساڑھے پانچ بجے دونوں ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا جس کی تعمیل میں آپ کو سہارا دے کر اٹھایا گیا اور آپ تکیے پر سہارا لئے بغیر سیدھے بیٹھ گئے۔ اس وقت آپ نے گردن کو ذرا سا ایک طرف جھکا کر تبسم فرمایا۔ اس دلنواز اور ایمان افروز تبسم میں مسرت' حیا اور نیاز کا ایسا حسین امتزاج تھا کہ بے ساختہ زبان پر سبحان اللہ کا ورد جاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد آپ کے اشارے پر دوبارہ بستر پر لٹا دیا گیا چند لمحے بعد آپ نے اسمِ ذات "اللہ" ایک ہی دفعہ آہستہ مگر طویل اور عمیق آواز میں زبانِ شوق اور قلبِ عرفان سے ادا فرمایا۔ یہ کیفیت عالمِ نمود کی الوداعی جھلک تھی' صحیفۂ رُخِ انور پر زعفرانی رنگ مشاہدہ ہوا' چہرہ کیفِ وصال سے مجسمۂ نیاز نظر آیا پھر دوبارہ متوسلین کو الوداعی تلقین میں اسی طرح اسمِ ذات کا اعادہ فرما کر رُوبقبلہ ہو گئے۔

صورت از بے صورتی آمد بروں
باز شد انا الیہ راجعون

اگلے روز بروز بدھ یکم ربیع الاول بمطابق 12 مئی 1937ء نمازِ عصر کے بعد ساڑھے چھ بجے شام آپ کی نماز جنازہ ادا کی گئی۔ ایک اندازے کے مطابق ڈیڑھ پونے دو لاکھ افراد شریک ہوئے۔ ان میں غیر مذاہب کے لوگ ہندو' سکھ' عیسائی وغیرہ بھی سینکڑوں کی تعداد میں شامل ہو کر سب سے پیچھے کی

Marfat.com

صفوں میں ہاتھ باندھ کر کھڑے رہے۔ آٹھ بجے رات قبلۂ روحانیت حضرت پیر سید مہر علی شاہ کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔ آپ کا جسمِ اطہر مسجد کے جنوبی باغ میں اسی جگہ دفن کیا گیا جس جگہ کے لئے حضرت نے بیماری کے دوران متعدد بار اظہارِ اشتیاق کیا تھا یعنی عالمِ استغراق میں مولانا محبوب عالم سے فرمایا کرتے تھے کہ "مجھے باغ میں لے چلو"۔ پھر فرماتے: "کب لے چلو گے؟" اس وقت خدّام اور حاضرین کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کیا پیغام ہے۔

قرن ہا باید کہ صاحب دلے پیدا شود
بایزیدؒ اندر خراساں یا اویسؒ اندر قرن

قرن ہا باید کہ تا صاحب دلے پیدا شود بایزیدؒ اندر خراساں یا اویسؒ اندر قرن نہ قرن میں دوسرا اویس قرنی پیدا ہوا نہ بسطام نے آج تک دوسرا بایزید پیدا کیا۔ گولڑے کو بھی دوسرے مہر علی شاہ کی ہمیشہ آرزو باقی رہے گی، لیکن سلسلۂ موت و حیات لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا کسی کو بقا نہیں۔ یہ دنیا و مافیہا سب فانی ہیں۔

ہر آں کہ زاد بنا چار بایدش نوشید
ز جامِ دہر مئے کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ

Marfat.com

نذیر حسینؒ

آج سے ٹھیک ایک سو ستر برس پہلے ہندوستان کے سرسبز، شاداب اور مردم خیز صوبے بہار کے دور افتادہ ضلع مونگیر کے گاؤں سورج گڑھ میں، سادات بنی فاطمہ کے ایک معزز اور موقر گھرانے میں سید جواد علی کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا۔ والد نے اس بچے کا نام نذیر حسین رکھا۔ سید جواد علی کا خاندان دولتِ علم و فضل اور وجاہت میں ممتاز تھا۔ مغل دور کی مستند تاریخوں میں اس خاندان کے اکثر افراد کا تذکرہ ملتا ہے۔ ادھر اس خاندان کی توقیر و عزت کا یہ حال اور ادھر نذیر حسین کی یہ کیفیت کہ جب سے ہوش سنبھالا حد درجہ کھیل کود کا شوق اور لکھنے پڑھنے سے مطلق رغبت نہیں۔ والدین کی سخت کوشش کے باوجود مکتب کا رخ نہیں کیا۔ آخر پریشان ہو کر بیٹے کو ڈانٹنا ڈپٹنا ترک کر دیا اور یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ اس کی قسمت ہی میں تعلیم نہیں ہے، مگر قدرت کے کھیل زالے ہیں۔

ایک روز قصبے کا ایک پنڈت کہیں جا رہا تھا کہ اس نے نذیر حسین کو ندی میں تیرتے دیکھا۔ پنڈت قریب جا کھڑا ہوا اور نذیر حسین کی تیراکی کے کمالات دیکھ کر تعریف کی۔ نذیر حسین اس تعریف سے خوش ہوا۔ لیکن اگلے ہی لمحے پنڈت کی آواز اس کے کانوں میں آئی وہ کہہ رہا تھا "بیٹا" تم اتنے بڑے ہو گئے اور کچھ پڑھا لکھا ہی نہیں۔ دیکھو، تمہارے خاندان میں سب لوگ عالم ہیں، صرف تم ہی جاہل نکلے ہو۔ بھلا یہ تیراکی تمہارے کس کام آئیگی۔؟

پنڈت، تو یہ کہہ کر چل دیا، لیکن مارے ندامت کے نذیر حسین کا برا حال تھا۔ برہمن کا جملہ دل و

دماغ میں نشتر بن کر اتر گیا تھا آخر مصمم ارادہ کر کے اٹھا اور گھر جاتے ہی والد کے قدموں میں سر رکھ کر کہا کہ اباجان، آج سے ہم بھی پڑھا کریں گے۔ یہ سنتے ہی والد نے گلے سے لگالیا۔

سید جواد علی نے بیٹے کو فارسی کی ابتدائی کتابیں خود پڑھائیں اور جب یہ درسی کتابیں نکل گئیں، تو عربی شروع کردی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اپنی خداداد ذہانت و ذکاوت سے نذیر حسین نے ساتھی طلبہ کو بہت پیچھے چھوڑ دیا علم کا شوق ایسا بڑھا کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں رہتی تھی نئے نئے نکات اور اعتراضات ذہن میں آتے جنہیں حل کرنا نذیر حسین کے اساتذہ کے لئے دشوار ہو جاتا، جولانیٔ طبع زوروں پر تھی اور آتشِ شوق تیز تر۔ عمر کا سولہواں سال تھا کہ وطن سے باہر جاکر علم کی پیاس بجھانے کی خواہش نے مضطرب و بے چین کر دیا۔ ان دنوں خاندان ولی اللّٰہی کا شہرہ آسمان پر تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے درس کی عظمت معلوم تھی۔ دل میں طے کر لیا۔ کہ وہیں چل کر زانوئے تلمذّ تہہ کیا جائے۔ اپنے ایک دوست امداد علی سے دل کی بات کی۔ وہ خود بھی اس فکر میں پریشان تھا۔ دونوں دوست رات کے وقت گھر والوں کو سوتا چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔

اس زمانے میں صوبہ بہار کا "مدینتہ العلم" عظیم آباد پٹنہ کو سمجھا جاتا تھا اور گردونواح کے طلبہ کی بھاگ دوڑ وہیں تک محدود تھی۔ یہ دونوں دوست 1237ھ مطابق 1821ء میں بھاگ کر پٹنہ صادق پور پہنچے اور محلہ تنمو مہالیا میں شاہ محمد حسین صاحب مرحوم کے مکان پر گئے یہاں درس بھی دیا جاتا تھا اور طلبہ کے لئے کھانے کا بندوبست بھی تھا۔ یہاں نذیر حسین نے چھ ماہ تک قیام کر کے ترجمۂ قرآن اور مشکوٰۃ شریف پڑھی انہی دنوں حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید عید الفطر کی نماز کے بعد سفرِ حج کے ارادے سے بریلی سے چلے۔ ولمؤ، الہ آباد، مرزاپور بنارس اور دوسرے مقامات سے ہوتے ہوئے عظیم آباد پٹنہ پہنچے اور پندرہ روز ٹھہرے۔ سید صاحب کا قافلہ گول گھر کے سامنے ٹھہرا تھا اور لین کے میدان میں جمعے کی نماز ہوئی تھی مولانا اسماعیل شہید نے وعظ فرمایا تھا۔ نذیر حسین کا بیان ہے کہ "ہم اس وعظ اور نماز میں شریک تھے سارا میدان آدمیوں سے بھرا ہوا تھا پہلی ملاقات سید صاحب اور مولانا اسماعیل سے یہیں پٹنہ میں ہوئی"۔

دو ہفتے بعد سید صاحب اپنے قافلے سمیت کشتی کے ذریعے کلکتے چلے گئے اور نذیر حسین اپنے ہم سفر رفیق مولوی امداد علی کے ساتھ دہلی کی جانب روانہ ہوئے۔ غازی پور پہنچ کر چند دن رکے اور چند کتابیں مولوی احمد علی چڑیا کوٹی سے پڑھیں۔ مولانا اپنے زمانے کے مشاہیر علماء میں سے تھے اس کے بعد نذیر حسین بنارس پہنچے۔ کچھ عرصہ وہاں بھی قیام کیا۔ بنارس میں ایک کتاب نو روپے میں بیچ کر چھوٹا سا ٹٹو خریدا اور وہاں سے الہ آباد روانہ ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راہ میں نذیر حسین اور امداد علی جُدا ہو گئے۔ بہر حال یہ معلوم ہے کہ امداد علی، نذیر حسین سے پہلے دہلی پہنچ گئے۔ الہ آباد پہنچ کر نذیر حسین نے اس مسجد میں قیام کیا جو جمنا کے کنارے بنی ہوئی تھی کچھ عرصہ بعد شاہ اجمل کے دائرے میں فروکش ہوئے۔

Marfat.com

صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں علمائے الہ آباد سے پڑھیں اور سات آٹھ ماہ ٹھہرے۔ اس کے بعد خیال آیا کہ ہنوز دلی دور است۔ اگر حضرت شاہ عبدالعزیز سے ملاقات نہ ہوئی' تو سارا سفر بیکار ہوگا۔ لہٰذا الہ آباد سے چلے اور مختلف مقامات پر رکتے سفر کرتے کان پور میں وارد ہوئے اور موضع خواجہ پھول تھانہ میں قیام کیا۔ وہاں ایک بزرگ خواجہ پھول کا مزار ہے۔ اس کے پاس والی مسجد میں ٹھہرے اور جنوب کی دیوار پر اپنے دستخطوں سے یہ عبارت لکھ دی۔ "بندہ فقیر امروز وارد مسجد ہذا شد۔ عبدہٗ سیّد محمد نذیر حسین سورج گڑھی المرقوم فی التاریخ پنجم ماہ رجب المرجب 1238 ہجری"۔

بہت مدت بعد نذیر حسین کے دوست سیّد عبدالعزیز جب وہاں تحصیل دار ہو کر گئے' تو انہوں نے اس یادداشت کی خبر نذیر حسین کو کی۔ آپ نے جواب میں لکھا "میں ایّام طالب علمی میں اس علاقے سے گزرا تھا۔ بے شک خواجہ پھول کے قلعے کی مسجد میں کوئی یادداشت ورودِ فقیر کی بقلم فقیر تحریر ہے۔ میں ایک ٹٹو پر تھا۔ ایک طالب علم بھی میرے ساتھ تھے۔ شوقِ کتب بینی اس وقت زیادہ تھا۔ اور تمہاری طرح غصہ وری اور جلدبازی بھی مجھے زیادہ تھی۔ اب کیا ہے؟ فقیر ٹھنڈا ہو گیا۔"

آخر 13 رجب 1243 ہجری مطابق 30 جنوری 1828ء بروز بدھ شہر دہلی میں داخل ہوئے۔ وطن سے نکلنے کے بعد چھ برس میں جگہ جگہ کی خاک محض علم کی خاطر چھانی اور اب کعبۂ مقصود سامنے تھا۔ لیکن افسوس کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کو وفات پائے چار برس ہو چکے تھے اور ان کی جگہ حضرت شاہ محمدؐ اسحاق مسندِ درس پر رونق افروز تھے۔ وہیں دہلی میں پرانے دوست مولوی امداد علی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ان دنوں مولوی محمدؐ شجاع الدین نقی اوّل کے مکان پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہوں نے نقی صاحب کی اجازت سے نذیر حسین کو بھی اپنے ہی پاس ٹھہرا لیا۔ پھر دس پندرہ روز بعد نقی صاحب کے مکان سے اٹھ کر پنجابی کٹرہ کی مسجد اورنگ آبادی میں مولانا عبدالخالق دہلوی کی خدمت میں چلے گئے سر سیّد احمد خان مرحوم۔ آثار الصنادید میں اس مسجد کا تذکرہ لکھتے ہیں: "مولوی عبدالخالق صاحب اور مولوی محمد نذیر حسین صاحب اسی مسجد میں درس تدریس فرماتے ہیں اور دن رات قال اللہ و قال الرسول کا ذکر رہتا ہے۔"

افسوس کہ یہ عالی شان مسجد جنگ آزادی 1857ء کے بعد انگریزوں نے شہید کر دی۔ اب اس جگہ دہلی کا ریلوے اسٹیشن بن گیا ہے.......... دہلی میں اس وقت جتنے ممتاز عالم تھے' ان میں سے بعض تو براہ راست حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور بعض ان کے شاگردوں کے شاگرد یا ان کے خاندان والوں میں سے کسی کے شاگرد تھے سب سے مشہور حلقۂ درس جناب مولانا شاہ محمدؐ اسحاق کا تھا' جو حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے بھی تھے اور جانشین بھی۔ نذیر حسین کی استعداد عربی ہدایۃ النحو تک محدود تھی اور اس وجہ سے وہ شاہ اسحاق کے حلقۂ درس میں شریک ہونے کی قابلیت نہیں رکھتے تھے یہی بات سمجھ کر وہ پنجابی کٹرہ کی مسجد اورنگ آبادی میں ٹھہرے اور مولانا عبدالخالق

Marfat.com

دہلی کے تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ مولانا عبدالخالق نہایت متقی پرہیز گار اور جید عالم تھے۔ انہیں اوّل حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی اور بعد میں شاہ محمدّ اسحاق دہلوی سے شرفِ تلمّذ حاصل تھا۔ کافیہ، قطبی معانی، شرح وقایہ نورالانوار اور حسامی یہ کتابیں نذیر حسین نے مولانا سے پڑھیں۔ صرف نذیر حسین کے استاد تھے بلکہ نذیر حسین کو ان کا داماد ہونے کا شرف بھی حاصل ہوا اور یہ انہی کی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ بہار کے ایک دُور افتادہ قصبے کا بچہ آگے چل کر "شیخ الکل" بنا شاہ اسحاق دہلوی کے ہندوستان سے مکہ معظمہ ہجرت کر جانے کے بعد متفقہ طور پر ان کا جانشین مقرر کیا گیا اور دہلی میں ساٹھ برس مسلسل حدیث شریف کا درس دیا اور "میاں" کا وہ لقب پایا جو صرف خاندان ولی اللّٰہی کے افراد کے لئے مخصوص تھا۔

آیئے! اب دیکھیے کہ نذیر حسین علم کی دھن میں اپنے شب و روز کا ایک ایک لمحہ کس طرح استعمال میں لا رہے ہیں۔ دہلی میں اس وقت جتنے بھی اہلِ علم و فضل ہیں ان سب سے جہاں تک ممکن ہوتا ہے، خوشہ چینی کرتے ہیں۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے بمشکل تین یا چار گھنٹے آرام کرتے ہوں گے ورنہ سارا وقت علم کے حصول میں صرف ہوتا ہے جن کتابوں کا اوپر ذکر ہوا ہے وہ مولوی عبدالخالق سے پڑھتے تھے۔ اس کے بعد حضرت مولانا آخوند شیر محمد قندہاری کے درس میں حاضر ہوتے، ان سے سید نذیر حسین نے شافیہ، اصولِ اکبری، شرح کافیہ، ملّا جامی مع حاشیہ عبدالغفور، زواہد ثلاثہ، صدر شمس بازغہ پڑھیں، اخوند صاحب، مولانا شاہ عبدالقادر محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، صحیح بخاری اور تفسیرِ بیضاوی میں شاہ اسماعیل کے ہم سبق۔

سید نذیر حسین کے تیسرے استاد مولانا جلال الدّین ہروی تھے۔ معقولات کے فاضل، کتبِ درسیہ پنجاب اور پشاور کے علماء سے پڑھ کر دہلی آئے تھے اور مولوی فضل امام خیر آبادی سے افق المبین کا کچھ حصہ پڑھا تھا۔ نذیر حسین نے ان سے شرح مسلم، حمداللہ، قاضی مبارک اور شرح مطالع پڑھی۔ چوتھے استاد مولوی کرامت علی اسرائیلی مولّف سیرت احمدیہ تھے یہ بزرگ فنونِ درسیہ میں مولوی فضل امام خیر آبادی اور مولانا شاہ رفیع الدّین محدّث دہلوی کے شاگرد اور علم حدیث میں شاہ اسحاق اور مولانا اسماعیل شہید کے تلمیذ تھے۔ نذیر حسین نے ان سے مطوّل، توضیح تلویح، مسلم الثبوت، تفسیر بیضاوی، تفسیر کشّاف، سورۂ نساء تک پڑھی مولوی کرامت علی مذہب شافعی رکھتے تھے اور ان کے والد حنبلی المذہب تھے۔ پانچویں استاد مولوی محمد بخش عرف تربیت خان تھے اپنے عصر کے مشہور ریاضی دان اور مہندس۔ نذیر حسین نے ان سے کتبِ ریاضیہ خلاصۃ الحساب، قوشجی، تشریح الافلاک، شرح چغمینی وغیرہ پڑھیں۔ تربیت خان خاندانی عالم اور شاہ رفیع الدّین محدّث دہلوی کے شاگرد تھے۔ ان کے پردادا حضرت مجددّ الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے اور شہزادہ سلیم بن اکبر کی تعلیم و تربیت بھی انہی کے سپرد تھی۔ اسی مناسبت سے دربارِ اکبری سے انہیں تربیت خان کا خطاب ملا تھا۔ جو نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا ہوا مولوی محمد بخش تک پہنچا تھا۔

Marfat.com

چھٹے استاد مولانا عبدالقادر رام پوری تھے۔ ان سے نذیر حسین نے مقاماتِ حریری، حمیدی اور کسی قدر دیوانِ متنبی پڑھا۔ اس کے علاوہ احادیثِ متفرقہ کا استفادہ بھی کرتے رہے۔ ایک اور استاد ملا محمد سعید پشاوری تھے، مگر ان سے نذیر حسین نے کیا پڑھا، اس کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی، مولوی حکیم نیاز احمد سہسوانی سے علمِ طب میں نفیسی اور معقول میں ملا حسن پڑھا تھا۔ آخر 1246ء میں تقریباً ساڑھے تین برس کی محنتِ شاقہ کے بعد تمام علومِ رسمیہ سے فارغ ہو کر ہمہ تن تفسیر وحدیث اور فقہ کی تحصیل میں مصروف ہو گئے۔ اب اس قابل تھے کہ حضرت شاہ اسحاق کے درس میں شریک ہو سکیں۔ چنانچہ صحاحِ ستہ، تفسیرِ جلالین، تفسیرِ بیضاوی، کنز العمال، جامع صغیر حافظ سیوطی وغیرہ کتابیں شاہ اسحاق سے پڑھنے کے علاوہ تیرہ برس کی مدت مدید شاہ صاحب کی صحبتِ بابرکت سے مستفیض ہوتے رہے۔ اسی زمانے میں جب کہ آپ شاہ اسحاق سے کسبِ فیض کر رہے تھے اپنے نہایت شفیق استاد مولانا عبدالخالق کی صاحب زادی رقیہ بیگم سے عقدِ نکاح کیا۔

سید نذیر حسین کی استاد زادی سے شادی کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ خیری خاندان کے ایک فرد مولانا عبدالغفار نے اس کا حال لکھا ہے اس زمانے میں یہ باتیں کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن حقیقت ہے کہ سب سچ ہیں۔

ایک دن مولوی عبدالخالق صاحب کی اہلیہ محترمہ نے ان سے کہا: "کچھ خبر بھی ہے بیٹی شادی کے قابل ہو گئی اور تمہیں کچھ فکر ہی نہیں۔" فرمایا: "اچھا شادی کے لائق ہو گئی! ضرور فکر کرتا ہوں۔" شام کو درس سے فارغ ہو کر صدر الصدور مفتی صدر الدین صاحب کے پاس پہنچے اور فرمایا: "میری بیوی نے آج بتایا ہے کہ میری بیٹی شادی کے قابل ہو گئی۔ مجھ کو مشورہ دیجیے۔" مفتی صاحب نے جواب دیا۔ "بغل میں بچہ شہر میں ڈھنڈورا۔ آپ کے مدرسے میں طالب علم سید نذیر حسین شریف خاندان، ہونہار صالح اور سید نجیب الطرفین موجود ہے اس میں کیا عیب ہے جو اِدھر اُدھر ڈھونڈا جائے؟" فرمایا! "ہاں ہے تو وہ لڑکا، پھر بات کس طرح ہو؟"

مفتی صاحب نے کہا یہ کام مجھ پر چھوڑیئے۔ مولوی عبدالخالق واپس آ گئے چند دنوں بعد مفتی صاحب آئے یا شاید مولوی صاحب کو بلایا اور مطلع کیا کہ معاملہ درست ہو گیا۔ میں نے رضامندی لے لی اور بیٹے سے بھی منگالی۔ اب تاریخ مقرر کر دو اور کارِ خیر سر انجام دو۔ ان دونوں حضرات نے مہر اور تاریخ کا آپس میں فیصلہ اور تعین کر لیا۔

مقررہ تاریخ اور مولوی عبدالخالق صاحب نے اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا آج لڑکی کو نہلا دھلا کر اچھے کپڑے پہنا دینا۔ اہلیہ نے سمجھا شاید کوئی لڑکی کو دیکھنے آئے گا۔ انہوں نے نہلا دھلا کر کپڑے پہنا، دلہن بنا دیا۔ عصر اور مغرب کے مابین مفتی صدر الدین صاحب میاں نذیر حسین کو دولہا بنا، برات لے کر آ گئے۔ جو مسجد مذکور میں بٹھائی گئی۔ عقدِ نکاح کے بعد مولوی عبدالخالق گھر میں آئے اس گھر میں

Marfat.com

جو شادی کا گھر تھا' مگر اس میں سوائے دلہن ' دلہن کی والدہ اور دلہن کی چھوٹی بہن کے دو چار عورتیں محلے والیاں بن بلائے اور تھیں۔ مولوی عبدالخالق نے گھر میں آکر فرمایا: "لڑکی کے کپڑے گٹھڑی میں باندھ دو اور جو کچھ ہو وہ باندھ رکھو' ڈولی آتی ہوگی"۔ بیوی صاحبہ کو غصہ آہی رہا تھا کہ نہ عزیز و اقربا کو بلایا نہ ملنے والیوں کو۔ غصّے میں کہا سب کو زندہ دفن کر دیا؟ کسی کو خبر تک نہ کی؟ یہ شادی کرنے اٹھے ہیں یہ کہتے کہتے وارفتگی بڑھی۔ قبلہ مولوی صاحب کی کمر پر ایک دو ہتڑ بھی رسید کر دیا۔ حضرت مولوی صاحب نے سب باتوں کو نظر انداز کر کے فرمایا "اچھا اچھا لڑکی واپس آئے گی' تو سب کو بلا کر کھلا پلا لینا۔ اب اس وقت رخصت کرو ڈولی آتی ہوگی"۔ غرض کہ لڑکی رخصت ہوئی اور مفتی صدرالدّین صاحب جو دولہا کے والد کی نمائندگی فرمارہے تھے بہو کو وداع کر کے اپنی حویلی میں لے گئے۔ آغاز 1248ء مطابق 1833ء میں سیّد نذیر حسین کی شادی ہوئی اور اسی سال کے آخیر میں انہیں اللہ تعالیٰ نے ایک بچہ عطا کیا جس کا نام شریف حسین رکھا گیا۔

حضرت شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب نے 1258ھ میں ایکا ایکی ہندوستان سے ہجرت کرنے اور مستقل طور پر مکّہ معظّمہ میں قیام کا ارادہ فرمالیا۔ انہی دنوں رخصت کے وقت حضرت شاہ صاحب نے میاں نذیر حسین کو سندِ تحریری اجازت دی۔

اس زمانے میں شہر دہلی میں بڑے بڑے نامور علما اور فضلا موجود تھے ان سے اکثر شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کے تلمیذ و تربیت یافتہ بلکہ درس و تدریس میں مشغول تھے خود حضرت شاہ صاحب کے حقیقی بھتیجے یعنی مولانا شاہ رفیع الدّین کے صاحب زادے مولانا مخصوص اللہ کا درس قائم تھا۔ جنھوں نے کامل پچیس برس حضرت شاہ عبدالعزیز کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا۔ پھر شاہ اسحاق کے بے شمار تلامذہ دہلی اور اطرافِ دہلی میں حاضر تھے ان میں بعض تو صاحبِ سجّادہ وطریقہ بھی تھے۔ ان اسباب سے ایسے حضرات کا مرجعِ خلائق اور مقبولِ عام ہو جانا کچھ بعید از فہم نہ تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسے ایسے اکابر کی موجودگی کے باوجود سیّد نذیر حسین کا شاہ عبدالعزیز کی مسندِ درس کا مالک ہو جانا حد درجہ حیرت کا باعث ہے حتیٰ کہ میاں صاحب کا لقب جو حضرت شاہ ولی اللہ قدّس سرّہٗ کے خاندان والوں کے لئے مخصوص تھا اور بسلسلہ جانشینی منتقل ہوتا ہوا مولانا شاہ محمّد اسحاق تک پہنچا تھا' وہ بھی ان کے ہجرت فرما جانے کے بعد سیّد نذیر حسین کے نام کے ساتھ اس طرح چسپاں ہوا کہ اب میاں صاحب اور مولوی نذیر حسین گویا دو مترادف لفظ ہو گئے۔

علمِ حدیث تو میاں صاحب کا خاص فن تھا جس کی برّ صغیر پاک و ہند میں اشاعت قادرِ مطلق نے اب آپ کی ذاتِ بابرکات سے وابستہ کر دی تھی۔ اور فی الواقعہ حدیثِ رسول ؐ کی ترویج جیسی آپ کے ذریعے ہوئی۔ اس میں کوئی آپ کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ چنانچہ کبھی کبھی جوش میں آکر خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں نے صحاحِ ستہ کو گلستانِ بوستان بنا دیا۔ میاں صاحب کے ایک شاگرد اپنی یادداشت میں لکھتے

Marfat.com

ہیں۔ میں نے خود کئی بار حضرت سے پوچھا کہ صحاح اور خصوصاً صحیح بخاری حضور نے کتنی مرتبہ پڑھائی ہوگی؟ ارشاد ہوا۔ کیا بتاؤں!! اللہ ہی کو علم ہے۔ میری یاد صحیح ہے تو کئی سوبار پڑھائی ہوگی۔ سچ تو یہ ہے کہ فنونِ متداولہ درسیہ میں کوئی فن ایسا نہ تھا جس میں آپ کامل استعداد نہ رکھتے ہوں۔ خصوصاً فقہ حنفی پر کامل عبور تھا۔ خود میاں صاحب فرماتے تھے کہ فتویٰ عالمگیری جیسی حرفاً حرفاً مطالعے سے گزری ہے اور مختلف مقامات سے بلاترتیب دیکھنے پڑھنے کا تو کوئی شمار ہی نہیں اس سبب سے کتاب کی جزئیات پر ایسا احاطہ ہو گیا تھا کہ گویا ساری کتاب ازبر محفوظ تھی۔

اصولِ فقہ میں جو دستگاہ میاں صاحب نے بہم پہنچائی دورِ آخر میں شاید ہی کوئی اس درجے تک پہنچا ہو۔ ان کی طبیعت ابتداہی سے تحقیق کی طرف مائل تھی اور وہ طالب علمی کے زمانے ہی سے دلیل مسئلہ میں نظر کرنے کا حوصلہ وشوق رکھتے اور دلیل ہی کا اتباع کرتے تھے اس لئے انہیں حدیث وفقہ کے ساتھ ساتھ اصولِ فقہ میں بھی واقفیت اور کامل فہم حاصل کرنا ضرور تھا۔ اس فن میں آپ کے تبحّر کا اندازہ آپ کی معرکتہ آلاراء تصنیف معیار الحق سے بخوبی ہوتا ہے جو کتبِ اصول کے شواہد سے مالا مال ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس فن میں آپ کو کیسی قدرت حاصل تھی علومِ دین میں فقہ حدیث تفسیر یہی تین علم مقصود بالذّات ہیں اور میاں صاحب کی ذات ان تینوں علوم کا مجسّمہ تھی اس کے ساتھ ساتھ فنِ تجوید وقرأت میں بھی آپکی نگاہ بڑی وسیع تھی علمِ کلام پر بھی عبور تھا لیکن اسے بدعت خیال کر کے درس وتدریس سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی الغرض شاہ محمد اسحٰق کی ہجرت کے بعد میاں صاحب نے مسجد اورنگ آبادی میں اپنا مستقل حلقۂ درس قائم کیا اور 1270ھ تک طلبہ کو صرف نحو' معانی' بیان منطق' معقولات فقہ حدیث' اصولِ حدیث اور تفسیر کی کتابیں پڑھاتے رہے لیکن آہستہ آہستہ دیگر فنون سے اعراض کر کے صرف علومِ دین فقہ' حدیث اور تفسیر کو اختیار کر لیا اور زندگی کا باقی حصہ جو تقریباً پچاس برس کا طویل زمانہ ہے محض دین کی خدمت اور علومِ دین کی اشاعت میں بسر کر دیا ع

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

میاں صاحب کا شوقِ کُتب بینی عشق کے درجے میں تھا جب سے علم کی لگن ہوئی کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جو کتاب کے مطالعے سے خالی رہ گیا ہو۔ جب آپ دلّی میں آئے ہیں............ اس زمانے میں دو لاجواب کتب خانے شہر میں تھے ایک قلعہ معلّی کا شاہی کتب خانہ جس میں شاہانِ مغلیہ کے دورِ حکومت سے لاتعداد کتابوں کا ذخیرہ برابر جمع ہوتا آیا تھا بہادر شاہ ظفر کے ولی عہد مرزا فخرالدّین عرف مرزا فخرو سے میاں صاحب کا نہایت قریبی ربط ضبط تھا اور اسکی بنیاد دنیاوی دولت ووجاہت کے بجائے محض علم دوستی اور ذوقِ کتب بینی پر منحصر تھی' مرزا فخرو کو بھی مطالعے کا بڑا شوق تھا اور جونہی کوئی نئی کتاب قلعے کے کتب خانے میں داخل ہوتی وہ سب سے پہلے میاں صاحب کو اس کی اطلاع دیتے میاں صاحب قلعے میں جا کر بھی کتابیں پڑھتے اور وہاں سے گھر پر بھی مطالعے کیلئے لے آتے تھے۔ ہر کتاب شروع سے آخر تک پڑھتے اور جو

Marfat.com

مفید مضامین نظر آتے انہیں ایک بیاض میں درج کر لیتے اس بیاض کا نام کشکول رکھا تھا۔

دوسرا کتُب خانہ دہلی میں مولانا شاہ عبدالعزیز کا تھا جس میں جمع کتب کا کام ان کے دادا حضرت شاہ عبدالرّحیم کے عہد میں ہوا۔ پھر شاہ ولی اللہ نے اس میں بہت اضافہ کیا یہاں تک کہ شاہ عبدالعزیز کے زمانے میں وہ باقاعدہ کتب خانہ بن گیا۔ اس میں مصر، ترکی اور عرب وغیرہ سے بھی کتابیں آتی رہتی تھیں۔ میاں صاحب نے اس کتب خانے سے پورا فائدہ اٹھایا اور کوئی کتاب ایسی نہ تھی جو نظر سے محفوظ رہ گئی ہو۔ تیسرا ذاتی کتب خانہ تھا۔ اس میں بڑی محنت اور تگ ودو سے کتابیں جمع کی تھیں۔ بیشتر کتابیں قلمی اور دستِ خاص کی لکھی ہوئی تھیں۔ یہ کتب خانہ 1857ء میں لٹ گیا جس کا رنج میاں صاحب کو مرتے دم تک رہا۔

اس کے علاوہ بارہا آپ کو لکھنؤ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بحرالعلوم کے کتب خانے کو خوب کھنگالا۔ یہاں کئی ہزار کتابیں تھیں۔ مولوی حامد حسن لکھنوی کا کتب خانہ بھی بہت عمدہ تھا۔ میاں صاحب کو بالکل علم نہ تھا کہ لکھنؤ میں سیر وسیاحت اور قابلِ دید مقامات کون کون سے ہیں کیونکہ جتنے روز بھی لکھنؤ میں قیام ہوتا۔ برابر کتب خانوں میں پورا وقت گزرتا تھا ہر فن کی کتابیں دیکھتے اور خریدتے تھے۔ ایک دفعہ میر تقی میر کی کلیات تین روپے میں خریدی۔ ریاست بھوپال کے کتب خانے سے بھی کتابیں مستعار مطالعے یا نقل کے لئے منگواتے تھے۔ ایک بار کسی طالب علم کو پاپیادہ لکھنؤ بھجوا کر ایک نایاب کتاب منگوائی تھی۔ مطالعۂ کتب میں بھی ہر جگہ اصول پیش نظر تھا کہ اساتذۂ فن اور مُستند مصنفین کی کتابیں دیکھی جائیں۔

آپ کی مجلسِ درس بھی عجب پُر کیف اور پُر اثر ہوتی تھی اور اس قدر شرح وبسط سے تقریر فرماتے تھے کہ غبی سے غبی طالب علم کے ذہن میں بھی معنی ومطالب ہمیشہ کے لئے نقش ہو جاتے۔ میاں صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ بخاری شریف کی اوّلین حدیث اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتْ کو میں پہلے ستائیس روز میں پڑھایا کرتا تھا، لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا اب تو ہتھیلی پر سرسوں جماتا ہوں۔ اس کے باوجود دو برس پوری صحاح ستہ اور تمام ماہِ رمضان میں آپ جلالین شریف پڑھاتے تھے اور علمِ حدیث کی تحصیل کے لئے دو تین برس سے کم مدت کو کافی خیال نہیں فرماتے تھے۔ آپ کے درس کی دھوم سارے ہندوستان میں مچی ہوئی تھی۔ صرف ونحو، منطق، فلسفہ اور فقہ کے ماہرین بغرض امتحان آتے اور جب اپنی تشفی کر لیتے، تو حلقۂ تلامذہ میں داخل ہو جاتے کبھی کبھی طلبہ کی فرمائش پر وعظ بھی بیان کرتے، لیکن اس سے مقصود محض ہدایت تھی۔ اس لئے وہ طریقہ اختیار کیا جو نمائش سے دور مگر معنی خیز اور عام فہم تھا۔ ابتدا میں قرآن مجید کی کوئی چھوٹی سی صورت یا آیت تلاوت کرتے پھر اس کا ترجمہ اور جتنے مسائل پر وہ نصِ صریح مشتمل ہوتی ان کو بیان کرتے اور حتی الامکان قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کرتے اور شواہد میں احادیث اور متعلقہ مسائل بھی بیان کرتے جاتے تقریر میں سادگی اور صفائی ایسی ہوتی کہ جو زبان سے نکلتا وہ سامعین کے دلوں میں اترتا جاتا

Marfat.com

صبح کا درس ایک رکوع قرآن مجید کا گویا روزانہ کا وعظ سنا ایک ختم قرآن کا ہر سال یوں بھی ہوتا قرآن میں جہاں توحید باری کا مضمون آتا اسے سمجھا کر بطور مزاح کہتے مگر تم دِلّی والے یا پیر یا پیر ہی کہتے رہے ماقدروا اللہ حق قدرہ چلو صاحب چلو"۔

1857ء کے غدر میں جہاں اور علماء نے خوشی یا ناخوشی سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تو میاں صاحب نے اس پر اپنے دستخط کئے نہ مہر لگائی خود کہتے تھے "میاں وہ ہلڑ تھا بہادر شاہی نہ تھی بے چارہ بوڑھا بہادر شاہ کیا کرتا؟ حشرات الارض خانہ برانداز وں نے تمام دہلی کو خراب ویران تباہ اور برباد کر دیا۔ شرائطِ امارت اور جہاد بالکل مفقود تھے ہم نے اس فتوے پر دستخط نہیں کئے مہر کیا کرتے اور کیا لکھتے؟"

اسی دورِ پُر فتن کا ذکر ہے میاں صاحب ایک دن قلعہ معلیٰ میں گئے............ دیکھا کہ شہزادوں کے ہاتھوں کے جھول نہایت پُر تکلف تیار ہو رہے ہیں اور بے فکر کے شہزادے سامنے پیچوان لگائے گپ لڑا رہے ہیں آپ نے بہادر شاہ سے جا کر کہا:" کیا حضور انہی شاہزادوں کو ہاتھیوں پر ساتھ لے جا کر انگریزوں سے لڑیں گے"؟ بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا اور چپ رہا ایک دن دیکھا کہ انگریزوں کی دس بارہ عورتیں اور ایک کم سن بچی گرفتار کر کے قلعے میں لائی گئیں صوبے دار نے سب کو مار ڈالنے کا حکم دیا وہ عورتیں چلّا چلّا کر رونے لگیں۔ میاں صاحب کے دل پر اس نظارے کا ایسا صدمہ ہوا کہ آب دیدہ ہو کر اسی وقت قلعے سے یہ کہتے ہوئے نکلے" اب دہلی اور دہلی والوں کی خیر نہیں ہے عورتوں کا قتل اسلام نے کبھی جائز نہیں رکھا"۔

انہی دنوں میں میاں صاحب نے جان پر کھیل کر ایک زخمی انگریز عورت مسز لیسن کی جان بچائی وہ سڑک پر بے ہوش اور خون میں لت پت پڑی تھی مفسد اپنی دانست میں اسے مار گئے تھے میاں صاحب اپنے ایک شاگرد کے ہمراہ ادھر سے گزرے تو عورت کے کراہنے کی آواز سنی لالٹین کی روشنی میں دیکھا تو ابھی جان باقی تھی اسی وقت اٹھا کر اپنے گھر میں لائے اور اُپلوں کی کوٹھڑی میں چھپا دیا ساڑھے تین مہینے تک اس کا علاج معالجہ کیا اور پناہ دی اس وقت اگر فتنہ پردازوں کو ذرا بھی بھنک پڑ جاتی تو میاں صاحب کے گھر کی بربادی میں مطلق دیر نہ لگتی لطف یہ کہ پنجابی کٹڑے کی مسجد پر باغی قبضہ کئے ہوئے تھے اور اس مسجد سے ملا ہوا مکان ہی میاں صاحب کا تھا۔ آخر بڑی مشکل سے اس میم کو انگریزی کیمپ میں پہنچایا۔ میاں صاحب خود اس واقعے کا ذکر ان الفاظ میں کرتے تھے "اس زمانے میں ایک دن نماز عصر کے بعد شہر سے باہر چلا گیا۔ ملاّ محمد صدیق پشاوری جو اس وقت مجھ سے اصولِ فقہ پڑھتا تھا۔ ساتھ تھا مجھے کسی آدمی کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں ادھر گیا دیکھا کہ ایک میم مجروح رو رہی ہے ہم لوگوں کو دیکھ کر کہنے لگی:" خدا کے واسطے مجھے مت مارو"میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا ہم مسلمان ہیں ہمارے دین میں لڑائی کے وقت بھی دشمن کی عورت اور بچوں کو جان سے مارنا یا ایذا پہنچانا حرام ہے۔ تم اپنی جان سے پوری طرح اطمینان رکھو اگر تمہاری مرضی ہو تو ہم تمہیں اپنے گھر لے چلیں اور تمہاری تیمار داری کریں، لیکن چونکہ بہت ڈری ہوئی تھی

Marfat.com

کہنے لگی اوّل تو ہم اپنے پاؤں سے چل نہیں سکتے اور تم لوگ اگر اٹھا کر لے بھی چلو' تو باغیوں کی گولی سے بچ نہیں سکتے میں نے کہا "اچھا ہم لوگ تم سے کچھ دور ٹھہرتے ہیں۔ رات کو اندھیرے میں تمہیں اٹھا کر لے چلیں گے"۔ آخر یہی ہوا رات کی تاریکی میں ہم دونوں اسے اٹھا کر ایسے راستے سے لائے کہ کسی فرد بشر کو اس کی خبر ہی نہ ہوئی۔ ہم نے اسے گھر میں لے جا کر شریف حسین کی والدہ سے کہا یہ عورت نہایت مظلوم ہے اس کی بہت دلجوئی اور خدمت کرنی چاہئے کہ خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کا موجب ہے اس میم کو میں نے باغیوں کے باہر رہنے کی خبر بھی نہ دی ورنہ خبر ہو جانے کے بعد اس کے وہ ساڑھے تین مہینے نہایت تشویش اور خوف کی حالت میں بسر ہوتے موسم سخت گرمی کا تھا اور وہ بے چاری دن رات ایک کوٹھڑی میں بند رہتی ہر چند میری اہلیہ اس سے کہتیں کہ رات کو انگنائی میں آن کر بیٹھو مگر وہ ڈر کے مارے کوٹھڑی سے باہر نہ آتی۔ اور اسی گرمی اور مچھروں کی تکلیف میں رات بھر ہاتھ اٹھائے دعا کرتی کہ اے خدا' میرا قصور معاف کر۔

غدر کے کوئی سات آٹھ برس بعد 1864ء میں جب ہندوستان کے اکثر شہروں پٹنہ' داناپور' میرٹھ' انبالہ وغیرہ میں وہابیت کے مقدمے چلائے گئے' تو بیشتر ماخوذین کیلئے حبسِ دوام بعبور دریائے شور کا حکم دیا گیا' مولوی یحییٰ علی مولوی احمد اللہ اور مولوی جعفر تھانیسری کے مقدمے کی لپیٹ میں میاں نذیر حسین بھی آ گئے۔ انکے خلاف تحقیقات ہوئی اور کامل ایک برس راولپنڈی جیل میں نظر بند رہے۔ دہلی میں میاں صاحب کے مکان اور مسجد کی جب تلاشی ہوئی تو دوسروں کے بھیجے ہوئے خطوط بڑی تعداد میں دری پر' چٹائی پر' دری کے نیچے' چارپائی کے نیچے اور کتابوں میں پائے گئے پوچھا گیا "آپ کے ہاں اس قدر خط کیوں آتے ہیں"؟ جواب دیا "اس کی وجہ تو بھیجنے والوں سے پوچھنی چاہئے یا ان خطوط میں دیکھنا چاہئے"۔

"ہندوستان میں وہابی تحریک" کے مؤلف ڈاکٹر قیام الدّین احمد کی تحقیق کے مطابق میاں نذیر حسین وہابی تحریک میں برابر ملوث تھے گو اس کا کوئی یقینی ثبوت نہیں ملتا یہ واقعہ ہے کہ ان کے گھر کی تلاشی میں بہت سے مشتبہ قسم کے خطوط نکلے ان میں سے بعض خطوط معروف وہابیوں کے تھے جو انہوں نے میاں صاحب کے نام لکھے تھے جیسے جعفر تھانیسری اور مبارک علی عظیم آبادی' ایک خط خود میاں نذیر حسین کے قلم سے لکھا ہوا سرحد کے "وہابی" سردار عبداللہ کے نام بھی تھا۔ انگریز ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس ریلی نے میاں نذیر حسین کی گرفتاری کی سفارش کی' لیکن وہ مشہور و معروف عالمِ دین تھے اور ان کے خلاف کسی اطمینان بخش شہادت کے بغیر حکومت اس انتہائی اقدام سے متامّل تھی۔ حکومت نے اس معاملے کی رپورٹ حکومتِ پنجاب کو بھیج دی جس کے ماتحت خطّہ دہلی بھی تھا اور درخواست کی کہ وہ جو مناسب اقدام سمجھے کرے۔ پنجاب کی حکومت نے ان کو احتیاطی طور چھ ماہ جیل میں قید رکھنے کا حکم نافذ کیا۔ مگر اس کے فوراً بعد ہی انہیں رہا کر دیا۔

Marfat.com

دسمبر 1865ء میں عبداللہ نے راولپنڈی میں جو بیان دیا تھا اس کے مطابق میاں نذیر حسین دہلی "وہابی" کارکنوں کے صدر تھے راج محل کے ایک اور گواہ نے بھی شہادت دی کہ نذیر حسین نے اس کو سرحد جانے پر آمادہ کیا تھا۔ ریلی نے سفارش کی کہ نذیر حسین کے معاملے کی دوبارہ جانچ کی جائے اور گواہوں سے ان کا مقابلہ کرایا جائے پھر کاغذات حکومتِ پنجاب کو بھیجے گئے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی لیکن بعد کی تحقیقات میں وہ نمایاں نظر آئے۔

میاں صاحب کے سیرت نگار کا بیان ہے کہ راولپنڈی جیل میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ کتب بینی کا خوب موقع ملا۔ سرکاری کتب خانے سے کتابیں منگوانے کی اجازت مل گئی تھی اور وہاں بخاری شریف کا ایک سبق پڑھانے کے سوا کوئی اور کام نہ تھا لہٰذا جی بھر کر مطالعے میں وقت لگایا۔ جیل ہی میں عطا اللہ نام کے ایک طالب علم نے جو آپ کے ساتھ تھا۔ سبقاً سبقاً بخاری پڑھ ڈالی اور قرآن مجید بھی حفظ کر لیا۔ میر عبدالغنی ساکن سورج گڑھ جو نہایت پرہیزگار عابد اور نیک بزرگ آپ کے ساتھ جیل میں تھے انہوں نے وہیں قید کی حالت میں وفات پائی۔ میاں صاحب نے اپنے ہاتھ سے ان کی تجہیز و تکفین کی اور خود نماز جنازہ پڑھائی۔

1300ء ہجری میں آپ نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ اس سفر کے واقعات نہایت عبرت انگیز ہیں۔ محافظوں نے اس سرزمینِ پاک میں بھی آپ کو چین سے بیٹھنے نہ دیا اور طرح طرح کے بے بنیاد الزامات آپ پر لگا کر پاشائے مکہ کو بدظن کر دیا، لیکن بعد میں میاں صاحب نے ان سب الزامات سے اپنے آپ کو بری ثابت کیا۔ پھر تو میاں صاحب کا وہاں حد درجہ احترام ہوا اور فراغتِ حج اور زیارتِ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ یکم جنوری 1884ء کو بمبئی واپس آئے اور وہاں سے آپ کے رفقا نے اپنے دہلی پہنچنے کی تاریخ سے مطلع کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کا بیان ہے کہ جب آپ سفرِ حجاز سے تشریف لائے تو دہلی سٹیشن پر استقبال کے لئے اس قدر لوگ حاضر ہوئے کہ پلیٹ فارم کا ٹکٹ ختم ہو گیا۔ کارپردازانِ سٹیشن حیران تھے کہ یہ کس نامی گرامی شخص کی آمد آمد ہے۔ جب ٹرین دہلی سٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچی تو آدمیوں کا ایسا اژدہام دیکھا کہ ہم لوگوں نے تمام زندگی کبھی کسی عالم، درویش ولی متقی، امیر اور وزیر کے قدوم پر ایسی کثرت نہیں دیکھی تھی۔ کہیں ایک بالشت زمین بھی خالی نظر نہیں آتی تھی۔ بہت لوگ ایسے تھے جنہیں میاں صاحب کی زیارت بھی سٹیشن پر نصیب نہ ہو سکی۔ کجا مصافحہ...... میاں صاحب کو بھی ایک ایک قدم چلنا دشوار ہو گیا۔ آخر بڑی مشکلوں سے نواب محمد علاؤالدین خان رئیس لوہارو اور چند معززین اعیانِ دہلی نے آپ کو حلقے میں لیا اور بڑی مشکل سے فٹن تک پہنچایا۔ ریلوے کے افسران یورپین، دیسی ہندو، مسلمان اور عیسائی یہ منظر دیکھ کر سخت حیرت میں تھے کہ خدا کا یہ کون مقدر بندہ ہے۔ جس کے لئے ہزاروں دیدۂ دل فرشِ راہ ہیں۔

1315ء ہجری مطابق 1897ء عیسوی میں یکایک گورنمنٹ نے 1315ہجری

Marfat.com

مطابق 1897ء میں یکایک گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ آپ کو شمس العلما کا خطاب دیا جائے چنانچہ جس وقت دہلی کے چیف کمشنر نے بحکم لیفٹیننٹ گورنر پنجاب اس خطاب کی خبر آپ کو دی، تو آپ حیران رہ گئے اور کہا ہم غریب آدمی خلعت و خطاب لے کر کیا کریں گے۔ یہ چیزیں تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہیں ہم کو دنیا لا حاصل ہے.......... پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد چیف کمشنر سے فرمایا..... "اچھا صاحب جو آپ کی مرضی آپ حاکم ہیں جو چاہیں کہیں" اس کے بعد جب کوئی شخص شمس العلما کے خطاب کا تذکرہ آپ کے روبرو کرتا، تو آپ سادگی سے فرماتے "میاں خطاب سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارے لئے تو پورا خطاب قرآن مجید میں حنیفاً مسلماً کا موجود ہے۔ دنیاوی خطاب سلاطین سے ملا کرتا ہے۔ یہ گویا ان کی خوشنودی کا اظہار ہے۔ مجھے تو کوئی نذیر کہے تو کیا اور شمس العلما کہے تو کیا۔ میں نہایت خوش ہوں کہ ہر ایک "میاں صاحب" مجھے کہتا ہے بھائی سادات کے لئے اس سے بڑھ کر پیار الفظ اور کوئی نہیں ہے۔ اس لفظ کی برکات سے میری درویشانہ طرز میں فرق نہ آئے۔ بس یہی خدا کا فضل ہے"۔

جن حضرات نے میاں نذیر حسین کے صرف علمی فضل و کمال کی تصویریں دیکھی ہیں۔ وہ شاید یہ جان کر حیران ہوں کہ میاں صاحب نہایت بلند مقام رکھنے والے صوفی بھی تھے اور صفائی باطن اور درستیٔ اخلاق جو تمام تصوّف کی اصل ہے، اس پر کیسی محنت اور مشقت سے کاربند رہتے تھے۔ صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث میں آپ جس وقت کتاب الرقاق پڑھاتے اور تصوّف کے نکات بیان فرماتے، تو اکثر کہا کرتے تھے "صاحبو ہم تو احیا العلوم کو یہاں دیکھتے ہیں"۔ اس لئے شیخ اکبر محی الدّین ابن عربیؒ کی بڑی تعظیم کرتے اور انہیں خاتم الولایۃ المحمدیہ فرماتے اور بات بھی یہی ہے۔ علم ظاہر و باطن کی ایسی جامعیت ندرت سے خالی نہیں۔

دوسری تعلیم صوفیائے کرام کی مواظبت علی الطہارت ہے اور یہی زینہ ہے آئندہ کی گوناگوں ترقیات کا۔ آیئے، اب اس کسوٹی پر میاں نذیر حسین کے شب و روز کسیں، چوبیس گھنٹوں میں صرف چار گھنٹے آپ آرام فرماتے تھے اور حالتِ بیداری میں مشکل سے کوئی لمحہ ایسا گزرتا ہوگا جب آپ باوضو نہ ہوں۔ ایک بجے رات بیدار ہوتے اور وضو کے بعد تہجد کی نماز میں ساڑھے تین بجے شب تک مشغول رہتے پھر اس کے بعد مسجد میں آکر درِ مسجد یا صحن میں بیٹھ کر مراقبہ اور ذکر میں مصروف رہتے کبھی کبھی حالتِ وجد میں عربی فارسی اور اردو کے اشعار نہایت دردناک لہجے میں پڑھا کرتے۔ فجر کی نماز کے بعد قرآنِ مجید کا درس ہوتا۔ پھر گیارہ بجے تک حدیث شریف کا۔ ہاتھ میں تسبیح برابر رہتی۔ اور اذکارِ ماثورہ خود پڑھتے اور طلبہ کو حدیث پڑھاتے جاتے گیارہ بجے مسجد اور بارہ بجے گھر سے مسجد واپس آجاتے۔ اس وقت سے مغرب تک تین وقتوں کی نمازوں اور درس کے سوا کوئی دوسرا کام نہ ہوتا۔ فریضۂ مغرب کے بعد گھر جاتے اور ثلث شب کے قریب نمازِ عشا کے لئے مسجد میں آجاتے۔ نماز میں خشوع و خضوع انتہا درجے کا ہوتا اور اس سے تعبد اللہ کانک تراہ کے معنی اچھی طرح سمجھ میں آجاتے۔

Marfat.com

مخلوقِ خدا پر از حد شفقت تھی۔ کسی کو مصیبت میں نہ دیکھ سکتے تھے۔ گرمی، سردی، روشنی، تاریکی کی پروا کئے بغیر اہلِ حاجات کی سفارش کے لئے میلوں پاپیادہ بلکہ کبھی برہنہ پا بھی چلے جاتے تھے۔ ضرورت مندوں کی خبر گیری رکھتے اور محتاجوں وغیرہ کے لئے بارش میں بھیگتے ہوئے بازار جاتے اور ان کی چیزیں خرید کر لا دیتے طلبہ کے لئے نہ صرف دن رات کا کھانا بارش گرمی اور سردی کے موسم میں اپنے ہاتھ سے مدرسے اور مسجد میں پہنچاتے، بلکہ رمضان میں سحری تک خود لے کر آتے بعض اوقات برسات کی اندھیری راتوں میں جب کہ مدرسے کی گلی میں گھٹنوں گھٹنوں پانی کھڑا ہوتا، آپ دسترخوان میں کھانا لپیٹے گلی میں سے پکار کر کہتے کہ اجی فلاں مولوی صاحب اپنی روٹی لے لو۔ شہر میں ہر غریب، امیر کو یہ تمنا رہتی کہ اس کے بچے یا بچی کا نکاح میاں صاحب پڑھائیں۔ آپ کیسی ہی تکلیف میں ہوں کبھی انکار نہ کرتے ایک موقع پر کسی شریف عورت کو جس کو اس کے سوتیلے بیٹے سے قضیہ پیش تھا۔ ان لفظوں میں آپ نے سمجھایا تھا۔ ارے ہم نے تیری نانی کا نکاح پڑھایا، تیری ماں کا نکاح پڑھایا، تیرا نکاح پڑھایا، اب تو ایسی بدذات ہوگئی، یہ سن کر وہ رونے لگی اور عرض کیا کہ جس طرح آپ چاہیں، جائیداد تقسیم کر دیں۔ ہمیں منظور ہے۔

اہلِ حاجات سفارش کے خطوط آپ سے بہت لکھواتے اور کبھی کبھی بلا درخواست آپ خود بھی لکھ دیتے جس وقت کسی مسلمان امیر یا غریب کے مرنے کی خبر پاتے تو فوراً سبق بند کر کے اس کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ میں شریک ہوتے آپ کے مخالف دشمنوں میں سے ایک شخص رام پور کا رہنے والا سفرِ حج میں ابتداء سے ساتھ ہوا اور واپسی تک ساتھ نہ چھوڑا کسی موقع پر تکلیف دینے یا ایذا رسانی سے اس نے اغماض نہ کیا۔ یہاں تک کہ میاں صاحب کو قتل کر دینے کا منصوبہ بھی بنایا۔ مگر ناکام رہا ہندوستان پہنچنے کے چند ہی دن بعد وہ مسجد میں آپ کے پاس آیا آپ نہایت خندہ پیشانی سے ملے اس نے درخواست کی کہ ایک سفارشی خط نواب رام پور کے نام لکھ کر مجھے دے دیں۔ میاں صاحب نے فرمایا بھائی میں غریب آدمی ہوں میری سفارش کا وزن نواب کے نزدیک کیا ہوگا۔ اس نے اصرار کیا کہ حضور لکھ دیں فرمایا اچھا خط لکھ اس کے حوالے کیا اور وہ خوشی خوشی چلا گیا۔

محمد شاہ پنجابی آپکا شاگرد تھا مال وزر کے لالچ میں میاں صاحب کے مخالفوں میں شامل ہو گیا اور جا بجا استاد کے خلاف ہرزہ سرائی کرتا۔ لیکن مزے کی بات یہ کہ جب اسے خرچ کی ضرورت ہوتی۔ بے تکلف میاں صاحب کے پاس چلا آتا اور کہتا کہ حضرت آج کل سخت تکلیف ہے۔ آپ فوراً روپے پیسے سے اس کی مدد کرتے۔ ایک دن عطا اللہ مرحوم سوداگر پنجابی نے عجیب واقعہ سنایا۔ کہنے لگے "میاں صاحب کے کسی دشمن نے ارادہ کر لیا کہ آج انہیں قتل کر ڈالے چنانچہ رات کے وقت تلوار لے کر پھاٹک حبش خان کے قریب گھات میں لگا رہا۔ جانتا تھا کہ میاں صاحب عشاء کی نماز کے لئے ادھر سے گزریں گے جب اس نے میاں صاحبؒ کو آتے دیکھا تو تلوار سونت کر سامنے آیا آپ نے ڈپٹ کر کہا۔ خبردار، جہاں ہے وہیں رک جا میں اگر علیؓ کی اولاد ہوں تو تو کبھی اپنے ارادے میں کامیاب نہ

Marfat.com

ہو گا۔" یہ کہنا تھا کہ حملہ آور کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ تلوار ہاتھ سے گر گئی اور وہ اپنے گھر کو بھاگا۔ گھر پہنچا ہی تھا کہ پیٹ میں شدید درد ہوا۔ یہاں تک کہ جب زندگی سے مایوس ہوا۔ تو لوگوں کو بلا کر کہا۔ میں غضب الٰہی میں مبتلا ہوں اور صورتحال یہ ہے۔ چنانچہ اس کی زبانی اس واقعے کا علم ہوا اور وہ شخص اسی دن مر گیا۔

حافظ عبدالمنان محدث وزیرآبادی بیان کرتے ہیں کہ اوائلِ حال میں جب کہ عسرت غالب تھی اور اکثروبیشتر فاقے کی نوبت آتی، مولوی محمد دین پنجابی میاں صاحب کے مہمان ہوئے آپ اپنے حصے کا کھانا دونوں وقت انہیں کھلاتے اور خود فاقہ کرتے اِس حالت میں بھی نہ تو پابندیٔ اوقات میں فرق آیا نہ معمولات میں اور کسی کو ان فاقوں کی خبر تک نہ ہوئی۔ نقاہت اور ضعف کے سبب آپ طلبہ کو بیٹھ کر نہ پڑھا سکتے اور لیٹے لیٹے سبق پڑھاتے لیکن ناغہ نہ کرتے پھر اندازہ ہو جاتا کہ آپ فاقے سے ہیں۔

مساکین اور فقرا مسجد کے دروازے پر آن کھڑے ہوتے تو خود جا کر چپکے سے ان کو کچھ دے آتے۔ بعض نادار طالب علموں کی بھی اسی طرح مدد کرتے کہ انہیں خبر نہ ہوتی کسی طالب علم کو تحصیل علم کے بعد رخصت کرتے تو وصیت کرتے کہ دیکھو ہمیشہ تقویٰ اختیار کرنا غذا میں آپ اکثر روٹی سرکہ یا ستو کبھی بھنے ہوئے چنے کبھی روٹی شہد کھایا کرتے۔ لباس بہت معمولی اور کم قیمت کا ہوتا تھا آپ کے جاں نثاروں میں سے ایک دولت مند شخص نے عرض کیا: "میاں صاحب آپ بہت ضعیف ہو گئے ہیں ٹاٹ پر بیٹھنے سے تکلیف ہوتی ہے ایک روئی دار گدا بنوا دیتا ہوں اس پر تشریف رکھا کیجیے۔" آپ نے ہنس کر فرمایا: "بھائی، پرانی قبر پر کیا گچ کرو گے؟" نواب سکندر جہاں بیگم والیہ ریاست بھوپال اپنے مدارالمہام منشی جمال الدین مرحوم کے ساتھ دہلی آئیں اور میاں صاحب سے ریاست کا عہدۂ قضا قبول کرنے کی درخواست کی آپ نے انکار کرتے ہوئے فرمایا:

"میں تو وہاں کا قاضی القضاۃ ہو کر امیرانہ ٹھاٹھ سے مسند لگائے حاکم بنا بیٹھا رہوں گا یہ غریب طالب علم چٹائی پر بیٹھنے والے مجھے کہاں ڈھونڈتے پھریں گے؟"

تقریباً اسی برس آپ دہلی میں رہے اور اہل و عیال کی سکونت کے لئے ایک مکان بھی تعمیر نہ کروایا کرائے کے معمولی سے مکان میں ساری زندگی بسر کر دی جس حصے میں آپ خود رہتے تھے وہاں صرف ایک سائبان تھا جو گرمیوں کے موسم میں دوپہر کے بعد ایسا گرم ہو جاتا تھا کہ دوسرا آدمی بمشکل وہاں چند لمحے ٹھہر سکتا لیکن آپ وہیں گھنٹوں بیٹھ کر فتوے یا خطوط کے جواب لکھتے جب کوئی طالب علم شدتِ گرمی کی شکایت کرتا تو آپ بطورِ مزاح فرماتے "میں جس سائبان میں رہتا ہوں اگر تم ایک گھنٹہ وہاں جا کر سو رہو تو دو روپے دیتا ہوں طلبہ کیلئے مسجد میں شطرنجی کا فرش تھا مگر آپ ہمیشہ ہر موسم میں ٹاٹ یا چٹائی پر بیٹھتے مدرسے میں طلبہ کی ملاقات یا کسی اور ضرورت سے تشریف لاتے تو فوراً اس بے تکلفی سے جوتوں کے قریب بیٹھ جاتے کہ کسی کو اصرار کا موقع بھی نہیں ملتا تھا کہ یہاں نہیں وہاں بیٹھئے غدر کے بعد قلعہ معلّٰی والوں پر وہ وہ

Marfat.com

آفتیں ٹوٹیں کہ بیان سے باہر شہزادگانِ تیموریہ اپنے عیال سمیت بھیک مانگنے کے قابل بھی نہ رہے۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی شہزادہ آتا تو آپ ان کی تکریم کے لئے کھڑے ہو جاتے اور جس قدر خدمت ممکن ہوتی کرتے کوئی شخص اگر شہزادوں کے اوضاع پر غائبانہ کچھ تعریض کرتا تو میاں سرد آہ بھر کر فرماتے "آہا، آج انکی یہ حالت ہے ورنہ ہم جیسوں کا سلام لینا بھی پسند نہ کرتے تھے۔"

آپ کی عادت تھی کہ بازار سے گھر کا سودا سلف خود خرید کر لاتے شاگردوں یا رفیقوں میں سے کوئی ضد کر کے اپنے ہاتھوں لینا چاہتا تو کبھی نہ دیتے سبق کے دوران میں اگر کسی کتاب کی ضرورت پڑتی تو خود جا کر اٹھالاتے خواہ کتنی ہی بار آنا جانا پڑے کبھی طالبعلم سے نہ کہتے کہ تو فلاں کتاب اٹھالا ایک دن کوئی شخص مخدوم آپ کے سامنے آکر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ گیا اور جاہلانہ طریقے سے کہنے لگا "میاں نجیر حسین دو کام ہیں بتا پہلے کون کام کریگا؟ اچھا پہلے خدا کا کام کر یہ بتا کہ الحمد سریھہ (شریف) امام کے پیچھے پڑھی جائے یا نہ اور پھر یدین (رفع) بھی کرنا چاہئے یا نہ؟ میاں صاحب نے تفصیل سے دونوں مسئلے اسے سمجھائے پھر وہ بولا "لے اب میرا کام کر، بھوکا ہوں گھر سے کھانا لا کر کھلا" آپ اسی وقت گھر تشریف لے گئے اور کھانا لا کر کھلایا۔

مولوی حافظ عبدالمنان نابینا تھے ان کا بیان ہے کہ ایک دفعہ میں بیت الخلاء کی جانب جا رہا تھا میں نابینا آدمی مجھے کیا خبر کہ راستے میں ایک بیل بیٹھا ہوا ہے یکایک کسی نے میرا ہاتھ پکڑا اور لے جا کر پاخانے میں بٹھا دیا اور کلوخ بھی لا کر دے دیئے جب میں حوائجِ ضروری سے فارغ ہوا تو پھر میرا ہاتھ پکڑا اور صحیح راستے پر لا کر چھوڑ دیا۔ ایک شخص نے مجھ سے پوچھا "حافظ جی! کچھ خبر ہے آج کون شخص تمہارا قائد بنا تھا؟" میں نے کہا میں کیا جانوں؟ تب اس نے بتایا کہ وہ خود حضرت میاں صاحب تھے ایک دفعہ انہی حافظ صاحب کے جوتے مسجد کے باہر پھاٹک پر پڑے ہوئے تھے میاں صاحب نے دیکھے اور خود اٹھا کر لائے اور انہیں دے دیئے۔

سر سید احمد خان آثار الصنادید میں لکھتے ہیں:

"زبدۃ اہلِ کمال اسوۂ اربابِ فضل افضالِ استعداد میں خصوصاً فقہ میں ایسی استعدادِ کامل بہم پہنچائی کہ اپنے نظائر و قرون سے گویا سبقت لے گئے ہیں۔ روایت کشی میں آج بینظیر ہیں۔ باوجود اس کمال اور اس استعداد کے مزاج میں خاکساری اور حلم گویا کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ باعتبار سن کے جواں اور باعتبار طبیعت کے حلیم اور وضع متین کے پیر"۔

ایک دن میاں صاحب حسبِ عادت کسی میّت کی تجہیز و تکفین میں چلے گئے ایک طالب علم کا سبق ناغہ ہو گیا جب تشریف لائے اور اس سے سبق لانے کو کہا تو وہ نہایت غصے میں بھرا ہوا تھا بڑی درشتی سے اس نے کتاب لانے سے انکار کیا اور بہت سخت وسُست کہا کہ کیا آپ سمجھتے ہیں دنیا میں آپ کے سوا کوئی اہلِ علم نہیں ہے ملکِ خدا تنگ نیست ' پائے مرا لنگ نیست۔ یہ سُن کر بھی آپ کی پیشانی پر بل نہ آیا بڑی منتوں سے طالب علم کو منایا اور کہا: "بھائی جانے دو معاف کر دو سبق لاؤ وہ بے چارہ تو دنیا سے گیا گزر اور تم تو ابھی دنیا

Marfat.com

میں موجود ہو تمہارے لئے بہت وقت ہے۔

1857ء کے غدر میں بھی آپ کے معمولات اور درس وتدریس کے اوقات میں کوئی فرق نہ آیا اس زمانے میں مولانا عبداللہ صاحب غزنوی قدس سرہٗ آپ سے صحیح بخاری پڑھتے تھے اور صحن مسجد کے اوپر سے توپ کے گولے دنادن گزرتے تھے یہاں تک کہ ایک گولہ حالتِ درس میں آن گرا لیکن نہ آپ ہراساں ہوئے اور نہ صحیح بخاری کو بند کیا توکل اور صبر کی یہ حالت تھی کہ مدرسے کے طلبہ کے کھانے کا اہتمام جن صاحب کے ہاتھ میں تھا انہوں نے ایک دن عرض کیا کہ آج آٹا وغیرہ کچھ نہیں ہے اور روپے بھی سب خرچ ہوگئے آپ نے جواب میں فرمایا"پھر مجھے اور تمہیں اس کا کیا فکر ہے جس کے بندے ہیں وہ جانے"مہتمم صاحب یہ ارشاد سن کر مایوسانہ انداز سے چلے ابھی مسجد سے باہر گئے ہی تھے کہ ایک آدمی آیا اور 5 روپے پیش کئے۔ میاں صاحب نے ایک طالبعلم سے کہا"مہتمم صاحب جاتے ہیں ذرا آواز دینا" وہ آواز سن کر الٹے پاؤں پھرے روپے سامنے رکھے تھے فرمایا"لو صاحب اب تو سامان ہو گیا"آپ کو اس کا فکر کبھی نہ ہوا کہ مدرسے کی عمارت جو تعمیر ہو رہی ہے اس کیلئے روپیہ کہاں سے آئیگا اور طلبہ کے کھانے کا بندوبست کل کہاں سے ہو گا جو روپیہ آپ کے ہاتھ میں آتا اور جو ضرورت اس وقت لاحق ہوتی بے دریغ اس میں خرچ کر دیتے یا کوئی محتاج آجاتا تو اسی کو دے دیتے۔

آپ کا استقلال اور مجاہدہ بھی بینظیر تھا صبح سے گیارہ بجے دن تک درسِ قرآن وحدیث میں اس طرح مصروف رہتے کہ زانو نہ بدلتے چہرے پر دھوپ آجاتی مگر پیشانی پر بل نہ آتا اپنے فرزند مولانا شریف حسین کی امامت میں کوئی نماز نصف گھنٹے سے کم میں تو ختم ہی نہ ہوتی جو بجائے خود ایک ریاضتِ شاقہ ہے دلی کی گرمی سے جو لوگ واقف ہیں وہی اس مجاہدے کا اندازہ کر سکتے ہیں پھر وہ بھی ایک دو دن نہیں پورے اسی برس آپ پیدل چلنا پسند کرتے اور مجبوری کے سوا سواری پر بیٹھنا ناپسند کرتے تمام عمر چھتری سر پر کبھی نہ لگائی دھوپ سے بچنے کیلئے ایک موٹی چادر سر پر رکھ لیتے ماہ مبارک رمضان میں نمازِ فجر سے لیکر نمازِ مغرب تک قرآن اور تفسیر جلالین پڑھاتے جیسے جیسے وقت گزرتا جوشِ بیان اور بڑھتا جاتا آواز بلند ہوتی جاتی اور زیادہ بشاش دکھائی دیتے رمضان المبارک میں دو ختم قرآن مجید کے بحالتِ قیام ہر سال سنتے ایک تو نماز عشاء کے بعد تراویح میں جس کے امام تھے حافظ احمد عالم فقیہ محدث جو آپ کے شاگرد رشید تھے وہ تین پارے روز سناتے ترتیل وتجوید کے ساتھ دوسرا قرآن سنتے نماز تہجد میں جس کے امام ہوتے آپ کے بڑے پوتے مولوی عبدالسلام اس کے بعد طالب علموں کے لئے سحری اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے مسجد اور مدرسے میں آتے ہر شخص کو جگا کر کھلاتے۔

حدیثِ رسول ﷺ پڑھانے اور بیان کرنے کے اس قدر مشتاق رہتے کہ سبحان اللہ بیماری اور نقاہت سب بھول جاتے ایک روز صحیح بخاری کے سبق میں وفاتِ نبوی ﷺ کی حدیث جو آئی تو آپ کو ایسا جوشِ گریہ ہوا کہ سبق موقوف کرنا پڑا اور یہ کیفیت دیکھ کر حاضرین وتلامذہ بھی ایسے متاثر ہوئے کہ مسجد میں کہرام برپا

Marfat.com

ہو گیا اس کے باوجود کہ آپ کو اپنے زمانے کے صوفیائے کرام میں وہی درجہ حاصل تھا جو معتبر علمائے عظام میں تھا لیکن آپ سوائے اتباعِ سنّت کے دور از کار باتوں کی طرف کبھی خیال بھی نہ کرتے تھے اور یہی طریقہ حضرات نقش بند کا ہے میاں صاحب میں اتباعِ سنت کی عادت کچھ عبادات ہی تک محدود نہ تھی بلکہ عادات میں بھی ٹھیک ٹھیک وہی طرز اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے جو نبیؐ کی تھی۔

آپ نے کل کتنے فتوے لکھے؟ اس کا اندازہ ناممکن ہے۔ اپنی وفات سے کچھ عرصہ قبل فرمانے لگے کہ میرے فتووں کی نقل اگر رکھی جاتی تو کم از کم چار فتاویٰ عالمگیری کے برابر ہوتی۔ آپکے فتویٰ نویسی کا یہ اصول تھا کہ بے غرض فتویٰ لکھتے۔ کسی سے مطلق رو رعایت نہ کرتے نہ کسی سے کوئی صلہ لیتے یا پیشکش قبول کرتے فتویٰ نویسی کے ذریعے کسبِ معاش کو نہایت معیوب خیال کرتے۔ ایسے لوگوں کی نسبت کہا کرتے تھے کہ انہیں دو روپیاں دو اور جو چاہو لکھوالو۔ اگر کوئی شخص کسی پیرائے سے اپنے موافق فتویٰ لکھوانا چاہتا تو کہہ دیتے۔ اسی لئے تو میں نے کسی کی نوکری نہیں کی۔

دیانت اور امانت کا یہ حال تھا کہ محلّے والے اور سفر پر جانیوالے اکثر لوگ اپنی قیمتی چیزیں اور روپے آپ کے پاس رکھوا جاتے اور جتنے دنوں کے بعد وہ واپس آن کر طلب کرتے آپ ویسا ہی لا کر دیتے۔ ایک مرتبہ کوئی سپاہی ایک سو اسّی روپے دو مہینے کیلئے آپ کے پاس امانت رکھ کر چلا گیا جب اس کے آنے کا زمانہ قریب آیا تو کسی نے صندوق توڑ کر سارے روپے نکال لئے۔ آپ نے جب صندوق ٹوٹا ہوا پایا تو سخت تشویش ہوئی۔ آخر آپ نے کسی نہ کسی طرح اسکے آنے سے قبل ایک سو اسّی روپوں کا بندوبست کیا اور جوں ہی وہ آیا اسے روپے دے دیئے اس واقعے کی خبر تک اسے نہ ہونے دی۔

آپ کی عادت تھی کہ جب کوئی شخص آپ کے خلاف علمی تقریر کرتا اور وہ حق پر ہوتا تو فوراً تسلیم کر لیتے اپنے منصب اور مشیخت کی ذرا پروانہ کرتے چنانچہ اپنے ایک شاگرد کے شاگرد مولوی سیّد عبدالعزیز کو ایک خط میں لکھتے ہیں تم نے ایک مرتبہ مجھ سے سنن ابو داؤد پر شدید بحث کی اور میرا کہنا نہ مانا لیکن تیسری مرتبہ مجھے تمہارا کہنا ماننا پڑا اس واسطے کہ تم برحق تھے اور تم نے بات بھی سلفِ صالح کے مطابق پیدا کی تھی۔

چھوٹے بچوں سے بے انتہا شفقت اور محبت تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ آپ پڑھانے میں مصروف ہیں اور دو چار بچے لپٹے ہوئے تقاضا کر رہے ہیں کہ میاں صاحب میری کُشتی دیکھ پیسے دو آپ تنگ آکر فرماتے: "اچھا لڑ بے لڑ" اور کشتی کے بعد ایک ایک دو دو پیسے انعام میں دیتے بچے دھوکہ دے دے کر افطاری کئی کئی بار آپ سے لیتے۔ رمضان میں جب آپ افطاری تقسیم کرنے بیٹھتے تو ننھے ننھے چھوٹے بچوں کو پہلے دیتے یہ چھٹ پٹ ہڑپ کر کے دوسری جانب سے پھر آجاتے اور تقاضا کرتے کہ ہمیں افطاری نہیں ملی آپ ہنستے اور دوبارہ ان سب کو دیتے بعض بچے یہ تماشا کرتے کہ کریما ما مقیماں بغل میں دابے آتے اور کہتے "میاں صاحب مجھے سبق پڑھا دو"۔ آپ فوراً ان کی طرف متوجہ ہو جاتے اور کہتے "اچھا پڑھ"۔ وہ کتاب کو

Marfat.com

چٹائی پر رکھ دیتا اور آپ کتاب پر جھکے ہوئے اسے ہجے کراتے اور پڑھاتے جاتے۔ آج کوئی صاحب اربابِ علم میں ایسے ہیں جو یوں کریما مامقیماں پڑھانے کو اپنے لئے باعث ہتک خیال نہ کریں؟

ایک بچہ روزانہ آکر تھوڑی دیر کیلئے پنکھا جھلتا جب آپ اسے کچھ دینے کے ارادے سے ہاتھ جیب کی طرف لے جاتے تو وہ دیکھتا رہتا اور پنکھے کی رفتار سُست ہوتی جاتی جہاں آپ نے اسے کچھ دیا وہ پنکھا پھینک کر بھاگ جاتا۔ آپ ہنس پڑتے اگلے روز پھر یہی تماشا ہوتا۔

شرفائے دہلی کے ساتھ میاں صاحب کا برتاؤ بہت عمدہ تھا مولانا شاہ رفیع الدّین قدس اللہ سرہٗ کے ایک صاحب زادہ خورجہ میں رہتے تھے ان میں علم کی دستگاہ بہت کم تھی لیکن جب بھی میاں صاحب سے ملاقات کرنے آتے تو ان کی تعظیم کیلئے میاں صاحب سروقد کھڑے ہو جاتے۔ کبھی کبھی آپ کے وطن سے عزیز واقربا آتے اور اصرار کرتے کہ حضرت دہلی میں بہت رہ چکے ہیں اب وطن چل کر قیام کیجئے تاکہ ہم لوگ بھی اس سعادت سے بہرہ اندوز ہوں مگر آپ نے شاہ ولی اللہ شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحٰق قدس سرہم کی مسندِ خلافت چھوڑ کر جانا منظور نہ کیا اور بالآخر جن کے حقیقی جانشین تھے انہی کی سرزمین میں مرنے اور گڑنے کو ترجیح دی لیکن پھر بھی وطن کی محبت کبھی کبھی آپ کو تڑپا دیتی تھی! اکثر اپنے لڑکپن کے قصے کہتے اور وطن کی ایک ایک چیز کا ذکر کرتے۔ اپنے اساتذہ کا وہ ادب کرتے کہ بیان سے باہر ہے۔ مسائل کے بیان میں بھی حضرت شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحٰق کے اقوال سے سند لاتے اور فرماتے ہمارے حضرات یوں فرماتے ہیں! اس پر کوئی آزاد طبع طالب علم کہہ دیتا کہ حضرات کا کہنا سند نہیں ہو سکتا جب تک قرآن وحدیث سے سند نہ دی جائے۔ بہت خفا ہو کر فرماتے مردود کیا یہ حضرات گھَس کھُدے تھے؟ ایسی ہی اڑان گھائی اڑاتے تھے؟۔

شاعری کا مذاق اعلیٰ درجے کا تھا ہزاروں شعرار دو فارسی اور عربی کے ضرب المثل کے طور پر یاد تھے جنہیں اکثر پڑھتے اور ان کے عجیب عجیب نکات بیان کرتے نکتہ سنجی دقیقہ رسی اور شعر فہمی میں اپنی مثال آپ تھے حافظہ بھی بینظیر پایا تھا مولوی امین اللہ نے رسول اللہؐ کی شانِ مبارک میں ایک قصیدہ فارسی زبان میں لکھا تھا جس کے اٹھارہ سو اشعار تھے میاں صاحب کو یہ قصیدہ بہت محبوب تھا اور ایک دو مرتبہ پڑھنے ہی میں پورا قصیدہ ازبر ہو گیا میر اور سودا کی اکثر تعریف کرتے ان دونوں کے ہزاروں اشعار یاد تھے اور فارسی میں تو بلا مبالغہ فردوسی و خاقانی سے لیکر صائب میرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی تک شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو گا جس کا معتدبہ کلام ان کے حافظے میں محفوظ نہ ہو۔ خدا نے میاں صاحب کو طباع پیدا کیا تھا اور مجتہدانہ قابلیت ان کے دماغ میں ودیعت کی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زمانے اور معاشرے نے انہیں علم وفضل کے جوہر دکھانے کا جس قدر موقع دیا اس کا اتفاق بھی بہت کم حضرات کو ہوا ہے لگ بھگ سولہ برس کی عمر، عنفوان شباب میں صوبہ بہار سے تین سو کوس دہلی کا پاپیادہ سفر کوئی معمولی بات نہ تھی اور سفر بھی وہ جو چھ برس میں ختم ہوا ایسے اسباب تھے جنہوں نے میاں صاحب کو سادگی پسند زندہ دل خوش طبع فراخ حوصلہ ادا

Marfat.com

شناس شعر فہم مجتہد امام فقیہ محدث مفسر اور درویش بنادیا تھا اور سب سے زیادہ فخر انہیں اپنی درویشی پر تھا جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔

انتقال کے دس بارہ برس پہلے سے دردِ زانو اکثر ستایا کرتا تھا اس سبب سے ہاتھ میں چھڑی رکھنے لگے تھے اور جب چلنے پھرنے سے معذور ہوئے تو ڈولی میں بیٹھ کر مسجد تشریف لاتے وفات سے نو دس ماہ علالت نے زور پکڑا اور بالکل ہی ذی فراش ہو گئے ایک دن مسجد میں ضعف ونقاہت کا عالم طاری ہوا وہاں سے لوگوں نے اٹھا کر بیٹی کے مکان پر پہنچایا جو میر شاہ جہان صاحب سے بیاہی ہوئی تھی آخر ایامِ حیات میں اکثر ہوش نہ رہتا دو روز کبھی تین روز مسلسل یہی حالت رہتی لیکن جونہی ہوش آتا بڑے تعلقے سے وعظ بیان فرمانا شروع کر دیتے اور اکثر سورۂ جن کا وعظ کہتے۔ مسجد میں لے جائے جانے کی بہت تمنا کرتے اور بار بار کہتے "مجھے مسجد میں لے چلو" کہتے کہتے جب تھک جاتے تو فرماتے "ہزاروں جن آ گئے ہیں اور وعظ کیلئے کہہ رہے ہیں۔ کہاں تک کہوں؟ صبح کو فرماتے "بس جاؤ اب وقت نہیں ہے" دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا کہ فی الواقع کوئی سامنے ہے اور اس سے باتیں کر رہے ہیں حالت افاقہ میں جب پوچھا جاتا کہ آپ کس سے باتیں کر رہے تھے تو جواب دیتے! "ہزاروں جن آئے ہوئے تھے سارا مکان ان سے بھرا ہوا تھا"

صرف میرے پلنگ پر اتنی جگہ خالی تھی جہاں میں پڑا ہوا ہوں۔ تسبیح ہاتھ سے دم واپسیں تک نہ چھوٹی۔ جب ضعف بہت بڑھ گیا اور تسبیح ہاتھ سے گر جاتی تو نہایت بے چینی سے اسے تلاش کرتے اگر نہ ملتی تو سخت پریشان ہوتے اگر تسبیح کے ملنے میں دیر ہو جاتی تو انگلیوں پر گنتے غرض زبان پر ہر وقت تحمید جاری رہی تعجب ہے کہ ایسی طویل علالت میں ایک بار بھی کسی سے نہ کوئی فرمائش کی اور نہ یہ کہا کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے۔

مولوی لطف حسین نے ایک دن عرض کیا کہ حضور کو کہاں دفن کریں؟ حضرت شاہ عبدالعزیز کے قبرستان میں بھی جگہ کا بندوبست ہو چکا ہے فرمایا "میرے انتقال کے بعد صرف اتنا کرنا کہ اپنے ہاتھ سے سنتِ نبویؐ کے مطابق مجھے غسل دیکر اور تکفین کر کے میری لاش یہیں گھر میں چھوڑ کر چلے جانا اس کے بعد جس کے دل میں جو آئے کرے" آخر دس رجب بروز دوشنبہ 1320ھ مطابق 13 اکتوبر 1902ء کو مغرب کی نماز کے وقت اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگلے روز صبح آٹھ بجے جنازہ اٹھایا گیا بارہ تیرہ ہزار آدمی جنازے کے ساتھ تھے نمازِ جنازہ آپ کے سعادت مند پوتے مولوی سید عبدالسلام نے عید گاہ کے چبوترے پر پڑھائی جنازے پر خلقت کا ایسا ہجوم تھا کہ بہت سے لوگوں کو کندھا دینا بھی نصیب نہ ہوا دلی اور بیرونِ دلی کے بے شمار عمائد جنازے کیساتھ تھے۔ سیدی پورہ کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی آغا سنجر طہرانی نے تاریخ کہی ۔

مردِ والا گہر نذیر حسین عالِم ما محدثِ کامل

حروفِ غیر منقوط سے سنِ وفات 1320 ہجری بر آمد ہوتا ہے۔

Marfat.com

سید وارث علی شاہؒ

چنگیز خان کے پوتے ہلاکو خان نے 656 ہجری میں بغداد کو تاخت و تاراج کیا۔ ہزار ہا بندگانِ خدا کو تہ تیغ کیا۔ جدھر نگاہ جاتی تھی، لاشوں کے انبار دکھائی دیتے تھے۔ یہ کیفیت تھی کہ بغداد کے گلی کوچوں میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ شائد اسی لئے کسی صاحب دل نے سقوطِ بغداد کی تاریخ لفظ "خون" سے برآمد کی اور اسے بلاشبہ الہامی تاریخ کہا جاسکتا ہے۔ ہلاکو خان کے بارے میں مشہور ہے کہ اسے بنی فاطمہ سے قلبی عناد تھا، اور اس نے چُن چُن کر سب سے پہلے بنی فاطمہ ہی کو قتل کیا۔ خلیفہ مختشم باللہ کی حکومت کا خاتمہ کرنے اور بغداد میں خون کی ہولی کھیلنے کے بعد ہلاکو خان نے بلاد واحصار کو برباد کرنے کا ارادہ کیا، چنانچہ بنی فاطمہ کے بچے کھچے افراد اور خاندان جان کی سلامتی کے لئے دوسرے علاقوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ انہی میں حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی نسل سے سید اشرف ابی طالب بھی تھے جن کا شمار نیشاپور کے ذی شرف اور صاحبِ اختصاص سادات میں ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے اہل وعیال سمیت ہندوستان کا رخ کیا۔ مولانا سید محی الدّین رسول پوری جو اسی خاندان کے ایک مقدس عالم اور حضرت مخدوم سید علاؤالدین اعلیٰ بزرگ علیہ الرحمتہ کی چوتھی پشت میں ہیں، اپنی تالیف "سیر السادات" مکتوبہ 1021ھ میں تحریر فرماتے ہیں کہ "سید اشرف ابی طالب، جو اپنے ہمعصر علماء میں ذی احترام اور مشائخین وقت کے سردار اور امام تھے، مع اہل وعیال عازم ہندوستان ہوئے۔ نیشاپور سے سیدھے قصبہ کنتور ضلع بارہ بنکی میں آئے اور آبادی کے باہر قیام فرمایا۔" بعد میں وہیں مکان تعمیر کرایا۔ یہ مکان

Marfat.com

اب رسول پور کے نام سے مشہور ہےاور اس کا صدر دروازہ ابھی تک موجود ہے۔ لوگ اسے علاؤالدین اعلیٰ بزرگ کا پھاٹک کہتے ہیں کہ آپ سید اشرف ابی طالب کے پوتے ہیں اور آپ کا شمار حضرت شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی علیہ الرحمتہ کے خلفائے اجل میں ہوتا ہے۔

حضرت سید اشرف ابی طالب صحیح النسب سادات کاظمی تھے اور صاحب ''مراۃ الاسرار'' بیان کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی سیادت خاندانی کی بکمال احتیاط ہمیشہ محفوظ رکھا۔ آپ کی آٹھویں پشت میں سید عبدالاحد علیہ الرحمتہ 1127ھ میں قیام کا ارادہ فرما کر قصبہ کنتور سے اودھ کے مردم خیز قصبے میں آئے قصبے کے لوگوں کو آپ کی تشریف آوری سے بے حد مسرت ہوئی کیونکہ سید عبدالاحد کے فیوض وبرکات وکناف میں بڑا شہرہ تھا۔ چونکہ آپ عالم علوم شریعت بھی تھے اور واقفِ رموز حقیقت بھی، اس لئے آپ کی ذات مجموعہ صفات سے درس وتدریس کے ساتھ رشد وہدایت کا فیض بھی جاری ہوا۔

1141ھ میں میران سید احمد دیویٰ میں پیدا ہوئے اور ان کے صاحبزادے سید کرم اللہ تھے کرم اللہ کے تین فرزند تھے۔ سید سلامت علی، سید بشارت علی اور سید شیر علی۔ سید سلامت علی کے دو بیٹے تھے ایک کا نام سید خرم علی تھا جن کی اولاد بریلی میں ہے اور دوسرے سید قربان علی شاہ۔ موخر الذکر فرزند عقد نکاح اپنے حقیقی چچا سید شیر علی کی صاحبزادی سیدہ بی بی سکینہ عرف چاندن بی بی سے ہوا۔ نواحِ اودھ میں قصبہ دیویٰ ہمیشہ سے ہر حیثیت سے ممدوح اور ممتاز رہا اور اسے تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے۔ بے شمار علمائے دین اس سرزمین پر پیدا ہوئے۔ بزرگوں کے فیض وبرکت اور رشد وہدایت کی وجہ سے یہ مقام ہمیشہ طریقت کا سرچشمہ رہا۔ چنانچہ اکثر اہلِ قصبہ کا بیان ہے کہ ہر زمانے میں یہاں ایک ولی ضرور رہا لیکن قسامِ ازل نے یہ سعادتِ ابدی اس قصبے کو اور تفویض فرمائی کہ خدا کے ایک عاشقِ صادق نے پہلا قدم اس سرزمین پر رکھا اور اس عاشقِ صادق کے مدارج عالیہ اور مراتب جلیلہ کے باعث دنیا کے بڑے حصے میں اس مقدس قصبے کی شرافت زبان زد خلائق ہو گئی۔ 1238ھ میں سید قربان علی شاہ کے ہاں ایک فرزند ارجمند کی ولادت ہوئی۔ نام وارث علی رکھا گیا، مگر گھر میں پیار سے لوگ مٹھن میاں کہتے تھے۔ ابھی دو سال کی عمر تھی کہ عشق کرشمہ ساز کی نیرنگیوں کا آغاز ہوا۔ اسبابِ ابتلا اور سامانِ امتحان مہیا ہونے لگے۔ مٹھن میاں کے شفیق والد کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا اور اس دُرِّ یتیم کی نشو ونما صدفِ آغوشِ مادری میں ہونے لگی، لیکن غیوّر شاہد حقیقی کو یہ بھی منظور نہ ہوا چنانچہ تین سال کی عمر تھی کہ یہ یتیم بچہ آغوشِ مادر مہربان سے بھی کنارہ کش ہوا اور احکم الحاکمین نے اس خاتون معظمہ کو دوسرے عالم میں بلا لیا۔ اس حادثۂ جانکاہ کے بعد مٹھن میاں کی جدہ مکرمہ سیدہ حیات النساء صاحبہ اپنے یتیم پوتے کی ایسی کفیل ہوئیں کہ مہربان دایہ کی خدمت کے باوجود ہر وقت بہ نفس نفیس خدمت ونگرانی کرتی تھیں۔ بلکہ مٹھن میاں کے دیگر عزیز بھی گرویدہ ہو گئے تھے اور اس کا یقین ہو چکا تھا کہ یہ بچہ ضرور برگزیدۂ خدا اور صاحبِ مقامات عُلیا ہے، کیونکہ عام بچوں کے حالات سے اس بچے کے عادات بالکل جداگانہ اور بہت ممتاز تھے قصبے کے معزز آدمیوں کا بیان ہے کہ

Marfat.com

ہماری بزرگ خواتین جب مٹھن میاں کے عہد طفلی کا ذکر کرتیں' تو تعجب سے کہتی تھیں کہ ایسے خصائل کا بچہ دیکھنا کیسا' سنا بھی نہیں' چنانچہ مسندِ حضرات کا بیان ہے کہ دودھ پینے میں یہ امتیازی شان تھی کہ وقتِ معینہ کے سوا دیگر اوقات میں دودھ نہیں پیتے تھے اور وقت مقررہ پر بھی پیتے' تو عام بچوں کی طرح جلد جلد اور گھبرا کے نہیں' بلکہ اطمینان کے ساتھ اور مقدار میں کم جس سے مٹھن میاں کے صبر و سکون کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔

اسی طرح بول و براز کی یہ کیفیت تھی کہ ضرورت کے وقت ایسی جگر گداز آواز سے اشارہ کرتے کہ دایہ خبردار ہو جاتی تھی' چنانچہ مٹھن میاں کا بستر اور لباس وغیرہ ہمیشہ صاف اور نجاست آلود ہونے سے محفوظ رہتا تھا اور رفع حاجت کے وقت چہرے پر حجاب آمیز کیفیت طاری ہوتی تھی اور گردن خود بخود جھک جاتی تھی۔ یہی غیر معمولی صورت سونے کے وقت دیکھی گئی کہ اول تو سوتے بہت کم تھے اور جو کچھ سوتے وہ بھی غفلت کی نیند نہیں بلکہ بیدار خوابی کی صورت میں کچھ عرصے آنکھیں بند رہتیں اور جب جاگتے' تو چہرے سے نیند کا خمار معلوم ہوتا تھا نہ آنکھوں پر غنودگی کا اثر اور ہمیشہ ہنستے ہوئے بیدار ہوتے۔ بچوں کی طرح وقت بے وقت روتے بھی کبھی نہ دیکھا گیا بلکہ زیادہ تر خاموش رہتے اور اکثر خاموشی کے وقت چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔ آنکھوں سے انتظاری کیفیت نمایاں ہوتی تھی۔ جب تک یہ حالت رہتی دیکھنے والوں کو اس کی جرات نہیں ہوتی تھی کہ اپنی جانب مخاطب کریں' بلکہ خود متحیر اور ششدرہ ہو جاتے تھے۔

غرض یہ عجیب و غریب حالات اور عادات دیکھ کر مٹھن میاں کے معمّر اعزا آپ کی تعظیم کرنے لگے اور جس قدر آپ کی عمر زیادہ ہوتی گئی اسی قدر آپ کے عادات کی غیر معمولی شان بڑھتی گئی' یہاں تک کہ مزاج میں آزادی اور بے پروائی کے آثار پیدا ہونے لگے جب عمر پانچ برس ہوئی تو دادی صاحبہ نے نہایت اولوالعزمی سے بسم اللہ کی تقریب کی اور خاندانی رواج کے مطابق ایک قابل معلّم آپ کی تعلیم کے لئے مقرر کئے۔ یہ معلّم وقتاً فوقتاً قاعدہ بغدادی پڑھاتے اور زیادہ وقت آپ کے ساتھ کھیلنے میں صرف کرتے۔ کھیل بھی مٹھن میاں کے ایسے تھے جن میں حقانیت کی صفت اور للہیت کی شان تھی اور جن سے پنج تنی جود و سخا اور مہر و عطاء کا اظہار ہوتا تھا۔ کھیل کی صورت میں آپ کا مشغلہ یہ تھا کہ لوئی نام کا ایک حلوائی تھا۔ اس سے آپ روزانہ مٹھائی خرید کر اپنے ہم عمر بچوں میں تقسیم کرتے۔ بعد میں جب کبھی برسبیلِ تذکرہ آپ کے عہدِ طفولیت کا ذکر آتا' تو اکثر مسکرا کر کہتے ہم اپنے: بچپن میں دادی کے صندوقچے میں سے اشرفی یا روپیہ جو مل جاتا' نکال لاتے اور لوئی کو دے کر فرمائش کرتے کہ اس کا ایک بتاشا ہم کو بنا دو' وہ بتاشا سینی کے برابر ہم کو بنا کر دیتا تھا ہم اسے توڑ توڑ کر لڑکوں میں تقسیم کرتے تھے۔ دادی کو جب یہ خبر ہوتی تھی' تو وہ بجائے خفا ہونے کے خوش ہوتی تھیں۔ مٹھن میاں کا ایک مخصوص شغل یہ بھی تھا کہ محلّے کے غریبوں کو اپنے اوڑھنے اور پہننے کے کپڑے دے کر بے حد خوش ہوتے تھے۔ الغرض جب عمر اس قابل ہوئی کہ باقاعدہ تعلیم ہو' تو آپ کی دادی نے جو حضرت امیر علی شاہ صاحب سجادہ نشین شاہ ولایت محمد

Marfat.com

عبدالمنعم قادری کنزالمعرفت کی خوش عقیدہ مرید تھیں' یہ تجویز کیا کہ میں اپنے پوتے کو قرآن شریف اپنے پیرومرشد سے پڑھواؤں گی تاکہ موجب برکت ہو' چنانچہ جب آپ کی دادی نے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا تو چچا نے ان کی یہ خواہش اس وجہ سے بخوشی منظور کی کہ انہیں بھی اپنے یتیم بھتیجے سے محبت تھی اور اکثر کہا کرتے تھے کہ یہ صاحبزادے خلقِ خدا کے بہت بڑے رہنما ہوں گے اور تمام عالم میں ان کا ڈنکا بجے گا الحاصل مٹھن میاں نے قرآن مجید پڑھنا شروع کیا روزانہ اس انوکھی شان سے آتے کہ بڑی تقطیع کا قلمی اور ضخیم کلام مجید چند جزدانوں میں گردانا ہوا سر پر رکھے اور دونوں ہاتھوں سے اسے پکڑے ہوئے قریب آن کر متبسم لبوں سے چچا کو سلام کرتے۔ یہ ادا دیکھ کر وہ فرماتے: ''مٹھن میاں' اتنا بڑا قرآن شریف کیوں لاتے ہو؟'' لیکن آپ وہی قرآن اور اسی صورت سے لاتے' سبق پڑھ کر اسی شان سے مکان واپس جاتے تھے اور مکان پر مطالعہ نہیں کرتے تھے' بلکہ دستور یہ تھا کہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر کسی گہرے خیال میں محو اور مستغرق رہتے' تاہم اپنی خداداد ذہانت سے دو سال کے اندر آپ حافظ قرآن ہو گئے اور بعض ابتدائی کتابیں بھی نکل گئیں۔

آپ کی دادی مکرمہ کا خیال تھا کہ میرے یتیم پوتے کی تعلیم مکمل اور وسیع پیمانے پر ہو اس لحاظ سے انہوں نے اپنے پوتے کو ہمیشہ قابل معلموں کے سپرد فرمایا۔ صاحب ''مشکوۃ حقانیہ'' کا بیان ہے کہ مولوی امام علی ساکن قصبہ سترکہ ضلع بارہ بنکی نے بھی مٹھن میاں کو ابتدائی کتب درسیہ کی تعلیم دی ہے۔ خود بعد میں قبلہ حضرت حاجی وارث علی شاہ فرماتے تھے: مولانا امام علی صاحب نے ہم کو نہایت شفقت سے پڑھایا۔ جس وقت ہمارا دل گھبراتا تھا تو کہتے تھے جاؤ کھیلو۔ انہوں نے ہم کو یار بنالیا تھا کبھی ہمارے واسطے پتنگ بناتے تھے کبھی شاہانِ سلف کے واقعات بطورِ قصہ اس لئے بیان کرتے تھے کہ ہمارا دل بہلے۔ مولوی صاحب خود بزرگ شخص تھے مگر ہماری تعظیم کرتے تھے اور جب ہم کہتے کہ حضرت آپ تو ہمارے استاد ہیں' یہ تعظیم کیسی؟ فرماتے: صاحبزادے' میں تو ظاہری علم کا معلم ہوں اور تم خلق اللہ کو باطنی علم کا سبق دو گے۔

روایت ہے کہ مولوی امام علی صاحب نے اکثر آپ کی دادی سے کہا کہ یہ صاحبزادے مکتبِ عشق کے سند یافتہ ہیں۔ معلمِ وہبی نے وہ علم تفویض فرمایا ہے جو بغیر پڑھے اور پڑھائے آتا ہے۔ ان کو ظاہری تعلیم کی حاجت نہیں۔ یہ دوسروں کو وہ سبق پڑھائیں گے جس کے سمجھنے میں انسان کا فہم اور ادراک قاصر ہے۔

تعلیم کے دوران میں جو لوازماتِ عشق باقی تھے' ان کا بھی اظہار ہوا کہ ابھی مٹھن میاں کی عمر سات آٹھ برس کی تھی دادی صاحبہ نے اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کا سفر کیا۔ اب بجز ذاتِ خالقِ کائنات بظاہر کوئی شفیق نگران حال نہ رہا' اس لئے قصبہ دیویٰ کا قیام مناسب نہ سمجھا اور آپ کے حقیقی بہنوئی حضرت حاجی سید خادم علی شاہ صاحب آپ کو لکھنؤ لے گئے اور تعلیم کا سلسلہ بدستور قائم رکھا۔ دیگر استادوں کے علاوہ آپ نے بعض کتابیں حضرت بلند شاہ صاحب سے بھی پڑھیں اور خود حاجی سید خادم علی شاہ نے بھی آپ کو نہایت دلجوئی سے پڑھایا۔ حاجی صاحب کو شرف تلمذ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ

Marfat.com

سے تھا۔

بہر حال کسی مستند روایت سے معلوم نہیں ہوا کہ اس ہفت سالہ تعلیم کا آخری نتیجہ کیا ہوا اور بظاہر کہاں تک آپ نے پڑھا؟ بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ آپ نے تعلیم مکمل کی اور بعض کا قول ہے کہ کتبِ درسیہ اختتام کے قریب تھیں کہ جوشِ عشق نے بے قرار کیا اور اکثر اوقات استغراقی حالت طاری رہنے لگی' چنانچہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے آپ نے ملکِ عرب کی سیاحت کا قصد کیا اور 1253ھ میں زیارت حرمین شریفین کے شوق میں پاپیادہ سفر پر روانہ ہوئے تاہم آپ کے بعض حالات اور اکثر ارشادات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو علم ادب میں عبور اور تفسیر و حدیث میں بڑی دستگاہ تھی' بلکہ علومِ شریعت کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کے بھی ماہر تھے۔ ایک مرتبہ آپ بانکی پور میں جسٹس مولوی سید شرف الدین وارثی کے مہمان تھے کہ ایک صاحب جو ادبِ عربی اور معقولات میں کامل تھے عربی میں ایک مطول قصیدہ کہہ کر لائے ابھی انہوں نے دو یا تین شعر ہی پڑھے تھے کہ آپ نے قصیدہ ان کے ہاتھ سے لے کر بے تکلف پڑھنا شروع کیا اور ان دقیق الفاظ اور نکات کی تعریف فرمائی جو شاعر نے نظم کئے تھے۔ پھر ارشاد ہوا: تم نے بڑی قابلیت صرف کی' ورنہ یہ محاورے اہلِ زبان ہی ادا کر سکتے ہیں۔ کبھی برسبیلِ تذکرہ کسی آیہ کریمہ کا ذکر آیا' تو آپ نے بامحاورہ الفاظ میں اس کا ترجمہ کیا اور شانِ نزول کے ساتھ تفسیر کی' دیگر مفسّرین کے اقوال سے استنباط فرمایا' بلکہ وہ رموز و نکات بیان کئے جن کا علم سامعین کو پہلے نہ تھا۔ اس طرح کے بے شمار واقعات شاہد ہیں کہ آپ کو علمِ قرات و تفسیر میں مہارت تھی اور مفسّرین کے اقوال ازبر تھے اور یہ آپ کی فطری ذہانت اور قوتِ حافظہ کی بیّن دلیل بھی ہے کہ بارہ چودہ برس کی عمر میں جو پڑھا تھا اور پھر کبھی درس و تدریس کا اتفاق نہیں ہوا' اسی سال کی عمر میں اسے بیان کر دیا۔ اگر کسی حدیث کا ذکر آ گیا تو بغیر غور و تامل اسماء الرجال کے حوالے سے حدیث کی صحت یا عدم صحت میں آپ نے برجستہ گفتگو کی اور دوسری حدیث سے استدلال فرما کر اس مسئلے میں ایک ایسا مختتم فیصلہ کیا جس سے سامعین مطمئن ہو گئے ایسا بھی ہوا کہ کسی اخلاقی مسئلے کو آپ سے دریافت کیا گیا' بکمال شرح و بسط آئمہ مجتہدین کے اقوال کا حوالہ دے کر فرمایا: اس مسئلے میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ مذہب ہے اور امام شافعیؒ کی رائے یہ ہے اور حضرت صوفیہ یوں فرماتے ہیں وغیرہ وغیرہ یہ بھی دیکھا گیا کہ آپ اہلِ عرب سے سلیس عربی میں اور اہلِ ایران سے بے تکلف فارسی میں باتیں کرتے تھے۔ غرض آپ کے فاضلانہ ارشادات سے تبحّر علمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ علوم ظاہری میں ضرور فارغ التحصیل اور صاحبِ تحقیق تھے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ چھ سات برس مسلسل آپ کے اعزہ نے علومِ ظاہری کی تعلیم کا پورا اہتمام کیا لیکن دوسری طرف یہ بھی ہے کہ آپ نے جس قدر تعلیم میں ترقی فرمائی' اسی قدر جوشِ عشق بڑھتا گیا' حتیٰ کہ بروجدانی حالت اور استغراقی کیفیت رہنے لگی۔ طبیعت تنہائی پسند ہو گئی۔ غیر آباد مقامات میں تمام شب ذکر و اشغال میں مصروف رہنے لگے۔ حضرت حاجی خادم علی شاہ صاحبؒ نے جب آپ کو فقر کی

Marfat.com

جانب زیادہ مائل دیکھا تو حسب سنت مشائخین عظام آپ کو سلسلہ قادریہ اور چشتیہ میں داخل فرمایا۔ آپ کا سینۂ بے کینہ جو ازل سے حقائق و معارف کا گنجینہ تھا۔ پیرانِ طریقت کے فیضان سے اور زیادہ مصفا و مجلا ہو گیا۔ اسی دوران میں حضرت سید خادم علی شاہ صاحبؒ نے 14 صفر 1252ھ کو انتقال فرمایا۔ تیسرے روز رسم فاتحہ خوانی ہوئی۔ رؤسائے شہر مریدین اور معتقدین کے علاوہ علمائے دین اور حضرت مشائخین کا مجمع ہوا اور فاتحہ خوانی کے بعد دستار بندی کا مسئلہ پیش ہوا۔ سب نے بیک زبان نوجوان و نوعمر سید وارث علی عرف مٹھن میاں کو اس منصب کے لئے تجویز فرمایا اور مشائخین نے اپنے مبارک ہاتھوں سے دستار آپ کے سر پر باندھی۔ اس کے ساتھ دو کرتے بھی آپ کو پہنائے گئے۔ ایک قادریہ دوسرا چشتیہ۔ دستار بندی کے بعد قلیل عرصے ہی میں سینکڑوں ارادت مند داخلِ سلسلہ ہوئے اور بعض خوش نصیب آپ کے تصرف سے صاحب دید و یافت ہو گئے۔ آخر ربیع الاول تک رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رہا۔ شروع ربیع الثانی میں آپ لکھنؤ سے قصبہ دیویٰ چلے گئے اور بزرگوں کا متروکہ اثاثہ غریب محلے والوں اور مساکین میں تقسیم فرمایا، پھر جملہ جائیداد، زمینداری اور کتابوں کا بیش قیمت ذخیرہ اعزا اور احباب کو عنایت ہوا اور ملکیت کے کاغذات تالاب میں ڈبو کر جب بجز ذاتِ احدیت جل جلالہٗ دنیا کی کسی چیز سے آپ کو سروکار نہ رہا، تو 11 ربیع الثانی 1253ھ مطابق 1838ء کو عازم سفر حرمین شریفین ہوئے۔ مریدوں اور معتقدوں نے بے حد اصرار کیا کہ ایسے دور دراز سفر کے لئے زادِ راہ کے علاوہ ایک رفیق کا ہمرکاب ہونا بہت ضروری ہے، مگر آپ نے انتظامِ عالمِ اسباب کو قطعی ناپسند کیا اور کفیٰ باللہ وکیلا پڑھ کر پاپیادہ روانہ ہوئے۔ یہ روایت بھی ہے کہ آپ نے اپنے مرشد حضرت حاجی سید خادم علی شاہؒ کو خواب میں دیکھا کہ مکہ معظمہ کے سفر کا اشارہ کرتے ہیں۔ یہ خواب دیکھتے ہی آپکے شوقِ باطنی کو اشتعال ہوا تعلقاتِ دنیا سے دست کش ہوئے اور حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔

منقول ہے کہ جب آپ اپنی ہمشیرہ معظمہ سے وداع ہو کر مکان سے باہر آئے، تو سفر کے اسباب میں سے صرف ایک کمبل آپ کے دوش پر تھا پہلے حضرت سید خادم علی شاہؒ کے مزار پر حاضری دی، بعد میں مریدوں اور معتقدوں سے مل کر کانپور کی طرف روانہ ہوئے اور پہلا قیام اناؤ کے قریب ایک موضع میں ہوا۔ اہلِ بستی کو خبر ہوئی اور بعض حلقہ بگوش ہوئے۔ اگلے روز آگے چلے قرینہ ہے کہ آپ نے قنوج اور فرخ آباد میں بھی قیام فرمایا کہ اس دیار کے تاریخی مقامات کا اکثر ذکر کرتے تھے اور یہ تو خود فرمایا کہ "ہم مین پوری کے راستے سے شکوہ آباد گئے تھے اور چاند تمباکو فروش کے مکان میں رہے تھے" شیخ چاند تمباکو کے مشہور تاجر تھے۔

ان کا بیان ہے: "میں اپنے چچا کے ساتھ جمعے کی نماز پڑھ کر آ رہا تھا۔ دیکھا کہ تالاب کے کنارے ایک نوجوان فرشتہ صورت درویش تنہا بیٹھے ہیں۔ چچا ان کے قریب گئے تو درویش نے عجیب دلفریب لہجے میں فرمایا: "آ گئے؟" چچا قدم بوس ہوئے، تو درویش نے کہا: "تم تو ازلی مرید ہو۔" میں نے عرض

کیا: "حضور میں؟" فرمایا: "اچھا آؤ، تم بھی مرید ہو جاؤ۔" میں مرید ہوا، تو ارشاد ہوا: "خدا کا طالب جھوٹ نہیں بولتا۔ جاؤ ہمیشہ ایمانداری سے کام کرنا۔" پھر ہم دونوں کے اصرار سے آپ مکان پر تشریف لائے، اسی روز ہمارا کل خاندان سلسلے میں داخل ہو گیا" شہر سے جو شخص بھی آتا، خدا معلوم کیا دیکھ کر بیعت کی استدعا کرتا تھا لیکن بعض آدمیوں سے آپ یہ فرماتے: "تم جس کے مرید ہو، اسی کو دیکھو" اور جسے مرید کہتے ہو اس کو کوئی نصیحت ضرور فرماتے تھے۔ کسی کو حکم دیا: ماں باپ کی خدمت سے غافل نہ ہونا۔ کسی سے فرمایا: رشوت نہ لینا۔ کسی سے ارشاد ہوا: خدا کے حکم کی تعمیل، محبتِ خدا کی دلیل ہے۔ ایک مقتدر رئیس سے کہا: خلق اللہ کی خدمت ایمان کی نشانی ہے۔ ان پر آپ کے اس ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ ا روز سے خیرات کرنے لگے، یہاں تک کہ اپنی کل جائیداد غریبوں اور مسکینوں کی امداد میں صرف کر ی اور بعد فراغ حج بیت اللہ، مدینہ منورہ میں قیام کیا اور وہیں وفات پائی۔

یک عالمِ دین خدمت میں حاضر ہوئے اور بکمال عجز و انکسار عرض کیا کہ میں دنیا اور تعلقاتِ دنیا سے دستبردار ہوتا ہوں، میری رہنمائی فرمایئے آپ نے انہیں مرید کیا اور جلال شاہ خطاب مرحمت فرما کر حکم دیا: بستی کے باہر رہا کرو، کسی سے سوال نہ کرنا اور خدا کی محبت میں مٹ جانا۔ ایک اور شخص کو حکم ہوا: جو اپنے معاملات خدا کے سپرد کرتا ہے خدا اس کی پوری مدد کرتا ہے۔ شکوہ آباد کے غلّے کے ایک تاجر شرفِ بیعت سے مشرف ہوئے۔ آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: خان صاحب، دنیا کی محبت انسان کو حیوان سے بدتر بنا دیتی ہے اور خدا کی محبت سے انسان فرشتہ صفت ہو جاتا ہے۔ دوسرے روز خاں صاحب نے حاضرِ خدمت ہو کر عرض کیا: رات کو میں نے خواب دیکھا کہ مر رہا ہوں اور ایک بوڑھی عورت میرے پاس کھڑی ہے جس کا لباس کثیف اور متعفن ہے۔ کوئی مجھ سے کہتا ہے: یہ تمہاری دنیا ہے۔ صبح اٹھتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ جملہ کاروبار لڑکے کے سپرد کیا اور میں قطعاً علیحدہ ہو گیا۔ اب جو حکم ہو اس کی تعمیل کروں۔ ارشاد ہوا: "تم بغداد چلے جاؤ۔ مدائن میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے مزار پر جھاڑو دیا کرو اور بے طلب جو پہنچے کھایا کرو، اسی دن خان صاحب روانہ ہو گئے۔

آپ فیروز آباد پہنچے، تو شہرت پہلے سے پہنچ چکی تھی۔ سینکڑوں آدمی بستی سے باہر استقبال کے لئے آئے، مغرب کا وقت تھا۔ دیکھا کہ قدرتِ الٰہی کی مجسم تصویر چلی آتی ہے۔ آپ نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: "تصدیق ہونا چاہئے کہ جس طرح خدا سب کا خالق ہے اسی طرح سب کا رازق بھی ہے۔ جیسا کہ بغیر کسی کے مشورے کے ہم کو پیدا کیا ہے، اسی طرح بغیر کسی کی سفارش کے جملہ مخلوق کو روزی پہنچاتا ہے، اس لئے ہم کو لازم ہے اسی پر بھروسا کریں اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں۔"

فیروز آباد سے چند دن بعد آگرے، فتح پور سیکری اور ریاست داول تشریف لے گئے، وہاں سے جے پور۔ جے پور کے ہندو مسلمانوں نے غیر معمولی طور پر ارادت کا اظہار کیا، حتیٰ کہ راجہ خود قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کچھ نصیحت کیجئے۔ فرمایا "عدل اور انصاف کیا کرو، پتھر کو نہ پوجو اور جھکنے کا

Marfat.com

گوشت نہ کھانا بیشمار لوگ اس سلسلے میں داخل ہوئے۔ ایک دن ان کی اس درخواست پر کہ ایسی ہدایت فرمائی جائے کہ ہمارے قلوب میں محبت الٰہی کی صلاحیت پیدا ہو' فرمایا مخلوقِ خدا سے ہمدردی اور اچھا سلوک کیا کرو۔ صرف اس خیال سے کہ یہ خدا کے بندے اور اس کی صنعت کی یادگار ہیں۔ اس عمل سے تم کو خدا کی محبت نصیب ہو گی اور یہی تصوّف کی اصل ہے۔ "

جے پور سے اجمیر تشریف آوری ہوئی اور چند دن یہاں رکے ایک روز کا ذکر ہے آپ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کے بعد جھالر کے کنارے تشریف رکھتے تھے کہ نوشاہیہ سلسلے کے ایک درویش آن کر قدم بوس ہوئے اور آبدیدہ ہو کر کچھ عرض کرنا چاہتے تھے کہ آپ نے مسکرا کر ان سے معانقہ کیا اور فرمایا: "بس اسی کے واسطے رویا کرتے تھے؟" شاہ صاحب مکیف ہو کر کہنے لگے: " حضور' میرا کام ہو گیا۔ " دیر تک وجد میں آن کر جھومتے رہے جب طبیعت ٹھہری تو لوگوں نے ان کا حال دریافت کرنا چاہا کسی قدر تامل کے بعد کہا: " بھائی' کیا پردہ کروں؟ میرے مرشدِ برحق کا نام سائیں نصراللہ شاہ یک رنگی ہے۔ وہ کوہ آبو پر مقیم تھے جب ان کے وصال کا زمانہ قریب آیا تو میں نے عرض کیا: سائیں جی اس کتے کو بھی ایک ٹکڑا مل جائے۔ فرمایا: تم اجمیر شریف چلے جاؤ اس حلیئے کے ایک صاحبزادے اودھ سے آئیں گے وہ تمہاری یہ گرہ کھول دیں گے' لیکن جب تک وہ نہ آئیں انتظار کرنا' چنانچہ بارہ سال سے انتظار کر رہا تھا' آج اللہ نے مراد پوری کی کہ پیشوا کا دیدار ہوا۔ " کچھ عرصے بعد آپ نے ان درویش کو رخصت کیا اور نصیحت کی کہ جس وقت فرصت پاؤ' بغیر کسی غرض اور معاوضے کے اللہ کی مخلوق کو پانی پلاؤ لیکن اس کا خیال رہے کہ مر جانا' مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا۔

اجمیر سے آپ ناگور گئے اور وہاں سے بمبئی۔ وہاں کے مشہور تاجر حاجی یوسف زکریا میمن نے ایک کثیر جماعت کے ساتھ آپ کی بیعت کی۔ آپ جہاز کے انتظار میں انہی کے مہمان رہے۔ ارادت مندوں نے آپ کی ظاہری بے سروسامانی دیکھ کر آرام و راحت کا قیمتی اسبابِ سفر فراہم کیا اور چاہا کہ چند خدمت گزار ملازم آپ کے ساتھ جائیں' لیکن آپ نے اس نمائشی سامان کو ناپسند کیا اور خدّام کو ساتھ رکھنا بھی منظور نہ فرمایا' بلکہ اسی سادگی سے صرف اپنا کمبل لے کر بادبانی جہاز پر سوار ہوئے اور جملہ مسافروں سے علیحدہ ایک تاریک گوشے میں بستر لگالیا۔ اس زمانے میں آپ صومِ وصال رکھتے تھے جو تیسرے روز افطار ہوتا تھا اور کمال تحمّل اور استقلالِ مزاج کی وجہ سے کیفیّت یہ تھی کہ انتظامِ افطار کا خیال بھی ناپسند تھا' بلکہ عادت تھی کہ عین وقت پر جو میسر آتا' اسی سے روزہ افطار کرتے تھے۔ جہاز پر بھی حالتِ صوم میں سوار ہوئے اور افطار کا سامان وغیرہ ساتھ نہیں لیا' حتیٰ کہ تین روز اور بروایت سات روز بے آب و دانہ گزر گئے۔ مِن جانب اللہ یہ خطرناک حادثہ رونما ہوا کہ دفعتاً جہاز کی رفتار معطّل ہو گئی۔ بمبئی کے ایک مقتدر تاجر محمد ضیاء الدین سیٹھ بھی اسی جہاز پر سوار تھے۔ اسی شب انہوں نے حضور رسالت مآبؐ کو خواب میں یہ ارشاد فرماتے سنا: اے ضیاء تم کھاتے ہو اور ہمسائے کا خیال نہیں کرتے؟

Marfat.com

وہ خوش نصیب تاجر جب خواب سے بیدار ہوا، تو حسبِ ارشاد مخبرِ صادقؐ اس کا یقین ہو گیا کہ کوئی ایسا برگزیدۂ حق اس جہاز پر سوار ہے جس کی بھوک نے حبیبِ پروردگار کو بیقرار کر دیا، لیکن مشکل یہ ہے کہ مجھ ایسا ظاہر بیں اس مقدس صاحبِ باطن کو تلاش کیوں کر کرے؟ اس لئے بہترین تجویز یہ ہے کہ بغیر امتیاز کے جہاز پر سوار تمام مسافروں کی دعوت کر دی جائے۔ اس طرح وہ محترم ہستی بھی شریک ہو جائے گی۔ 'چنانچہ ایسا ہی کیا۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو گئے تو تاجر نے بنظرِ احتیاط دیکھنا شروع کیا کہ کوئی شخص تو باقی نہیں رہ گیا۔ نگاہِ قدرت ایزدی کا یہ کرشمہ نظر آیا کہ تہہ خانے میں ایک نوجوان گوشۂ عزلت میں توکّل کا تکیہ لگائے شاہدِ حقیقی کے خیال میں محو و مستغرق ہے۔ یہ دیکھ کر سیٹھ ضیاء الدین الٹے پاؤں واپس آیا اور نہایت ادب اور اہتمام سے ایک طبق میں لذیذ اور پر تکلّف کھانا لے گیا اور دست بستہ عرض کیا کہ مجھ بے بضاعت کی دعوت قبول ہو۔ آپ نے خلقِ محمدیؐ کا نمونہ پیش کرتے ہوئے دو چار لقمے لئے اور باقی کھانا واپس کر دیا۔ قدرتِ الٰہی سے جہاز کی رفتار اسی وقت ٹھیک ہو گئی۔ کہتے ہیں یہ عجیب واقعہ عدن سے پہلے کسی مقام پر پیش آیا تھا اور جہاز والے عام طور پر آپ کے ایسے گرویدہ اور عقیدت مند ہوئے کہ ہر وقت حاضرِ خدمت رہنے لگے اور بہت سوں نے بیعت بھی کی۔ بہت عرصے بعد اس پہلے سفرِ حج کے تذکرے میں آپ نے فرمایا: "جب ہم جدّہ میں اترے، تو سیٹھ ضیاء الدین بھی اترے ہم نے ان سے کہا کہ بہتر یہ ہے تم پہلے مدینہ منورہ ہو آؤ۔ کیونکہ حج کا ابھی چار مہینے انتظار کرنا ہو گا اور زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ انہوں نے آب دیدہ ہو کر کہا: دل تو یہی چاہتا ہے آپ کی معیت میں رہوں مگر حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔ تھوڑے عرصے بعد ہم سے مکّہ مکرّمہ میں کسی نے کہا کہ ضیاء الدین صاحب جب روضۂ اقدس پر پہنچے اور آستانہ بوسی کے واسطے جھکے تو اسی حالت میں اس طالبِ صادق کا دم نکل گیا۔ جہاز پر سب لوگ ہمارے یار ہو گئے تھے کہ جدّے میں اترے تو سب نے اصرار کیا کہ آپ کا اونٹ آگے اور ہمارے اونٹ پیچھے چلیں گے تاکہ ظاہر ہو جائے ہمارے قافلہ سالار آپ ہیں۔ ہم نے کہا کہ یہ جھگڑا ہے جب وہ لوگ کھانے پکانے میں مشغول ہوئے، ہم وہاں سے مکّے تک پیدل چلے گئے اور راستے میں کسی بدو نے ہم کو نہیں ستایا۔"

سیّد وارث علی شاہ 29 شعبان کو شب کے وقت مکّے پہنچے اور عبدالرحمان مکّی کے مکان میں قیام فرمایا۔ دوسرے روز یکم رمضان المبارک کو مطوّف کے ہمراہ طوافِ بیت اللہ کے لئے جا رہے تھے کہ باب السلام کے قریب ایک جلیل القدر بزرگ نے جو مکّے میں صاحبِ دوائرِ کبریٰ مشہور تھے، آپ سے معانقہ کیا اور بشارت دی کہ صاحبزادے، مبارک ہو، آج وہ انوار حدیث مشاہدہ کرو گے جن کے دیکھنے کی اہلیت اور استعداد صدیوں کے بعد خدا نے تم کو مرحمت فرمائی ہے۔ الغرض سیّد وارث علی حرمِ محترم میں داخل ہوئے، عنایتِ وہبی سے حقیقتِ کعبہ منکشف ہوئی اور جو دیکھنا چاہتے تھے وہ بے حجاب دیکھا۔ ایک روایت یوں بھی ہے کہ حرمِ محترم کے قریب ایک خدا رسیدہ بزرگ انتظار میں کھڑے تھے۔ آپ سے معانقہ

Marfat.com

کیا اور فرمایا: آنے میں بہت دیر کی۔ یہ کہہ کر جاں بحق تسلیم ہوئے۔ آپ نے ان کی تجہیز و تکفین فرمائی۔ اس روز سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ افطار سے قبل حرم شریف میں جاتے' تراویح کی نماز کے بعد کچھ دیر انتظار کرتے جب رات زیادہ جاتی اور چیدہ چیدہ لوگ رہ جاتے' اس وقت مقامِ ابراہیم میں بہ نیّتِ نفل کھڑے ہو کر نہایت خوش الحانی کے ساتھ مصری لہجے سے دو رکعت میں پورا قرآن مجید ختم کرتے اور فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد بستر پر تشریف لاتے تھے۔ پھر تمام دن تاریخی مقامات اور مقدس یادگاروں کی زیارت میں گزر جاتا تھا۔

سید وارث علی شاہ کے اخلاقِ حسنہ دیکھ کر خلقِ خدا کا کثرت سے رجوع ہوا' حالانکہ آپ کے اوقات اس قدر منضبط اور منقسم تھے کہ قیام گاہ پر لوگوں کو ملاقات کا موقع نہ ملتا تھا' لیکن طالبانِ حق شب و روز سرگرداں رہتے اور جہاں کہیں آپ مل جاتے وہیں آپ سے فیوض و برکات حاصل کرتے۔ حتیٰ کہ مکّہ معظمہ میں اکثر مقتدر اور ممتاز حضرات حلقہ بگوش ہوئے اور رفتہ رفتہ تمام شہر میں آپ کے تصرّفاتِ روحانی کا شہرہ ہو گیا۔ ایک مرتبہ اس زمانے کے واقعات کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا: "طائف میں ایک خوش حال شخص علی بن حافظ ہمارا مرید ہوا اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا: خدا کو خوش کرنے کا کوئی آسان طریقہ تعلیم کیجئے جس کی تعمیل کر سکوں۔ ہم نے کہا: اچھا' اگر تم کو یہ شوق ہے کہ خدا تم سے خوش ہو' تو جیسی نیکی خدا نے تمہارے ساتھ کی ہے' تم اس کی مخلوق کے ساتھ ویسی ہی نیکی اور احسان کرو علی بن حافظ نے کہا: بہت اچھا ایسا ہی کروں گا۔ آٹھ روز کے بعد وہ مکّہ شریف میں ہمارے پاس آیا اور کہا کہ حسبِ ہدایت میں نے اپنا کل مال اللہ کی راہ میں فقراء اور مساکین پر تقسیم کر دیا اور سمجھا کہ فراغت ہو گئی۔ خدا کے احسان کا بدلہ کر چکا' مگر دوسرے روز بغیر طلب خدا پھر مجھ کو لذیذ غذا پہنچاتا ہے۔ اب آپ سے یہ پوچھنے آیا ہوں کہ اس احسان کے عوض اس کے بندوں کے ساتھ میں کیا بدلہ کروں؟ اب تو میرے پاس مال بھی نہیں ہے؟ ہم نے کہا: اگر وہ کریم کارساز روز تم کو غذاء کھلاتا ہے' تو اس کا بدلہ تم یہ کرو کہ روز اس کے بندوں کو بلا خیالِ معاوضہ پانی پلایا کرو۔ کیونکہ پانی بھی بہت بڑی نعمت ہے۔ چنانچہ اسی وقت اسے ایک مشک منگا دی گئی اور اسی دن سے وہ خدا کو خوش کرنے کے شوق میں خدا کے بندوں کو پانی پلانے لگا۔

"کچھ عرصے کے بعد وہ پھر آیا اور کہا: اب دوسری پریشانی میں مبتلا ہوں۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ تو غذائے لذیذ اسی طرح مجھ کو پہنچائے جاتا ہے' مگر میری آنکھوں میں یہ مرض پیدا ہو گیا ہے کہ ماسوائے اللہ کوئی دوسرا مجھ کو نظر نہیں آتا' پانی کس کو پلاؤں؟ ہم نے کہا: اب مشک پھینک دو اور غار ثور میں جا کر اس طرح بیٹھو کہ مر کے اٹھو۔ تمہارا کام ہو گیا۔ یہ اللہ کی دین ہے' جاؤ"

آپ نے تین مہینے سے زیادہ مکّہ معظمہ میں قیام فرمایا۔ اس عرصے میں بہت سے حضرات سلسلے میں داخل ہوئے اور ہر ایک کو اس کی حالت اور استعداد کے لحاظ سے ہدایت فرمائی۔ کسی کو حکم ہوا کہ اہل و عیال کی ضروریات کے لئے تجارت کرو' کسی کو دائم الصّوم اور کسی کو قائم اللیل رہنے کی ہدایت ہوئی۔

Marfat.com

کسی کے واسطے زہد و توکل تجویز کیا' کوئی بادہ محبت سے سرشار ہوا۔

مدینہ منوّرہ کو جانے والا پہلا قافلہ ذی الحجہ کے دوسرے ہفتہ میں تیار ہوا۔ شریفِ مکّہ نے سیّد وارث علی شاہ کی سواری کے لئے ایک اونٹ کا انتظام کیا' حکام بھی ہمرکاب تھے' مگر مکہ معظمہ سے پاپیادہ مدینہ منوّرہ کو روانہ ہوئے۔ ایک روز راستے میں بدوّؤں سے مقابلہ ہوا۔ قافلے والوں نے اس پریشانی میں سیّد وارث علی شاہ کو پشت پناہ بنایا اور کہا کہ اللہ کے واسطے ہمیں اس آفت ناگہانی سے بچایئے۔ آپ نے سب کو تسکین دی اور خود ان مسلح بدوؤں کے پاس گئے۔ ان کے سردار سے فرمایا: افسوس کا مقام ہے کہ تم کو نسلاً جس کے رضاعی بھائی ہونے کا شرف حاصل ہے اس کے زائرین کی مہمان نوازی کے بجائے لوٹنے آئے ہو؟ سردار نے جواب دیا: اس قافلے کی محافظت کے صلے میں ہم کو سو روپے ملتے تھے' وہ شریفِ مکّہ نے نہیں دیئے سیّد شاہ صاحب نے فرمایا: وہ روپیہ تم ہم سے لے لو یہ کہہ کر بمبئی کے ایک ارادت مند تاجر کو حکم دیا تم دو سو روپے ان کو دے کر اپنے قافلے کو تکلیف سے بچاؤ۔ وہ تاجر روپے کی تھیلی لے کر حاضر ہوا بدوّ یہ دیکھ کر بہت شرمندہ ہوئے اور روپیہ لینے سے انکار کیا' ان کے دو سردار ندامت سے گردن جھکائے سیّد وارث علی شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آب دیدہ ہو کر عرض کیا کہ آپ کی ہدایت سے متاثر ہو کر ہم آئے ہیں' آپ کے سامنے اللہ سے عہد کرتے ہیں کہ آج سے تازندگی کسی قافلے کو تکلیف نہ پہنچائیں گے۔ آپ نے خوش ہو کر ان کو رخصت کیا اور قافلہ آگے چلا۔

جوں جوں قافلہ مدینہ منوّرہ سے قریب ہو رہا تھا' بے قراری بڑھتی جاتی تھی اور جب مدینے میں اپنے جدِ اعلیٰ کے مزار اقدس پر پہنچے تو دردِ فراق سے مضطرب تھے۔ یقین ہے کہ حضرت سرور عالمؐ نے اپنے نوعمر نبیرہ کو ایک نظرِ عنایت سے قربِ الٰہی میں اس مقام ارفع تک پہنچا دیا جس کے اثرات سے صدیوں کے بعد دنیا کے ہر گوشے میں عشق و محبت کے چشمے جاری ہو گئے۔ تین ماہ مدینے میں قیام رہا اور بے انتہا فیوض و برکات حاصل ہوئے' وہاں سے نجفِ اشرف گئے اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کے مزار اقدس سے لپٹ کر زار زار روئے۔ اسی حالت میں عنایت مرتضوی سے آپ کا سینہ فیوض اور برکات سے معمور ہوا اور جو دیکھنا تھا' دیکھا۔ پھر کربلائے معلّیٰ کی طرف پیدل روانہ ہوئے اور امام عالی مقام حضرت سید الشہداء علیہ السلامّ کے آستانہ اقدس کی زیارت سے شرف اندوز ہوئے اور فقر و غنا کی تاکید کے بعد یہ راز منکشف ہوا کہ تشنگی اور گرسنگی شاہدِ بے نیاز کے ادا و ناز کے دو کرشمے ہیں جن پر صبر کرنا سیادت کی مخصوص شان اور عاشقین کا عین مسلک ہے۔

کاظمین اور سامرہ ہوتے ہوئے آپ بغداد شریف پہنچے۔ خانقاہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہ میں چند روز قیام کیا۔ دن کو صوفیائے متقدمین کے مزارات کی زیارت کرتے اور رات کو مزارِ حضرت غوث الثقلینؒ کے قریب مسجد میں عبادت کرتے تھے۔ روایت ہے کہ بغداد شریف سے روانہ ہو کر آپ واپس مکّہ معظّمہ پہنچے' حج میں شریک ہوئے۔ یہ حج دوشنبہ کو ہوا جسے عرف عام میں حج النبی کہتے ہیں۔

Marfat.com

مناسکِ حج کی ادائیگی کی ادائیگی کے بعد پھر مدینہ منوّرہ حاضر ہوئے اور وہاں سے بیت المقدّس تشریف لے گئے' انبیاء علیہم السلام کے مزارات کی زیارت کی۔ اس سفر میں آپ نے افریقہ کی سیاحت فرمائی۔ واپس مکّہ معظمہ آئے دوسرا حج کیا اور اس مرتبہ مدینہ منوّرہ میں زیادہ عرصے قیام رہا۔ وقتاً فوقتاً شام اور حلب بھی گئے۔

پہلے سفر میں آپ نے چار حج کئے اور چار مرتبہ مدینہ منوّرہ کی زیارت سے مشرّف ہو کر جَدِّ امجدؑ سے رخصت ہوئے۔ بحری جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچے اور اندوَر' اجین' ٹونک' اجمیر اور دہلی ہوتے ہوئے 1257ھ میں لکھنؤ آئے۔ ایک ہفتہ دہلی رہ کر قصبہ دیوئی میں اس شان سے تشریف لائے کہ تہبند پوش' پابرہنہ' ننگے سر تھے۔ لوگوں نے پہلے نہیں پہچانا' بعد کو شہرت ہوئی کہ مٹھن میاں تشریف لائے۔ پھر تو خلق خدا کا وہ ہجوم ہوا کہ بایدوشاید۔ چندروز قیام کے بعد آپ نے ایکاایکی پھر سفرِ حجاز کا عزم کیا اور اسی سال یعنی 12 ربیع الثانی 1257ھ کو پاپیادہ روانہ ہو گئے۔ کابل اور قندھار کے راستے ایران و عراق سے ہوتے ہوئے بالاخر آپ مدینہ منوّرہ پہنچے اور روضہ رسالت مابؐ کی زیارت سے شرف اندوز ہو کر مکّہ معظّمہ پیدل گئے' حج کیا' پھر ترکی قافلے کے ساتھ قسطنطنیہ تشریف لے گئے اور عبداللہ حاجب کے مکان میں قیام فرمایا۔ ایک روز عبداللہ کے ساتھ باغِ سلطانی کی سیر کر رہے تھے کہ سلطان عبدالمجید خان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ آپ کے چہرۂ حق نما کی شانِ جلالت دیکھ کر ایسے گرویدہ ہوئے کہ بہ اصرار تمام منزل سلطانی میں لے گئے اور اپنی ارادت مندی کا باقاعدہ اقرار کیا۔ دیگر اراکینِ سلطنت بھی حلقہ بگوش ہوئے۔ کچھ عرصے تک آپ نے مضافاتِ ترکی کے مشہور اور تاریخی مقامات کی سیر کی اور طالبانِ حق کو فیض معنوی سے مستفیض فرمایا۔

قسطنطنیہ میں آپ اس قدر ہردلعزیز ہوئے کہ کسی کو مفارقت گوارہ نہ تھی' مگر آپ نے جب حج کا ارادہ ظاہر کیا' تو سب لوگ مجبور ہوئے اور اس حساب سے آپ واپس ہوئے کہ عین حج کے دنوں میں مکّہ معظمہ پہنچ گئے حج کے بعد اس سفر میں بوقت واپسی سنگادیپ بھی گئے اور 1260ھ میں لکھنؤ واپس آئے۔ تھوڑے عرصے بعد آپ نے تیسرے سفر کا مصمّم ارادہ کیا اور یہ سفر بھی خشکی کے دشوار گزار راستے سے پیدل فرمایا۔ اسی سفر میں آپ نے ایران کی سیاحت کی اور بعدازاں روس روانہ ہوئے۔ یورپ کے بعض ملکوں اور جرمنی وغیرہ کی بھی سیر کی۔ ایک مرتبہ جسٹس شرف الدّین نے یورپ کے حالات بیان کئے۔ سیدّوارث علی شاہ نے جرمنی کے ایک چھوٹے سے شہر کا نام لے کر فرمایا: "بیرسٹر' تم بھی وہاں گئے تھے؟" انہوں نے عرض کیا: گیا تھا۔ ارشاد ہوا: کہاں ٹھہرے تھے؟ عرض کیا: ہوٹل میں۔ فرمایا: اس ہوٹل میں جو گرجا کے پاس ہے؟ انہوں نے جواب دیا: جی ہاں۔ فرمایا: ہم بھی وہاں گئے تھے۔ اس وقت میرببن وہاں کے رکنِ اعظم تھے۔ ان کے مکان میں تین روز رہے۔ وہاں کے لوگ بڑے خلیق ہیں۔ اسی سلسلے میں آپ نے مصر کی بھی سیر فرمائی اور واپسی میں یمن کے یادگار ملاحظہ کر کے رمضان

Marfat.com

المبارک میں مکہ پہنچ گئے اور حج کے زمانے تک قیام کیا۔ 1262ھ مطابق 1853ء میں واپس آکر سرزمین دیویٰ کو شرفِ پابوس سے ایسا مشرف کیا کہ دنیا نے اس کی شرافت کا اقرار کیا اور لفظ شریف اس کے نام کے ساتھ ضم ہو گیا۔ سرکاری ڈاک خانے کی مہر میں بھی دیویٰ شریف ہی تحریر ہے۔ خلاصہ اس تفصیل کا یہ ہے کہ آپ نے چودہ برس کی مسلسل سیاحت میں گیارہ حج ادا فرمائے۔ آپ کے حج ادا کرنے کی منجانب اللہ شہرت ہوئی اور بغیر کسی تحریک کے خلق اللہ آپ کو حاجی کہنے لگی' بلکہ یوں ہوا کہ آپ مجسّم حاجی ہو گئے یعنی اس کی ضرورت ہی نہ رہی کہ آپ کا نام بھی لیں۔ مجرّد حاجی صاحب کہنے سے سمجھ لیا جاتا ہے کہ دیویٰ شریف کے حاجی سیّد وارث علی شاہ کی طرف اشارہ ہے اور یہ سمجھنا آپ کے مقبول اور بے مثل حج کی عین خصوصیت ہے۔ اس سے صریح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کعبۃ اللہ کے ساتھ آپ کو گہری نسبت اور روحانی تعلق تھا اور حقیقت کعبہ کا ایسا اظہار کامل اور انکشاف بیّن ہوا کہ دیگر صفات جسمانی پر یہ صفت غالب ہو گئی اور روح پر فتوح کو عین ذات سے سروکار ہو گیا جو حصول مقصد اصلی کی خاص دلیل اور فنا تم کا آخری نتیجہ ہے کہ جس کے شوق دید میں گئے تھے' اس کو دیکھا اور جوشِ اشتیاق میں جس کی جستجو تھی' اس کو پایا۔ شاہدِ حقیقی کا وصل مطلوب تھا' وہ ہوا' چنانچہ آپ اکثر مولانا روم کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے ع

حج زیارت کردن خانہ بود

حج رب البیت مردانہ بود

کچھ عرصہ بعد آپ نے پھر سفر کا ارادہ کیا۔ یہ دیکھ کر عقیدت مند اور مخصوص حلقہ بگوش حاضرِ خدمت ہوئے اور رو رو کر کہنے لگے کہ اب ہم لوگ برسوں کی جدائی کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتے' اس لئے اگر آپ دور دراز کا سفر فرمائیں گے' تو ہم نے بھی مصمّم ارادہ کر لیا ہے کہ اہل و عیال لے کر آپ کے ساتھ چلیں گے اور چونکہ بے سرو سامان چلیں گے' اس لئے یقین ہے کہ راستے میں فاقے کر کے مر جائیں گے' لیکن آپ کا دامن نہ چھوڑیں گے' اس لئے ہمیں اور ہمارے اہل و عیال کو در بدر پھرانا منظور ہے' تو بہتر' چلئے' ورنہ اس کا وعدہ کیجئے کہ ہندوستان سے باہر نہ جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ سو دو سو کوس کے اندر سیر و سیاحت فرمایئے تاکہ مہینے دو مہینے بعد تو زیارت ہو جایا کرے۔ یہ پُر درد اور خلوص آمیز التجا سن کر آپ کھڑے ہو گئے اور فرداً فرداً سب کو سینے سے لگا کر فرمایا: تم ہمارے یار ہو اور تمہاری عورتیں ہماری مائیں بہنیں ہیں۔ ان کی تکلیف کا خیال بھی ہماری غیرت کے خلاف ہے۔ اگر تمہاری محبت اجازت نہیں دیتی تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہندوستان سے باہر نہ جائیں گے' مطمئن رہو۔

اس روز سے سیر و سیاحت محدود ہو گئی۔ لیکن سفر کرنا آپ کے مشربِ خاص کا لازمہ تھا' اس لئے ترک نہیں فرمایا۔ دو تین سال کے بعد جب دوسرے علاقوں کے پرستار اصرار کرتے' تو آپ عظیم آباد اور آگرے وغیرہ جایا کرتے تھے' مگر اس قید کے ساتھ دو تین روز سے زیادہ کہیں قیام نہ ہوتا۔ اگر کسی خاص

Marfat.com

سب سے زیادہ دن رہنے کا اتفاق ہوتا تو نقلِ مکان کے ساتھ دوسرے شخص کی دعوت قبول کرتے تھے تاکہ مسافرت کا سلسلہ منقطع نہ ہو' چنانچہ اکثر فرماتے تھے "ہم مسافر ہیں۔" اس امر کا بھی بے حد لحاظ تھا کہ مہمانداری کا بار کسی شخص پر دشوار نہ ہو اور خدام کو سختی سے تاکید تھی کہ میزبان سے کسی چیز کی فرمائش کا اشارہ بھی نہ کیا جائے۔ آپ کی غذا اس قدر قلیل اور سادہ تھی کہ معمولی حیثیت کا آدمی بھی بلا تکلف انصرام کر سکتا تھا۔ ایک بار آپ نے اپنے قدیم حلقہ بگوش حافظ رمضانی کے نہایت چھوٹے اور بوسیدہ مکان میں ایک شب کے لئے قیام فرمایا۔ حافظ صاحب نہایت غریب آدمی تھے شب کو دسترخوان پر مٹی کے کونڈے میں جوش کئے ہوئے چنے اور نمک پیش کر کے کہا کہ آج میرے پاس اسی قدر چنے تھے جو لایا ہوں' امید ہے آپ قبول فرمائیں گے۔ حضرت نے نہایت خوشی سے وہ چنے تناول فرمائے۔ اسی طرح آپ کے میزبان کو سواری کا تردّد اور انتظام کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی کہ آپ پیدل سفر کرتے تھے۔' البتہ شدید علالت کے بعد ضعف کے باعث پالکی میں کبھی کبھی سوار ہوتے تھے اور وہ بھی ارادت مندوں کے اصرار سے۔ اس کی بھی ضرورت نہ تھی کہ آپ کے لئے مکان وسیع اور اسباب آرائش سے آراستہ ہو۔ بلکہ یہ دیکھا ہے کہ آج آپ کسی مقتدر رئیس کی عالی شان کوٹھی میں قیام پذیر ہیں' تو کل ایک غریب نورباف کے چھپر میں اسی خندہ پیشانی سے آرام فرما رہے ہیں۔ غور کرنے سے بھی کبھی محسوس نہ ہوا کہ کوٹھی اور چھپر کی راحت اور تکلیف کا آپ نے کیا اثر لیا۔

اربابِ طریقت نے لکھا ہے کہ صاحب علیا کی شان یہی ہوتی ہے کہ تعلقاتِ موجودات سے دستبردار ہونے کے ساتھ اثراتِ عالمِ اسباب سے بھی تعلق نہیں رکھتے جس کو عرفِ صوفیہ میں "ترکِ قطعی" کہتے ہیں۔ مثلاً زبان سے گرمی سردی کی شکایت نہ کرنا رضا کا پہلا مقام ہے' لیکن رضا و تسلیم کی حقیقی تعریف یہ ہے کہ رضائے محبوب کی تعمیل میں ایسا محو و مستغرق ہو کہ گرمی سردی کی حرارت اور برودت سے اس کا قلب مطمئن' منتشر اور متاثر نہ ہونے پائے' چنانچہ اکثر دیکھا گیا کہ آپ امراء یا روسا کے ہاں ٹھہرنے کے بجائے غریبوں اور مسکینوں کے ہاں قیام کرنے کو ترجیح دیتے تھے تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہو' یوں آپ کو امراء سے بھی نفرت یا وحشت نہ تھی' اس لئے نظرِ حقیقت شناس تھی۔ امیر اور غریب ہونا انسان کی صفت اضافی ہے جس میں ہمیشہ تغیّر اور انقلاب ہوا کرتا ہے۔ آپ کے نزدیک البتّہ خلوص اور محبت کی بے حد قدر تھی۔ زندگی بھر یہی وضع رہی کہ اگر کسی شہر یا بستی میں ایک مرتبہ کسی غریب کے ہاں ٹھہر گئے ہیں' تو ہمیشہ وہیں قیام فرمایا اور بڑے بڑے لوگوں کی درخواست قبول نہ کی۔ یہی فرمایا کہ وضع کے خلاف ہے۔

ایک مرتبہ ریاست پیاگپور تشریف لے گئے اور حسبِ وضع محمد سلیم مستری کے معمولی مکان میں ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ نواب صاحب نے دست بستہ عرض کیا کہ محمد سلیم غریب آدمی ہے اور اس کا مکان بھی سٹیشن سے دور ہے۔ میری کوٹھی سٹیشن سے نزدیک ہے اس لئے آپ وہیں قیام فرمائیں' تو میری عین

Marfat.com

عزت افزائی ہو۔ نواب صاحب کا یہ کہنا کہ محمد سلیم مستری غریب آدمی ہے' حضرت کو سخت ناپسند ہوا اور ترش لہجے میں فرمایا: ہم کو نہ کسی بڑے سے غرض نہ غریب سے۔ مستری کو ہم سے محبت ہے اور اس کے ہاں ہم پہلے بھی ٹھہر چکے ہیں' اب دوسری جگہ رہنا وضع کے خلاف ہے' چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ محمد سلیم کے خس پوش مکان میں سٹیشن سے دور جا کر قیام کیا اور باوجود منت خوشامد نواب صاحب کی رفیع الشان کوٹھی میں رہنا گوارا نہ فرمایا۔

آپ کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ دیہات کے سفر میں اگر کسی مقام پر استنجا کیا یا کسی درخت کے سائے میں تھوڑی دیر رک کر کسی کنویں کا پانی پیا' تو جب بھی اس راستے سے گزر ہوا' اسی مقام پر ضرور استنجا کیا' اسی درخت کے سائے میں رکے اور اسی کنویں سے پانی نوش فرمایا۔ آپ کے خادم دائم علی شاہ اس شان سے ہمراہ رکاب رہتے کہ حضرت کا سیاہ کمبل کاندھے پر اور کنگھا اور سرمہ ہاتھ میں۔ آپ نے روز مرہ کی معمولی باتوں میں بھی ایسی مستقل پابندی فرمائی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی' چنانچہ آپ کے ترکِ عادات؟ روایت ہے کہ چارزانو کی نشست قطعاً ناپسند تھی۔ اگرچہ یہ نشست آداب کے بھی خلاف سمجھی جاتی ہے' تاہم بلحاظ وضع دیکھا جائے' تو آپ اس نشست سے ایسا احتراز فرمایا کہ کبھی اور کسی خاص ضرورت کے وقت بھی اسے اپنے لئے جائز نہیں رکھا۔ اسی طرح ہر روز سر میں کنگھی ہوتی تھی اور اس وضع کا ایسا خیال تھا کہ ہمیشہ وقت پر ضرور کنگھی کی' بلکہ وقت مقررہ پر اگر خادم کسی دوسری خدمت میں مصروف ہوا' تو آپ نے اسے یاد دلایا' سرمہ لگانے میں بھی پابندی دیکھی کہ ہمیشہ داہنی آنکھ میں تین سلائیاں اور بائیں آنکھ میں ڈالتے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سرمہ لگانے کا جو وقت مقرر تھا اس میں تاخیر ہو یا کسی حالت میں بھی سلائیوں کی تعداد میں کمی بیشی ہو۔

یہ بھی وضع میں داخل تھا کہ اگر ایک مرتبہ کسی محتاج کی حاجت روائی کی تو جب بھی وہ آپ کے پاس آیا' اسی کشادہ پیشانی سے اسی قدر روش کی گئی۔ جو پہلے کی تھی۔ خاصہ تناول کرنے کے بعد آپ خلال کرتے تھے۔ اس میں وضع کی پابندی یہ تھی کہ اسی جگہ اور اسی عرصے تک خلال ضرور کرتے تھے اور جو خادم خلال پیش کرتا تھا' اس کے ہاتھ سے لیتے۔ اس کی موجودگی میں دوسرے کی مجال نہ تھی خلال پیش کرے' ہمیشہ جمعے کے روز چاشت سے قبل غسل کرتے موسم سرما میں' بلکہ عین بارش میں بھی اسی وقت اور اسی قدر پانی سے ہمیشہ آپ نے غسل کیا۔ پلنگ کرسی مونڈا وغیرہ کی نشست خلاف عادت تھی بلکہ مخصوص متروکات میں ان کا شمار تھا۔ مچھلی آپ نے کبھی استعمال نہ فرمائی' مگر اس ترک کا واقعی سبب معلوم نہیں ہوا۔ بعض قصبات میں کسی وجہ سے جانا ترک فرما دیا تھا' پھر دوبارہ اس قصبے کی حد میں قدم نہیں رکھا۔ سر سے پاؤں تک آبائی لباس آپ نے ماترک فرمایا اور ستر پوشی کے لئے احرام باندھنا اختیار کیا۔ زندگی کے کسی لمحے تک اس وضع میں فرق نہ آیا۔ 1253ھ میں اول بار جو لباس پہن کر مالک الملک کے سالانہ دربار میں حاضر ہوئے تھے' وہی لباس اسی عنوان سے یکم صفر 1323 وقت وصال تک زیب جسم رہا' اس

Marfat.com

لباس سے آراستہ ہو کر بہ ہنگامِ وصالِ شاہد سے خلوت خاص میں تشریف لے گئے۔

استراحت کا انداز یہ تھا کہ آپ ہر وقت داہنے پہلو سے آرام کرتے تھے۔ کبھی اور کسی حالت میں چت یعنی زمین سے پشت لگانا متروکات قطعیہ میں داخل تھا۔ آپ نے اپنی اس دشوار ترین وضع کی تاحیات ظاہر، کماحقہ، پابندی فرمائی۔ آپ کی یہ زاہدانہ عادت وضع کے پردے میں اپنی نظیر آپ ہے۔ بنظرِ غائر سے دیکھا جائے، تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس اندازِ استراحت سے آپ کے مسلکِ عشق کی اہمیت اور ہمہ وقت خیالِ شاہدِ حقیقی میں آپ کی محویت نمایاں ہوتی ہے۔ اس طرز استراحت میں دو ناقابل برداشت مجاہدے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک پہلو سے ہر وقت استراحت کرنا اس عاشقِ جانباز کا طرۂ امتیاز ہے جو فنا کے مقام پر فائز ہو چکا ہو اور میدانِ توحید میں اپنی ہستی کو واجب الوجود کی ہستی کے سامنے نیست و نابود کر چکا ہو اور دوسری ریاضتِ شاقہ نہایت دشوار، اور قوتِ بشری سے باہر یہ ہے کہ 88 برس تک زمین سے پشت نہ لگائے، جو در حقیقت غیر معمولی نفس کشی اور بے مثل مجاہدہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حاجی سیّد وارث علی شاہ صاحب نے پابندیٔ وضع کے پردے میں وہ کام کیا جو اصل میں ناقابلِ برداشت مجاہدہ تھا اور آپ کے جملہ عادات غیر معمولی مجاہدات تھے۔ آپ کے طرزِ معاشرت کا کوئی حصہ ریاضتِ شاقہ سے خالی نہ تھا۔ مثلاً آپ نے پانی نوش فرمانے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ اول تو پانی قلیل مقدار میں پیتے تھے، لیکن تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد تشنگی معلوم ہوتی تھی اور پانی پینے کے وقت سکوت کا عالم۔ اور کسی مخصوص خیال میں محویت کی صورت ہو جاتی تھی۔ پانی پینے کے بعد لبوں کی جنبش محسوس ہوتی تھی جس سے یہ اظہار ہوتا تھا کہ آپ کچھ فرماتے ہیں۔ پانی طلب کرنے کا انداز تو خاص تھا۔ پیاس کے وقت کبھی یہ نہیں فرمایا کہ پانی لاؤ، کیونکہ جسمانی ضروریات کے لئے کوئی چیز طلب کرنا کلیتاً مشرب اور متروکات عادات میں سے تھا، بلکہ آپ کا دستور تھا کہ خادم سے مخاطب ہو کر نہایت نرم اور خوش گوار لہجے میں فرماتے تھے کہ پانی پی لیں۔ اگر خادم نے یہ عرض کیا کہ ابھی تک آپ پانی پی چکے ہیں، تو خاموش ہو جاتے، اور اگر وہ لے آیا، تو آپ نے پی لیا۔ خلاصہ یہ کہ آپ کا پانی پینا تشنگی پر منحصر نہ تھا، خادم کی مرضی پر موقوف تھا۔

آپ کا بجائے حکماً پانی طلب کرنے کا بکمال حلم اور دل آویز طریقے سے یہ فرمانا کہ پانی پی لیں" نہایت معنی خیز جملہ ہے، جس سے آپ کا مقامِ رضائے کامل اور تسلیم اتم کی شان میں نمایاں ہوتی ہے۔ کہ خادم نے اگر منع کیا تو استقلال سے صبر کیا اور اگر لے آیا تو نوش فرما کر شکر کیا، گویا حضرت نے خادم کے پردے میں منشائے ایزدی دریافت کیا کہ پانی بھی آپ بھی کی رضا کے بغیر پینا منظور نہیں ہے۔ پانی لاؤ اور پانی پی لیں ان چھوٹے چھوٹے الفاظ کے فرق امتیاز کو غور سے دیکھا جائے، تو دونوں جملوں کے مفہوم میں جو تفاوت ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے عادات معاشرت میں بھی اپنے ارشادات اور اختیارات کو ارادہ الٰہی کے سامنے کلیتاً فنا کر دیا تھا اور تعلقاتِ عالم سے انقطاع کامل کے تمام مراحل

Marfat.com

ومنازل طے کر کے ہر حال میں صرف رضائے پروردگار سے سروکار تھا اور آپ کی مراد عین‘ حق کی مراد تھی۔ آپ نے اس طرز عمل سے سکھلایا کہ جس طرح ہمارے مشرب میں سوال کرنا حرام ہے‘ اسی طرح ضرورت جسمانی کے لئے خادم سے بھی حکماً کوئی چیز طلب کرنا جائز نہیں۔ پانی لاؤ کہتے میں اشار تا بوئے سوال آتی ہے۔ یوں بھی یہ جملہ کہنے میں کسی قدر انانیت کی شان ہے کہ حکم دینے سے مخاطب کی یک گونہ تحقیر ہوتی ہے۔ آپ کا مزاج فطرتاً متواضع اور انکسار کے لہجے میں بجائے پانی "لاؤ" کے یہ فرمایا "پانی پی لیں۔

اس طرح غذا کے معاملے میں بھی آپ نے اپنے جسم کی صحت اور توانائی کے لئے پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔ عہدِ طفلی ہی سے آپ کی غذا بے حد قلیل رہی جو اولیائے عظام کا طریق اور انبیائے علیہم السّلام کی سنت ہے۔ [illegible] «الجوع طعام الانبیاء» البتہ کھانے سے زیادہ تقسیم کرنے کا شوق تھا۔ اپنے تن کے کپڑے تک بچپن میں محتاجوں کو دے ڈالتے تھے۔ تقلیل غذا کے علاوہ جب چودہ برس کی عمر میں آپ نے رمضان کے روزوں کے بعد شش عید کے روزے رکھے‘ تو اسی سلسلے میں دائم الصّوم ہو گئے اور جب حجاز کا سفر فرمایا‘ تو اس وقت سے ہفت روزہ افطار کرنے لگے۔ تقریباً پچاس سال کی عمر میں جب آپ سخت علیل ہوئے تو طبیبوں کے متواتر اصرار سے شوربا بھی آپ کی غذا میں شامل ہوا‘ ورنہ عموماً آپ کھانے میں مونگ یا ماش کی دال پالک یا بتھوے کا ساگ چپاتی یا چاول ہوتے تھے اور جس طرح دیگر اسباب دنیا سے قطعی احتراز تھا‘ اسی طرح کھانے کا باقاعدہ انتظام بھی متروک‘ بلکہ‘ مشرباً ممنوع تھا جو فقر کا خاص لازمہ ہے۔ آپ کبھی کھانا طلب نہیں فرماتے تھے‘ بلکہ میزبان خود ہی کھانا لے کر آتا اور خادم عرض کرتا کہ حضور‘ کھانا آ گیا۔ آپ جواب میں اکثر فرماتے: "ہمیشہ اکڑوں بیٹھ کر اور تہبند کا گوشہ سر پر ڈال کر آپ کھانا تناول کرتے۔ نہ کبھی اس نشست میں تغیر ہوا اور نہ برہنہ سر آپ نے کھانا کھایا۔

ابتدائے زمانہ کی مقدار پانچ تولے سے زیادہ نہ تھی حتیٰ کہ 1318ھ سے آپ کی روزانہ غذا ایک تولے کے برابر رہ گئی۔ وہ بھی بعد اصرار‘ ورنہ کسی روز انکار کیا تو وہ بھی نہیں۔ کبھی میزبان کی خاطر اصرار سے شیر برنج میں انگلی لگا کر زبان پر رکھتے اور فرماتے‘ اچھی پکائی ہے یا پلاؤ کے دو چار چاول کھا کر ارشاد ہوتا‘ باورچی خوب ہے کباب خوب پکائے ہیں۔ بادی النظر میں یہ کوئی اہمیت کی بات نہیں کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے ذائقہ لینے میں غور نہیں فرمایا‘ یا تامل کی نگاہ سے دیکھا جائے‘ تو یہی ایک صفت آپ کے رفیع ہونے کی بڑی دلیل ہے‘ کیونکہ فقیر کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا ہر شے سے انقطاع ہو‘ یعنی جملہ موجودات کی خواہش سے فراغ اور اسکی یاد دل سے فراموش ہو جائے۔ اسے صوفیہ کی اصطلاح میں کہتے ہیں اور ترک کی اقسام میں ترکِ لذات بھی ایک ترک کا نام محققین کے نزدیک اس کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ یہ کہ پر تکلف غذائیں چونکہ نفس کو مرغوب ہیں‘ اس لئے فقیر کو ان کے استعمال سے احتراز لازم ہے تاکہ نفس مضمحل مضمحل ہو جائے دوسرے درجے کی صفت یہ ہے کہ غذائے لذیذ کے ترک کے ساتھ‘ ان کی خواہش

Marfat.com

بھی فنا ہو۔ اس دشوار مجاہدے میں کامیابی مشکل سے ہی ہے۔ تیسرے درجے کی تعریف یہ ہے کہ تارک کے خیال سے غذا متروکہ کا ذائقہ بھی فراموش ہو جائے۔ یہ مجاہدہ نہایت سخت اور دشوار ہے اور یہ مرتبہ شاذ و نادر مجاہدین کو حاصل ہوتا ہے۔ حاجی سیّد وارث صاحب نے صرف اشیائے لذیذ اور خواہش اشیائے لذیذ ہی کو ہی متروک نہیں فرمایا، بلکہ ان کے حقیقی ذائقے کا خیال بھی صفحہ قلب سے ایسا فنا کیا کہ مونگ کی دال اور شیر برنج کی لذت اور پلاؤ اور کباب کے ذائقے کا امتیاز باقی نہ رہا۔ اس ترک کا نام صوفیہ کی اصطلاح ترک صادق ہے۔

اسی طرح داہنے پہلو سے آرام کرنے اور چت نہ لیٹنے کا مجاہدہ بھی اپنی نظیر آپ ہے۔ لیٹنا چونکہ آرام وراحت کا باعث ہے اور آپ شاہدِ حقیقی کے عشق میں عافیت و آسائش کا خیال فنا کر چکے تھے، اس لئے تمام عمر ایک پہلو سے لیٹتے اور زمین سے پشت نہ لگائی۔ اس طرز نے آرام کو جو استراحت کا لازمی نتیجہ ہے قطعاً معدوم کر دیا۔ پھر آپ کا لباس بھی اپنی نوعیت میں فرد اور وضع یگانہ رہا جس کے تار تار سے تجرید کا رنگ اور تفرید کی شان نمایاں نظر آتی تھی اور جس کی عظمت کے لئے یہی عرض کر دینا بہت کہ مالک الملک کے سالانہ دربار کی یہی مخصوص وردی ہے۔ روایت ہے کہ پہلے حج کے موقع پر آپ نے اپنا آبائی لباس ہمیشہ کے لئے اتارا اور احرام پہن لیا۔ چونکہ آپ کا حج غیر معمولی تھا، اس لئے اس کے قیود بھی اہمیت سے خالی نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تاحیاتِ ظاہری تقریباً تہتر برس تک آپ کا وہی لباس رہا جو معراجِ معرفت میں زیبِ جسم تھا۔

آپ کا احرام رنگین اور عموماً سوتی کپڑے کا ہوتا۔ عرض میں ڈیڑھ گز اور طول میں چھ گز۔ استعمال کا طریقہ یہ کہ نصف حصے سے ستر پوشی اور دوسرا نصف حصہ بطور چادر نہایت سادگی سے اس طرح کندھے پر ڈالتے کہ سر بالکل کھلا رہتا صرف حالتِ نماز یا کھانا تناول کرتے وقت گوشۂ احرام یا کوئی چادر سر پر رکھی جاتی تھی، ورنہ کبھی گرمی یا سردی میں سر پر کپڑا نہ رکھا۔ احرام کے لئے زرد رنگ مخصوص تھا اور وجہ یہ رنگ پسند ہونے کی شاید یہ تھی کہ آپ کا مسلک عشق تھا اور عشاق کی معراج کمال فنائے اتم ہے۔ اہلِ فنا کو خاک سے مناسبت ہے جس کا حقیقی رنگ زرد ہے۔ اسی وجہ سے عاشقوں کو زرد رنگ طبعاً مرغوب ہوتا ہے۔ دوسرا سبب شاید یہ بھی ہے کہ آپ کے جدِ نامدار کو سرکار رسالت مآب سے ابو تراب کی کنیت مرحمت ہوئی ہے۔ لہٰذا وارثِ مرتضوی نے جدِ نامدار کی یہ سنّت ادا فرمائی اور اپنے لباس کے لئے مٹی کا حقیقی رنگ پسند کیا۔ روایت صحیحہ سے استدلال کیجئے، تب بھی زرد رنگ کی فضیلت کی ثابت ہوتی ہے، کیونکہ منقول ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کو زرد رنگ پسند تھا اور ملبوسِ زرد کا استعمال مسنون ہے۔ ایک حدیث کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس رنگ اور اس وضع کا لباس اسی صاحبِ مرتاض اور صاحبِ تجرید کا ہوتا ہے جسے تعلقات دنیا سے احتراز اور اللہ کے سوا انقطاع کامل ہو؟ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کے حالات میں آتا ہے کہ آپ کا لباس ہمیشہ ہم شکل احرام اور زرد رنگ کا رہا۔ حتیٰ کہ رفع

Marfat.com

الی السماء کے وقت بھی زرد رنگ کی دو چادریں زیب جسم تھیں۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میں نے دیکھا کہ عیسیٰؑ طوافِ بیت اللہ میں مشغول ہیں دو چادریں زرد ان کے جسم پر ہیں اور بالوں سے پانی کے قطرے ٹپکتے ہیں۔

آپ کا بستر بھی زاہدانہ ہوتا تھا۔ جب آپ سفرِ حجاز سے واپس آئے' تو دیکھا گیا کہ زمین پر کمبل بچھا کر استراحت کرتے ہیں اور داہنے ہاتھ کو خم دے کر سر کے نیچے رکھ لیتے ہیں کہ تکیہ متروکات قطعی میں داخل تھا۔ زندگی بھر سوائے ایک احرام اور ایک بستر کے آپ کے پاس دنیا کی کبھی کوئی چیز نہ رہی' بلکہ اکثر اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ سائل کو بستر ہی اٹھا کر دے دیا ہے۔ اسی طرح اپنے رہنے کے لئے کوئی مکان کبھی نہ بنایا اور آبائی مکان بھی اس طرح چھوڑا کہ پھر کبھی اس میں قدم نہ رکھا۔ اکثر فرماتے تھے: "ہم تو مسافر ہیں..... فقیر کا کوئی مکان نہیں اور سب مکان فقر کے ہیں" فقیر کو تکئے کے ضرورت نہیں ہوتی' اگر فقیر کا تکیہ اللہ پر ہو' تو وہ فقیر ہے۔ فاقہ جس طرح نفس کی تکلیف کا باعث ہوتا ہے' اسی طرح تکیہ نفس کو آرام پہنچاتا ہے اور مشربِ عشق میں نفس کی بے جا خواہش پوری کرنا حرام ہے' کیونکہ عشقِ صادق کی تعریف یہ ہے کہ عاشق روحِ بلانفس رہ جائے اور جب تک اس میں نفس ہے' وہ عشقِ الٰہی کا مزا نہیں چکھ سکتا۔ تکیہ رکھنے سے غفلت بڑھتی ہے اور عاشق کی عبادت یہ ہے کہ اس کی ہر سانس غفلت سے پاک ہو۔ فقیر کو چاہئے کہ رضا و تسلیم پر قائم رہے۔" یہی وجہ ہے کہ تمام عمر آپ کی زبان حرفِ شکایت سے آشنا نہیں ہوئی اور کبھی یہ نہ کہا کہ آج گرمی زیادہ ہے یا سردی ہے یا بارش بہت ہوئی' مکان گر گئے یا خشک سالی کی وجہ سے غلّے کی گرانی ہے۔ آپ نے سہواً بھی ایسے الفاظ نہیں فرمائے جن میں ضمناً یا اشارتاً بھی بوئے شکایت ہو اور یہ احتیاط صرف اس سبب سے تھی کہ تسلیم و رضا کا اقتضا یہی ہے کہ منشائے الٰہی سے اختلاف کا اشارہ بھی نہ ہو۔ اسی طرح آپ تعویذ گنڈے بھی نہ دیتے تھے کہ مشیّت قضا و قدر کے خلاف کوشش کرنا ہے جو تسلیم کی ضد ہے جو تسلیم کی ضد ہے۔ امام غزالیؒ نے "احیائے العلوم میں لکھا ہے کہ حضرت رسول کریمؐ نے فرمایا: "جس نے تعویذ کرایا یا داغ دیا' اس نے اللہ پر توکل نہیں کیا" اس حدیث کی شرح میں امام غزالیؒ فرماتے ہیں: البتہ ایسا تعویذ جو آیات قرآنی سے لکھا جائے' جائز ہے۔

آپ کے اخلاقِ حسنہ میں توکّل نہایت اعلیٰ درجے کا تھا اور فرماتے تھے جو خدا پر بھروسا کرتا ہے خدا اس کی مدد ضرور کرتا ہے۔ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو اکثر یہی ہدایت کرتے تھے کہ کسی مخلوق سے سوال نہ کرنا مر جانا مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا۔ آپ زیادہ تر خاموش رہا کرتے اور جب بولتے تو لبوں سے گویا پھول جھڑتے تھے اردو آپ کی مادری زبان تھی' گویا اہل عرب سے عربی میں' ایرانیوں سے فارسی میں اور افغانیوں سے پشتو میں بلا تکلف گفتگو کرتے تھے اور آپ کی تقریر مسائل تصوف' توحید اور فقر و غنا کے حقائق و معارف سے لبریز ہوتی تھی۔ جو آتا اپنے دامن میں گوہرِ مراد لے کر واپس جاتا تھا۔

جوتا آپ کے متروکات میں سے تھا' لیکن برہنہ پائی کے باوجود ہمیشہ پاؤں گرد و غبار سے پاک اور

Marfat.com

محفوظ رہتے تھے۔ 'حتی کہ ہزاروں لوگ دن رات یہ کرامت مشاہدہ کرتے تھے کہ آپ کے پاؤں کا نشان سفید براق فرش پر نہیں پڑتا تھا۔ ' حالانکہ انتظامِ فطرت یہ ہے کہ خشک مٹی سے پاؤں گرد آلود اور تر مٹی سے میلے ضرور ہو جاتے ہیں اور ان دونوں حالتوں میں پاؤں کا نشان فرش پر پڑنا لازمات میں سے ہے' لیکن آپ کا معاملہ اس کے خلاف دیکھا گیا۔ کوسوں کی مسافت پاپیادہ اور پابرہنہ طے کرنے کے بعد بھی آپ کی کفِ پا گرد آلود نہ ہوئی اور نہ بارش کے زمانے میں پاؤں میلے ہوئے اور نہ کبھی سفید فرش پر ان کا داغ لگا۔ بعض اوقات نہ ماننے والوں نے بطور آزمائش اپنے مکان کے صحن میں پانی پھینک دیا اور اس میں سے گزر کر آپ فرش پر آ گئے' مگر فرش پر دھبا نہ پڑا۔ یہ عجیب و غریب صفت ایسی تھی کہ جس کی حقیقت آج تک سمجھ میں نہیں آئی اور بجز اس کے اور کیا کہا جائے کہ یہ قدرتی ودیعت اور وہبی عنایت تھی۔

آپ چونکہ سراپا محبت اور عشق تھے' اسی لئے جو بھی ان صفات کے ساتھ آپ کے پاس آتا اور بیعت کے لئے عرض کرتا' اس سے بیعت لے لیتے۔ فرمایا کرتے کہ بے محبت خدا نہیں ملتا۔ چمار ہو یا خاکروب جو ہم سے محبت کرے' وہ ہمارا ہے' بیعت کے بعد مختلف لوگوں کو الگ الگ ذکر و اشغال کی ہدایات ہوتی تھیں۔ کسی کو ادائے فرض کے ساتھ اور دو وظائف' کسی کو دائم الصوم کسی کو حج کا حکم' کسی کو گوشہ نشین اور کسی کو سیر و سیاحت میں مصروف رکھا۔ کسی کو ذکر جلی اور کسی کو ذکر خفی تعلیم فرمایا' کوئی تارک الدّنیا اور کوئی فقیر ہوا' کسی کو تجرید کا اور کسی کو نکاح کا حکم دیا گیا۔ غرض لاتعداد مخلوقِ الٰہی شرف بیعت سے مشرّف ہوئی اور کوئی فیض سے خالی نہ رہا۔ ارادت مندوں کو متواتر یہ ہدایت تھی کہ "محبت کرو تاکہ اربابِ شوق کی فہرست میں تمہارا نام درج ہو جائے" درود شریف پڑھنے کی بھی شدت سے تاکید کرتے تھے اور اکثر اوقات اس کا طریقہ بھی تلقین کرتے اور کہتے: آخر شب میں درود شریف کا پڑھنا زیادہ مفید ہوتا ہے۔ سوتے وقت سو مرتبہ درود شریف محبت کے ساتھ پڑھا کرو' مگر باوضو۔ اور بغیر کسی غرض کے بعض مریدوں سے سخت مجاہدے بھی کرائے ہیں۔ ایک صاحب کو حکم دیا کہ پانی میں بھگو کر روٹی کھایا کرو' ایک سے کہا کہ گوشت چھوڑ دو' کسی کو مسلسل روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی' چنانچہ فیضو شاہ وارثی نے آپ کے حسب الحکم چھتیس برس تک روزے رکھے۔ مولوی برکت اللہ کو روزانہ چوبیس ہزار چار سو مرتبہ درود شریف پڑھنے کا حکم تھا۔ بعض کے لئے سواری پر بیٹھنا ممنوع اور بعض کے لئے شب کو سونا بند کر دیا گیا۔ یتیم شاہ صاحب وارثی چالیس سال تک شب بیدار رہے۔ ایک صاحب سے ارشاد ہوا: کسی سے بات کرو نہ کسی کی بات سنو اور ہمہ وقت شمار انفاس میں مشغول رہو۔ اس وقت سے لوگ انہیں چپ شاہ کہنے لگے۔ غرض آپ نے ستر سال تک مسلسل خلق اللہ کی ہدایت فرمائی اور لاکھوں مختلف الخیال اور مختلف مقامات کے مسترشدین کو اپنے فیضان سے مستفیض فرمایا اور ان میں غیر مسلموں کی بڑی بھاری تعداد شامل ہے۔ جو غیر مسلم آپ کے پاس ارادت سے آتا' اس سے وعدہ لیتے کہ آئندہ پتھر کو نہ پوجے گا' جھٹکے کا گوشت نہ کھائے گا اور خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے گا۔ چنانچہ ہزاروں ہندوؤں نے

Marfat.com

شرک سے بیزار ہو کر توحید ربُ العزت کا اقرار کیا۔ ' حتیٰ کہ بڑے بڑے مہان اور گنی پنڈت آپ کے پاس آتے ' آپ کی پر اثر باتیں سنتے اور بے اختیار قدموں کو بوسہ دے کر رونے لگتے یا بے ہوش ہو جاتے۔

ایک مرتبہ لکھنؤ کے قیام میں گھوڑا گاڑی پر سوار ایک فرنگی مرد اور ایک عورت آئے ' آتے ہی دونوں قدم بوس ہوئے۔ میم نے ہاتھ جوڑ کر کہا: ہمیں کچھ نصیحت کیجئے آپ نے فرمایا: " زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرو کہ جس طرح حضرت موسیٰؑ خدا کے رسول اور کلیم تھے ' اسی طرح حضرت محمدؐ خدا کے حبیب اور پیغمبر تھے اور جو چیزیں قرآن میں حرام اور ممنوع ہیں ' ان سے پرہیز کرنا جو فرض ہیں ' انہیں بجالانا اور جھوٹ نہ بولنا۔ " انہوں نے ان سب باتوں کا اقرار کیا ' پھر آپ نے بڑی خوشی سے انہیں رخصت کر کے اپنے خادم فیضو شاہ سے فرمایا: تم ان کو انگریز سمجھے تھے یہ یہودی تھے ' یہ یہودی ہیں ' مگر اب دائرہ اسلام میں آ گئے۔

پنڈت دیبی پرشاد واستو ہندوؤں میں بڑے جلیل القدر آدمی تھے۔ ہردوئی میں حضرت حاجی سیّد وارث علی شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر تو کایا ہی پلٹ گئی۔ آپ نے پنڈت جی سے فرمایا: پتھر کو پوجو گے تو ' پتھر ہی دکھائی دے گا اور برہم کو پہچانو گے ' تو انوارِ الٰہی کا مشاہدہ ہو گا۔ ہر وقت اسمِ ذات کی تسبیح پڑھا کرو۔ " پنڈت جی مبہوت بیٹھے سنتے رہے۔ آپ نے انہیں خلعتِ فقیر دے کر برہم شاہ کا خطاب مرحمت فرمایا۔ ہندوؤں اور یہودیوں کے علاوہ پارسیوں اور عیسائیوں کو بھی آپ نے ان کے آبائی عقائد سے نکال کر صحیح روشنی دکھائی اور ان کے قلوب توحید کے نور سے منوّر کئے۔ آپ کے ملفوظات یوں تو بے شمار ہیں اور ہر ملفوظ عشق و معرفت کا گوہرِ گراں مایہ ہے۔ ' تاہم ان صفحات میں چند ملفوظ نقل کئے جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو گا چھوٹے چھوٹے جملوں میں کیسی بڑی باتیں آپ فرماتے تھے۔ ارشاد ہوا: دنیا میں قابلِ تعریف وہ شخص ہے جس کے دل میں کسی کی طرف سے بغض اور کینہ نہ ہو جو رسول اللہؐ کی خاص سنت ہے کسی نے پوچھا: تواضع کا پہلا سبق کیا ہے؟ فرمایا۔ ' جس کو دیکھو ' خیال کرو کہ یہ مجھ سے بہتر اور افضل ہے۔ ایک مرتبہ مثنوی مولانا روم کا مطالعہ فرما رہے تھے ' خصوصیاتِ ادب کا ذکر آیا ' بے ساختہ فرمایا: ادب کا ایک خاصہ یہ ہے کہ وعدہ کرے تو یاد رکھے اور احسان کرے تو بھول جائے۔ فرمایا: صدق ایسی مستحسن صفت ہے کہ جملہ صفات حمیدہ کی اصل صدقِ مقال ہے اور کذب ایسا مذموم فعل ہے کہ تمامی اخلاق ذمیمہ کی جڑ دروغ گوئی ہے۔ ارشاد ہوا: جس کو خدا سے محبت ہوتی ہے ' وہ مال و دولتِ دنیا سے نفرت کرتا ہے۔ فرمایا: ہماری نجات اسی میں ہے کہ صدق دل سے کہیں لا الہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہ۔ تصدیق ہے تو کلمہ طیّبہ کا ورد ہمیں جنت کا مستحسن بنا دے گا۔ ارشاد ہوا: ذاتِ احدیت تغیرات سے پاک ہے یہ خالقِ مطلق ہونے کی عین دلیل ہے کیونکہ مخلوق کے حالات میں تغیر و تبدّل ہونا لازمات سے ہے۔

Marfat.com

عمر کے آخری حصے میں ضعف بے انتہا ہو گیا تھا۔ 1903ء مطابق 1322ھ میں آپ سخت بیمار پڑے حتیٰ کہ اتنی نقاہت ہوئی کہ بستر سے اٹھنا بھی محال تھا۔ اس حالت میں بھی جو کوئی مزاج دریافت کرتا' یہی فرماتے: اللہ کا شکر ہے۔ کوئی تکلیف نہیں۔ اسی بیماری میں ایک سال گزر گیا۔ کلکتہ ہائی کورٹ کے جسٹس سید شرف الدین قدم بوسی کے لئے حاضر ہوئے تو آپ نے لیٹے ہی لیٹے محبت سے فرمایا: آؤ شرف الدین گلے مل لیں۔ یہ کلمہ سن کر وہ آبدیدہ ہوئے اور عرض کیا کہ حضرت' آپ کی صورتِ زیبا اس قدر متغیر کیوں ہو گئی؟ ارشاد ہوا: تمہارے فراق میں یہ حال ہوا۔

چھیاسی سال کی عمر میں آپ کا دوامی استغراق کمال محویت کے درجے تک پہنچ چکا تھا۔ اس روحانی اور مستقل کیفیت میں جسمانی عادات اور ظاہری معاملات میں کچھ کہنا موقوف ہو گیا۔ تاہم اس ضعف اور نقاہت میں بھی طالبینِ ہدایت کی دستگیری کا کام جاری تھا' لیکن دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ فراق کے لمحات قریب آن پہنچے ہیں۔ یہ اور بات کہ عشاق کے لئے یہ لمحات فراق نہیں' وصل کے ہوتے ہیں۔ مرض روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور بخار نے گویا مستقل گھر بنا لیا تھا۔ بہترین طبیبوں کے علاج جاری تھے اور اعلیٰ سے اعلیٰ دوائیں دی جاتی تھیں' مگر بے سود۔ 'حتیٰ کہ یکم صفر 1323ھ اٹھاسی برس کے سن میں یہ مردِ کامل صبح کے چار بج کر تیرہ منٹ پر واصلِ حقیقی سے جاملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وصال سے صرف دو گھنٹے پیشتر یعنی دو بجے شب یہ عجیب و غریب واقعہ پیش آیا کہ دفعتاً مکان کے صحن اور دالان میں ایسی شفاف روشنی نظر آئی کہ تمام حاضرین مرعوب ہو گئے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا کہ حاجی سید وارث علی شاہ نے دونوں ہاتھ اس عنوان سے بلند کئے جیسے کسی سے مصافحہ کرتے ہیں۔ پھر سر کو بھی اس طرح جنبش ہوئی کہ جس سے معلوم ہوتا تھا آپ تعظیم کے لئے اٹھنے کا قصد کرتے ہیں۔

وصال کی خبر آناً فاناً گردوپیش میں پھیل گئی اور ہزاروں لوگ جمع ہو گئے کوئی روتا اور کوئی چیختا تھا۔ اکثر حفاظ قرآن پاک کی تلاوت کرنے لگے اور اکثر درود شریف پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ غسل کے بعد آپ کو اسی رنگین احرام میں لپیٹ کر سپرد خاک کر دیا گیا۔ آپ کی وفات کا مادۂ تاریخ کسی نے کیا خوب کہا تھا۔ ع

پس چرا شد آفتاب اندر حجاب

اس مصرع سے سن وفات 1323 ہجری بر آمد ہوتا ہے ایک فاضل نے قرآن کریم کی اس آیت سے سن وفات بر آمد کیا تھا: فضلناک علی العالمین۔ مزار قصبہ دیوی شریف میں آج بھی مرجع خلائق ہے۔

Marfat.com

مولانا محمد یعقوبؒ

یہ تذکرہ ہے مولانا مملوک علی نانوتوی کے فرزندِ ارجمند حضرت شاہ عبدالغنی مجدّدی محدّث دہلوی کے شاگردِ رشید حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے خلیفۂ مجاز مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہم عصر، ہمدم و ہمراز اور شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے استاد حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمتہ کا............ جو اپنی ذات و سیرت میں بہت بڑے عالم، اعلیٰ درجے کے محدّث وفقیہہ، کامل شیخ اور صاحبِ کشف و کرامت بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ دارالعلوم دیوبند کے اوّلین شیخ الحدیث اور صدر مدرس تھے۔ روحانیات اور اخلاقِ عالیہ کا حسین و جمیل پیکر۔ سینے میں ایسا دلِ بیدار رکھنے والے جس میں حق تعالیٰ شانہٗ کی معرفت کے ہر آن چشمے ابلتے اور ان اولیائے کرام میں شامل جن کی نسبتِ ولایت پر کوئی شک و شبہے کی گنجائش نہ تھی، شریعت و طریقت کا ایسا امتزاج مولانا کی شخصیت میں تھا کہ اس کے نمونے خال خال اس دورِ زبوں حال میں دکھائی دیتے ہیں۔ مولانا کی پاکیزہ نورانی صورت ان کی سیرت پر شاہد تھی اور ان کی ولایت کیلئے کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔

مولانا صبر و رضا اور توکّل کی تصویر تھے۔ امراء سے میل ملاقات اور تعارف میں استغنا کی ایسی مثالیں بہت ہیں۔ امیر شاہ صاحب کی روایت ہے کہ مولانا یعقوب جن دنوں مراد آباد میں تھے تو میں اور حافظ عطاء اللہ صاحب چھتاری سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ نواب محمود علی خاں کی بڑی آرزو تھی کہ ایک مرتبہ مولانا یعقوب چھتاری تشریف لائیں، لیکن مولانا ٹال جایا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے بہت

Marfat.com

اصرار کیا۔ مولانا نے فرمایا: "ہم نے سنا ہے کہ جو مولوی نواب صاحب کے ہاں جاتا ہے' نواب صاحب اسے روپے دیتے ہیں۔ ہمیں وہ خود بلاتے ہیں' اس لئے شاید سو دو سو روپے زیادہ دیں۔ سو دو سو روپے ہمارے کے دن کے' وہاں جا کر مولویت کے نام پر دھبہ نہ لگائیں گے"

مولانا محمد یعقوب کا سلسلۂ نسب چھٹی پشت میں بانی دار العلوم دیوبند مولانا محمد قاسم اور سینتالیسویں پشت میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔ مولانا نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش 13 صفر 1240ھ مطابق 1831ء ہے۔ تاریخی نام منظور احمد رکھا گیا۔ مولانا کے اجداد میں سے قاضی مظہر الدین" کو سلطان سکندر لودھی نے 871ھ میں سمرقند سے ہندوستان طلب کیا تھا۔ دیگر عہدوں اور مناصب کے ساتھ ساتھ شہر دہلی کے عہدۂ قضا پر بھی مامور کیا۔ قاضی مظہر الدین کا مزار آج بھی دِلّی میں موجود ہے۔ ہندوؤں نے سرکشی کی تو سلطان سکندر لودھی نے قاضی مظہر الدّین کے ایک صاحبزادے قاضی میراں بڑے کو نانوتہ میں سکونت اختیار کرنے کا حکم دیا اور وہاں کا عہدۂ قضا مرحمت فرمایا۔ اسی زمانے سے یہ صدیقی خاندان نانوتہ میں ہمیشہ کیلئے بس گیا۔

مولانا یعقوب کی ابتدائی تعلیم اردو' فارسی' ناظرہ و حفظ قرآن کریم سب نانوتہ میں ہوئی۔ مولانا محمد قاسم آپ کے ہم مکتب تھے۔ بچپن ہی میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ خوش خطی میں بھی لیاقت حاصل کی اور بطور ہنر جلد بندی کا کام سیکھا۔

گیارہ سال کی عمر میں مولانا محمد یعقوب اپنے والد کے ساتھ دہلی روانہ ہوئے۔ مولانا محمد قاسم بھی اس سفر میں ساتھ تھے۔ دہلی پہنچتے ہی پڑھائی شروع ہو گئی۔ دہلی میں عربی نصاب کی تمام کتابیں جو معقولات اور منقولات پر مشتمل تھیں' اپنے والدِ محترم سے پڑھیں اور انہی نے دہلی کالج میں داخل کرایا۔ آپ کی تعلیم کا سلسلہ سات سال تک رہا۔ 1851ء میں مولانا مملوک علی وفات پا گئے۔ والد کے انتقال کے بعد بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس زمانے میں مولانا یعقوب چیلوں کے کوچے میں رہتے تھے۔ یہاں ایک مکان مولانا مملوک علی نے اپنی زندگی ہی میں خرید لیا تھا۔ حدیث کی کتابیں مولانا نے دہلی کے مشہور محدّث اور شیخ حضرت شاہ عبد الغنی مجدّدی اور مولانا احمد علی محدّث سہارنپوری سے پڑھیں۔ 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد مولانا محمد قاسم اور مولانا یعقوب جب پہلے حج سے واپس آئے تو نانوتہ میں قیام کے زمانے میں مولانا محمد قاسم سے قدرے بخاری شریف آپ نے پڑھی۔ میرٹھ کے دورانِ قیام میں صحیح مسلم بھی پڑھی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں مولانا کی پہلی شادی ہوئی۔ ان بیوی سے آپ کے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ یہ سب اولاد ایک بیٹے مولانا معین الدین کے سوا مولانا کی زندگی ہی میں داغِ مفارقت دے گئی۔ پہلی بیوی کا انتقال 1292ھ میں ہوا دوسرا نکاح ایک بیوہ خاتون سے کیا۔ اس نکاح میں دو باتیں اہم ہیں پہلی یہ کہ نکاح یکم محرم کو کر کے وہ بدعت توڑ دی گئی جس میں ماہِ محرّم کے دنوں میں لوگ شادی کو اچھا نہیں

Marfat.com

سمجھتے تھے۔ دوسری یہ کہ شیخ زادوں اور بڑی قوم کے مسلمانوں میں عورت کے دوسرے نکاح کو اسی طرح مذموم اور قبیح سمجھا جاتا جیسا ہندوؤں میں۔ مولانا محمد یعقوب اور بیوہ کے وارثوں نے یہ رسم بھی توڑ کر دکھا دی۔ ان دوسری زوجہ کا بھی آٹھ برس بعد انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد مولانا نے تیسرا نکاح کیا۔ ایک دو کے سوا مولانا کی کوئی اولاد زندہ نہ رہی۔ تمام بچوں کو اپنے ہاتھوں سے دفنایا۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی روایت ہے کہ مولانا کے 24 برس کے کڑیل جوان صاحبزادے حافظ علاؤالدین کا انتقال خاص بقرعید کے روز ہوا۔ نماز سے پہلے ان کی حالت بہت غیر تھی۔ جب نماز کا وقت آیا تو مولانا یعقوب یہ کہہ کر کہ اللہ کے سپرد اللہ خاتمہ بالخیر کرے' نماز میں پہنچ گئے اور اس میں دیر نہ کی۔ مولانا صبر و استقلال کا کوہِ گراں تھے۔

مولانا محمد یعقوب پر اٹھارہ برس کی عمر ہی میں ایک بڑے کنبے کی خبر گیری اور معاش کا بوجھ آن پڑا تھا۔ دہلی کالج کی سند مولانا کے پاس تھی جو اس زمانے میں اچھی سے اچھی ملازمت کے حصول کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی چنانچہ مولانا کو اجمیر میں تیس روپے ماہانہ کی ملازمت گورنمنٹ کالج میں مل گئی۔ وہاں کا انگریز پرنسپل آپ کی صلاحیتیں اور علم و فضل دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے کہا: ''حقیقتاً مولوی تو بہت اچھا ہے' مگر نوعمر و کم سن ہے''

پانچ برس تک مولانا اجمیر میں رہے۔ یہاں مولانا نے بڑی ترقی کی اور بہت جلد مدرّس اول بن گئے۔ فرائض منصبی نہایت خوش اسلوبی' دیانت اور محنت سے سرانجام دیتے اور اوقات کی پابندی کا بڑا لحاظ رکھتے۔ سہارنپور میں جب ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ خالی ہوا تو انگریز پرنسپل کی سفارش پر حکومت نے ان کا تقرّر کر دیا۔ پرنسپل نے خوش خوش مولانا کو اطلاع کی لیکن آپ نے یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا میں محکمہ تعلیم سے الگ ہونا پسند نہیں کرتا۔ میں اپنے اسی منصب پر قانع اور خوش ہوں۔ کچھ عرصے بعد آپ کی تنخواہ سو روپے ماہانہ ہو گئی اور بنارس تبادلہ کر دیا گیا۔ بنارس سے تبادلہ رڑکی کا ہوا اور وہاں سے ڈیڑھ سو روپے کی تنخواہ پر ڈپٹی انسپکٹری پر سہارنپور تشریف لائے۔ اتنے میں 1857ء کا انقلاب نمودار ہو گیا۔ سہارنپور سے آپ کو مولانا محمد قاسم صاحب نانوتہ لے آئے۔ مولانا یعقوب کا بیان ہے:

''اسی عرصے میں غدر ہو گیا۔ بعد رمضان مولانا قاسم صاحب احقر کو لینے سہارنپور آئے۔ چند آدمی وطن کے ان کے ساتھ تھے۔ اس وقت بغیر ہتھیار کے چلنا دشوار تھا'' ۔ نانوتہ میں قیام کے دوران میں انہوں نے مولانا محمد قاسم سے بخاری شریف پڑھی اور نشانہ بازی کی مشق کی۔ اس کے بعد شاملی میں انگریزوں سے جنگ ہوئی' مگر مولانا محمد یعقوب کے شریک ہونے کا پتہ نہیں چلتا: تاہم حاجی امداد اللہ' مولانا گنگوہی اور مولانا محمد قاسم کی پکڑ دھکڑ' داروگیر اور عام مسلمانوں کے قتل و غارت کے باعث مولانا کو انگریز حکومت سے سخت نفرت ہو گئی۔ مولانا کے بھتیجے حکیم عشرتی کا بیان ہے کہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد آپ کو چھ ماہ کی تنخواہ نو سو روپے یک مشت بھیجی گئی اور ڈیوٹی پر دوبارہ طلب کئے گئے مگر آپ نے وہ نو سو روپے واپس کر دیئے اور کہا کہ میں نے ان چھ مہینوں میں سرکار کا کچھ کام انجام نہیں دیا' اس لئے میں یہ روپیہ نہیں لے سکتا اور

Marfat.com

نہ اب میں سرکاری ملازمت کرنا چاہتا ہوں۔ ملازمت ترک کر دینے کے بعد دسمبر 1861ء تک کا عرصہ زیاراتِ حرمین شریفین میں گزارا۔

ایک سال بعد آپ وطن واپس آئے۔ میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں مولانا محمد قاسم صاحب پہلے سے موجود تھے۔ انہیں منشی صاحب نے پرانی دوستی کے سبب اپنے پاس بلا لیا تھا اور تصحیح کتب کی خدمت ان کے سپرد کی تھی۔ یہ خدمت برائے نام تھی۔ ان کا مقصود دراصل مولانا قاسم کو اپنے پاس رکھنا تھا۔ مولانا یعقوب کا ارشاد ہے: "احقر اسی زمانے میں بریلی اور لکھنؤ ہو کر میرٹھ کے اس چھاپہ خانے میں نوکر ہو گیا۔ منشی جی حج کو گئے تھے۔ اس وقت ایک جماعت نے مولانا قاسم سے مسلم شریف پڑھی۔ احقر بھی اس میں شریک رہا۔ یہ وہی زمانہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی۔"

مدرسہ قائم ہوتے ہی مولانا محمد قاسم صاحب نے ابتدائی مدرّس کے طور پر مُلّا محمود صاحب دیوبندی کو مقرر فرمایا۔ ان کی تنخواہ پندرہ روپے ماہانہ مقرر کی گئی، لیکن پہلے ہی سال جب طلبہ کی تعداد بڑھ گئی تو مولانا قاسم نے مولانا یعقوب صاحب کو دارالعلوم دیوبند کا صدر مدرّس تجویز کر کے میرٹھ سے بھیجا۔ ابتدائی تنخواہ تیس روپے ماہانہ طے پائی تھی۔ مولانا یعقوب کو ہر چند کئی مقامات سے گراں قدر مشاہرے پر طلب کیا جا رہا تھا، لیکن انہوں نے کچھ التفات نہ فرمایا اور تیس روپے کی تنخواہ بڑی خوشی سے قبول فرمائی۔ ایثار اور دنیا سے بے تعلقی کی یہ نادر مثال ہے۔ ملازمت کے دوران بھی برابر مختلف جگہوں سے بڑی بڑی تنخواہوں پر مولانا کو مسلسل بلایا جاتا رہا۔ بھوپال کے مدارالمہام مولانا جمال الدین نے تین سو روپے ماہانہ پر بھوپال تشریف لانے کی درخواست کی، لیکن آپ نے کبھی ادھر کا رخ نہ کیا اور مدرسہ دیوبند کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ للّٰہیت اور خلوص کا یہ عالم تھا کہ محرم 1301ھ سے تنخواہ بند کر دی اور پھر وفات تک مدرسے سے ایک پیسہ تنخواہ کے نام پر نہیں لیا۔ معاش کے لئے آپ نے ایک دکان کھولنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا، مگر یہ پردۂ اخفا میں ہے کہ دکان کب کھلی اور اس پر کام کون کرتا تھا۔ غالبًا چند حضرات نے مشترک سرمائے سے کوئی دکان کھولی تھی۔ اس میں مولانا بھی شریک تھے۔ اس کا نام اسلامی دکان رکھا گیا اور یہاں کپڑا فروخت ہوتا تھا۔

دارالعلوم میں درس کے علاوہ فتویٰ نویسی، انتظامی امور اور سالانہ جلسوں میں تقریریں بھی کیا کرتے تھے۔ معقولات اور منقولات دونوں علوم کی تعلیم دیتے۔ آپ کے تلامذہ کی کثیر تعداد ایسی ہے جس نے آگے چل کر اپنے اپنے دوائر میں بہت نام پیدا کیا اور دین و سیاست میں وقیع خدمات انجام دیں۔ ان تلامذہ میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد حسن امروہی، مولانا فخر الحسن گنگوہی مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی وغیرہم نمایاں ہیں۔

مولانا اشرف علی تھانوی فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد یعقوب کا حلقۂ درس کیا ہوتا تھا، حلقۂ توجہ ہوتا تھا۔ یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے، آیات کا مطلب بیان فرما رہے ہیں اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری

Marfat.com

ہیں۔ یہی حال طلبہ کا ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ہم نے چاہا کہ مولانا سے مثنوی مولانا روم پڑھیں۔ مہتمم مدرسہ مولانا رفیع الدین تک بات پہنچی تو سختی سے منع فرمایا اور ہم سے کہا کہ مولانا محمد یعقوب کو تم لوگ مدرسہ میں بیٹھنے دو گے یا نہیں ؟ اگر مثنوی پڑھانے لگے تو جنگلوں کو نکل جائیں گے' آگ بھڑک اٹھے گی۔

مولانا کی طبیعت میں ذوق وشوق اور سوزو گداز بہت تھا۔ اجمیر کے زمانۂ قیام میں ایک مرتبہ صبح کی نماز کو تشریف لا رہے تھے راستے میں بھڑبھونجے دھان کوٹ رہے تھے۔ دھان کوٹنے کی آواز کان میں آئی اور مولانا کو وہیں وجد ہو گیا۔ ایک بار دیوبند چھتہ کی مسجد میں وضو کر رہے تھے کہ کسی جانب سے غمزدہ عورت کے رونے کی آواز آئی بس وہیں وضو کرتے کرتے اس غمزدہ کے گریہ سے مولانا کی حالت متغیّر ہو گئی۔

مولانا ماہانہ امتحان کے عادی نہ تھے۔ مہینہ ختم ہوتا تو امتحان کا پرچہ منگا کر بلا امتحان ہی سب کے نمبر لکھ دیتے تھے۔ ایک طالب علم نے عرض کیا کہ حضرت بلا امتحان ہی نمبر لکھ دیتے ہیں۔ فرمایا: "مجھے سب کی لیاقت معلوم ہے اگر کہو تو لاؤ سب کا امتحان لے لوں ؟ یاد رکھو! اس سے کم ہی نمبر آئیں گے۔"

مولانا کو دوسرے حج کی سعادت 1876ء میں ملی۔ اس حج میں علماء کا ایک قافلہ ہندوستان سے روانہ ہوا تھا جس میں بڑے جلیل القدر حضرات شامل تھے۔ مولانا محمد یعقوب نے ان کی تعداد اٹھارہ سے لے کر بیس تک بتائی ہے۔ ان میں مولانا محمد قاسم نانوتوی' حکیم ضیاء الدین' مولانا محمد مظہر' مولانا محمد یعقوب' مولانا رفیع الدین مہتمم دار العلوم دیوبند' مولانا محمود حسن صاحب' مولانا محمد منیر نانوتوی' مولوی احمد حسن کانپوری ایسے مشاہیر بھی شامل تھے۔ قافلۂ سالار مولانا رشید احمد گنگوہی تھے۔ اس سال ترکی اور روس میں جنگ چھڑی ہوئی تھی عوام کے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ حضرات دینی معاونت کیلئے سفر حجاز کے حیلے سے حقیقت میں ترکی کا سفر کر رہے ہیں تاکہ رضا کاروں میں شامل ہو کر مجاہد فی سبیل اللہ بنیں اور ترکی کی طرف سے روس کے خلاف جنگ میں شریک ہوں۔ مکّہ معظمہ پہنچ کر یہ سب حضرات حاجی امداد اللہ صاحب کے ہاں رباط میں ٹھہرے۔

مولانا کو اپنے پیرو مرشد حضرت حاجی صاحب سے نہایت الفت تھی اور یہ الفت بڑھ کر عشق کے درجے میں داخل ہو گئی تھی۔ اس دور میں حاجی صاحب مے خانۂ روحانی کے جلیل القدر ساقی تھے۔ معرفت اور سلوک میں ان کا مقام بہت اونچا تھا اور صاحبِ کشف و کرامات اولیاء اللہ میں سے تھے۔ عوام و خواص میں سے تقریباً سو علماء نے حضرت حاجی صاحب کے دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی۔ مولانا یعقوب کے بچپن کے دوستوں مولانا محمد قاسم اور مولانا رشید احمد گنگوہی نے جب حاجی صاحب کا دامن تھاما' تو مولانا خود کب پیچھے رہ سکتے تھے۔ انہوں نے بھی بیعت کا شرف حاصل کیا۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کا بیان ہے کہ مولانا یعقوب فطری طور پر نفس کی کدورتوں سے پاک تھے اس لئے منازل سلوک طے کرنے میں انہیں بڑے مجاہدوں کی ضرورت پیش نہ آئی۔ حاجی صاحب بھی ان کو زیادہ ذکر و شغل اور عبادت میں نہیں رکھتے تھے بلکہ ناز برداری سے تربیّت فرماتے تھے۔ شیخ کامل ہونے

Marfat.com

کے باوجود مولانا اپنے آپ کو آخروقت تک ادھورا ہی سمجھتے رہے۔ فرماتے تھے: "ہر چند کہ بظاہر توبہ کی اور مرشد العالم حاجی صاحب مدظلہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا مگر اصلی بات کہاں بدلتی ہے ویسے کا ویسا ہی رہا" حاجی صاحب کی ان پر شفقت کا یہ عالم تھا کہ بیعت کے چند برس بعد ہی 1282ھ میں خلافت عطا فرما دی تھی۔

اپنے پیر بھائیوں کی نگاہ میں بھی مولانا کا بڑا مرتبہ تھا اور سب احترام سے پیش آتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا یعقوب گنگوہ تشریف لے گئے۔ مغرب کی جماعت تیار تھی اور مولانا رشید احمد گنگوہی امامت کیلئے مصلے پر پہنچ گئے تھے، لیکن انہوں نے جونہی مولانا یعقوب کو دیکھا فوراً پیچھے آ گئے اور مولانا کو امام بنایا۔ مولانا یعقوب چونکہ سفر سے آ رہے تھے اور پیروں پر دھول جمی ہوئی تھی اس لئے مولانا گنگوہی نے رومال لے کر آپ کے پاؤں جھاڑنا شروع کئے۔ مولانا یعقوب اطمینان سے کھڑے تسبیح پڑھتے رہے اور ذرا جنبش نہ کھائی مولانا کا باطن آئینے کی طرح صاف شفاف تھا اور تقویٰ کی چمک دمک اس باطنی آئینے میں صاف نظر آتی تھی۔ مولانا اس کا بڑا اہتمام رکھتے تھے کہ کوئی ناجائز غذا معدے میں نہ جائے۔ ایسی غذا سے فوراً طبیعت متغیر ہو جاتی اور اعمالِ صالح سے دل دور ہونے لگتا۔ مولانا فرماتے ہیں ایک مرتبہ کسی رئیس کے ہاں سے لڈو آئے ان میں سے ایک لڈو میں نے کھا لیا اس کا کھانا تھا کہ قلب میں سخت ظلمت پیدا ہوئی اور نت نئے شیطانی وسوسے اس کثرت سے نمودار ہونے لگے کہ میں پریشان ہو گیا۔ اسی حالت میں ایک مہینہ گزر گیا میں روتا تھا اور توبہ کرتا تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ہو گیا۔ آخر اللہ نے اس مرض سے نجات دی۔

مولانا کو حُسنِ خاتمہ کی بڑی فکر تھی۔ ہر آن اسی میں غلطاں و پیچاں رہتے اور دوسروں سے بھی ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک دوست کو خط میں کس حسرت سے لکھتے ہیں: "مدار ساری عمر کا خاتمے پر ہے دیکھئے اس وقت کیا رنگ ہو خاتمے کے ڈر سے جگر آب اور سب حال خوب خراب ہے۔ ساری عمر کا کیا کرایا ایک آن بھر میں اکارت ہو جاتا ہے۔ جو اس معرکے سے ایمان سلامت لے گیا اس کو مبارکباد اور سو مبارک باد۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کو نجات پا گیا۔ اس کا کیا کہنا ہے۔"

مولانا محمد یعقوب صاحب کی تقریر نہایت علمی اور دقیق ہوتی تھی اور ان کے ہاں اتنے علوم تھے کہ سبحان اللہ۔ تقریر سن کر معلوم ہوتا تھا کہ ایک کتب خانہ کھول دیا ہے۔ اس علم و فضل کے باوجود مزاج میں اتنا انکسار تھا کہ جہاں کسی بات میں شبہ ہوتا ماتحت مدرّسوں سے بلا تکلف پوچھ لیتے تھے۔ اس تبحّر اور کمال کے باوصف حضرت مولانا رشید گنگوہی کو اپنے مرشد کی جگہ مانتے تھے اور حاجی امداد اللہ صاحب کی وفات کے بعد ان سے اپنی اصلاح کے متمنّی تھے لیکن جب غصہ آتا تھا تو ناز میں مولانا رشید احمد کو بھی بہت کچھ کہہ ڈالتے۔

مولانا کو ان کے پیرو مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے مسند خلافت عطا فرمائی تھی اور حکم دیا تھا کہ جو شخص تم سے اللہ کا نام پوچھنا چاہئے بے دریغ بیعت کر لینا چنانچہ اپنے آپ کو ناکارہ و نامکمل سمجھنے کے

Marfat.com

باوجود مولانا اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں بیعت کی درخواست بہت کم رد فرماتے۔ انہوں نے اپنے مریدوں کی اصلاحِ نفس اور تربیت کیلئے جو تعلیم دی ہے وہ بہت بااثر اور مفید ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں علم و معرفت اور حقائق و معانی کے دریا بند کر دیئے ہیں۔ مولانا نے اپنے مرید صفا کیش منشی محمد قاسم نیانگری کو اصلاح وہدایت کے سلسلے میں مختلف مواقع پر مکتوب لکھے تھے۔ انہی مکتوبات میں سے بعض کا خلاصہ چند چند سطوروں میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے اندزہ ہوگا کہ مولانا اپنے متبعین کو جو تعلیم دیتے تھے وہ عین قرآن اور حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق تھی۔

"مناسب ہے کہ ہرروز ایک وقت متعین پر موت کو یاد کر لیا کرو۔ اس طرح کہ موت کا نقشہ جی پر جم جائے اور زیارت قبور وقت بے وقت کرتے رہو اور عوام مومنین کے مقابر میں بھی کبھی کبھی جا کر ان کو فاتحہ اور ثواب سے یاد کیا کرو"

تم جانتے ہو علم اور شے ہے عمل اور شے علم سے عمل کے بغیر کچھ حاصل نہیں۔ خاص کر جب علم بھی ناتمام اور ناقص ہو تو سراسر بے کار ہے۔ شیخ کامل اور اصل کے بغیر سلوک بھی بے کار ہے"

"آدمی فکرِ آخرت کرے اور لوگوں کے جھگڑوں کو انہی کے سپرد کر دے۔ مسافر راہ گیر کو کسی کے جھگڑے تحقیق وتفتیش اور حق وباطل کے مقدمات سے کیا کام؟ مسافر کا کام یہ ہے کہ اپنی راہ لگے اور راہِ حق واضح ہے۔ جہاں اشتباہ ہو تحقیق کرے۔ راستہ چلے بغیر قطع نہیں ہوتا۔"

"برادر عزیز، موت نہایت سخت چیز ہے اور آدمی اس سے نہایت غافل اور بڑا بے پرواہ بڑی بات یہ ہے کہ آدمی جب دنیا سے اٹھے، اپنے مالک سے غافل نہ ہو۔ اگر گنہگار شرمندہ ہے کچھ خوف نہیں خدانخواستہ اگر مال و منالِ کی حسرت یا اہل وعیال کی محبت یا اپنے بیگانوں کے رنج مفارقت میں دم آخر ہوا تو حسرت کی جگہ ہے اور کمالِ خوف ہے۔"

"ذکرِ الٰہی کیلئے شکم سیر ہو کر کھانا مضر ہے اور یوں بھی صحت کے لئے مفید نہیں۔ ذکرِ الٰہی کے لئے کم خوری نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ زیادہ کھانے سے نفس موٹا اور کاہل ہو جاتا ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ آدھی بھوک کھائے اور آدھا پیٹ خالی رکھے۔ آدمی پہلے اپنی خوراک کا اندازہ کرے اور پھر اسی حساب سے کم کر دے۔"

"انسان جس قدر لوگوں سے ادھر ادھر کی باتوں میں وقت گزارتا ہے صوفیاؒ کے نزدیک وہ وقت ضائع کرتا ہے ذاکروشاغل کو چاہئے کہ بغیر ضرورت کسی سے نہ ملے اور دوستوں سے ملنا اور جس سے جی، دین کی طرف متوجہ ہو والدین اور اہل وعیال سے ملنا یہ ضروریات میں داخل ہے، مگر اتنا نہیں کہ طلب میں خلل ڈالے اور دنیاوی یا دینی کام کا حرج ہو ایسے لوگ جن کی ملاقات سے دنیا کی رغبت دل میں پیدا ہو ان سے نہ ملنا بہتر ہے۔"

دنیا کا کاروبار آدمی اس لئے کرے کہ اس کے ہاتھ پاؤں بے کار نہیں۔ ان سے محنت کرے اور

Marfat.com

والدین کی خدمت اور اہل وعیال کا نفقہ حاصل کرے۔ لیکن اتنا نہیں کہ بس دنیا ہی کا ہو رہے۔ یہ علامت غفلت کی ہے اور اگر نیت پہلی صورت کی ہے تو دنیا کی مشغولیت دین ہی میں شمار ہو گی بلکہ کھانا پینا بھی اسی نیت سے کرے کہ یہ حکم خداوندی ہے۔

"تم چند مالداروں سے مل کر پوچھ لو' وہ تم سے زیادہ اپنی حاجات بیان کریں گے کہ پوری نہیں ہوتیں اور انہی کے غم میں دن رات گھلے جاتے ہیں اور لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بے چارے بہت راحت میں ہیں۔ راحت انشاء اللہ تعالیٰ جنّت میں ملے گی۔ دنیا تو کشاکشی کی جگہ ہے' یہاں راحت کہاں؟"

مولانا رحمۃ اللہ علیہ طبیبِ روحانی ہونے کے علاوہ طبیبِ جسمانی بھی تھے۔ آپ کے نسخوں کی بیاض کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اپنے زمانے کے حاذق طبیب تھے اور مریض کا بہت کامیابی سے علاج معالجہ کرتے تھے یہاں تک کہ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے مرضِ وفات میں بھی مولانا یعقوب نے علاج کی خدمات انجام دی ہیں۔ عمدہ عمدہ مجرب نسخوں کی تلاش میں رہتے اور جہاں کوئی اچھا نسخہ دیکھ پاتے' اسے اپنی بیاض میں درج کر لیتے' لیکن علاج کے نام پر کسی سے ایک پیسہ لینے کے روادار نہ تھے۔ محض مخلوقِ خدا کے فائدے کے لئے علمِ طب حاصل کیا تھا۔

مولانا کی سیرت میں تزکیۂ نفس' سلوک و معرفت' شوق و ذوق' زہد و اطاعت اور ذکر و شغل کے ساتھ جو صفت نمایاں دکھائی دیتی ہے' وہ ان کے اعلیٰ درجے کے اخلاق' سادگی اور بہترین عادات ہیں۔ یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ان کی زندگی ہی میں اولاد سمیت گھر کے چودہ افراد وفات پا چکے تھے اور یہ موتیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے آگے پیچھے واقع ہوئی تھیں' لیکن مولانا بڑے صابر تھے کبھی نہ روئے' نہ بے صبری اور شکایت کی بات زبان سے نکالی مولانا تھانوی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ تنہائی میں بیٹھے ہوئے میں نے سنا کہ یہ شعر پڑھ رہے تھے اور آواز بھرائی ہوئی تھی۔

جزُ بہ تسلیم و رضا کو چارۂ
در کفِ شیرِ نرِ خوں خوارۂ

سادگی اور بے تکلفی کی تصویر تھے۔ ایک بار گنگوہ تشریف لائے۔ مولانا کے پاجامے میں کمر بند کی بجائے بان پڑا ہوا تھا۔ مولانا گنگوہی نے پوچھا: "یہ بان کیوں ڈلا ہے؟" جواب دیا: "کمر بند تلاش کیا مگر اس وقت نہیں ملا' اس لئے بان ڈال لیا۔ مولانا گنگوہی نے کہا: اچھا میرا کمر بند الگنی میں پڑا ہے' وہ ڈال لو۔ مولانا یعقوب نے کسی پس و پیش کے بغیر الگنی سے کمر بند کھول لیا' دیکھا کہ اس میں ایک روپیہ بندھا ہوا ہے۔ مولانا گنگوہی سے کہنے لگے کہ اس میں تو روپیہ بندھا ہوا ہے۔ حضرت نے فرمایا: "روپے سمیت کمر بند آپ کی نذر ہے' چنانچہ مولانا محمد یعقوب نے روپیہ لے لیا اور کمر بند پاجامے میں بلا تکلف ڈال لیا۔

ایک مرتبہ مولانا کو نانوتہ جانے کیلئے کوئی سواری نہ ملی اور پیدل جانے کو طبیعت آمادہ نہ ہوئی۔ کسی نے اپنا گدھا پیش کیا کہ مولانا اس پر سوار ہو کر چلے جایئے۔ کوئی اور ہوتا تو اس پیشکش پر چین بجبیں ہوتا' مگر

Marfat.com

مولانا ایسے بے نفس تھے کہ بڑی خوشی سے گدھے پر سوار ہوئے' اسی پر اپنی کتابیں لادیں اور نانوتہ چل دیئے۔ مولانا تھانوی کی روایت ہے کہ مولانا یعقوب میں یہ بات دیکھی کہ ادنیٰ سے طالب علم نے اگر کوئی غلطی بتادی تو فوراً اقرار کر لیتے ہاں بھائی' میری غلطی تھی۔ اپنے ماتحت مدرّسین کے پاس کتاب لے کر جا بیٹھتے تھے اور جو بات سمجھ میں نہ آتی تھی' بے تکلف پوچھ لیتے تھے' ابنی مشیخت اور علم و فضل کے گھمنڈ میں گرفتار نہ تھے اس سادگی کے ساتھ حد درجہ نفاست پسند' خوش پوشاک' نازک مزاج اور نازک بدن تھے اور حسین ایسے کہ معلوم ہوتا شہزادے ہیں۔

مولانا تھانوی کا بیان ہے کہ مجھے اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد ہے جب حضرت مولانا محمد یعقوب درجے میں تشریف لاتے' تو ہم سب طالب علم ادب سے اٹھ کھڑے ہوتے۔ ایک روز مولانا نے فرمایا: "تم لوگ کھڑے مت ہوا کرو۔ اس سے مجھے تکلیف ہوتی ہے"

مولانا دارالعلوم کے مختلف مشاغل میں ہمہ تن مصروف رہتے' اس لئے عزیزوں' رشتہ داروں اور احباب کے خطوں کا جواب دینے میں اکثر تاخیر ہو جاتی۔ کئی کئی دن ایسے خط جیب میں پڑے رہتے اور جواب لکھنے کی نوبت نہ آتی۔ یہاں تک کہ ایک آدھ خط بھی گم ہو جاتا' پھر مولانا سخت پریشان ہو کر سوچتے کہ اس خط میں کون کون سی باتیں جواب طلب تھیں اپنی بے مثال قوتِ حافظہ کو کام میں لاتے ہوئے جواب تحریر فرماتے۔ تحریر صاف ستھری' رواں سلیس اور جامع ہوتی۔ مولانا کی تحریر میں ایک خوبی ایسی ملتی ہے جو شاذ و نادر ہی بڑے سے بڑے ادیب اور نثر نگار کے ہاں ملے گی اور وہ ہے بلاغت فنِ بلاغت کا شاہکار مولانا کی ایک چھوٹی سی کتاب "سوانح قاسمی" ہے۔ یہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حالات پر تیس چالیس صفوں کا رسالہ ہے جو مولانا نانوتوی کی وفات کے بعد انہوں نے لکھا تھا۔ اس چھوٹی سی کتاب میں مولانا محمد قاسم کی زندگی' ان کے علمی' دینی اور سیاسی کارناموں کو اس انداز میں قلم بند کیا ہے کہ وجدان بے اختیار عش عش کرنے لگتا ہے۔ اسی کتاب کو دیکھ کر مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے اپنی گراں قدر تصنیف "سوانح قاسمی" کو ڈھائی ضخیم جلدوں میں پھیلایا ہے۔ 1857ء کے انقلاب میں مولانا محمد قاسم نے بھی حصہ لیا تھا۔ ان کی جرأت و بےباکی اور جوشِ جہاد کا تذکرہ مولانا محمد یعقوب نے "سوانح قاسمی" میں کیا ہے۔ نثر کا یہ مختصر سا نمونہ ملاحظہ فرمایئے۔ :

اس طوفانِ بدتمیزی سے سب لوگ گھبراتے تھے' لیکن ہم نے مولانا قاسم کو کبھی گھبراتے نہیں دیکھا۔ خبروں کا اس وقت چرچا تھا جھوٹی سچی ہزاروں گپ شپ اڑا کرتی تھیں' مگر مولوی صاحب اپنے معمولی کام بدستور انجام فرماتے تھے۔ چند بار مفسدوں سے مقابلے کی نوبت آ گئی۔ اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم کہ تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں سے مقابلہ۔ ایک بار گولی چل رہی تھی' یکایک سر پکڑ کر بیٹھ رہے۔ جس نے دیکھا جانا گولی لگی ہے۔ ایک بھائی دوڑے پوچھا: "کیا ہوا؟" فرمایا: "سر میں گولی لگی" عمامہ اتار کر سر جو دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ کہ خون سے سارے کپڑے تر'

Marfat.com

مگر حفاظت الٰہی سر پر تھی ' کچھ اثر نہ ہوا۔ اس زخم کی خبر بعض دشمنوں نے جو سنی تو سرکار میں مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں شریک تھے ' حالانکہ مولانا فسادوں سے دور تھے ملک و مال کے جھگڑے اگر سر رکھتے ' تو یہ صورت ہی کیوں ہوتی ' کہیں کے ڈپٹی یا صدر الصدور ہوتے "

اردو نثر کی طرح مولانا بے تکلف فارسی نظم و نثر اور عربی نظم و نثر پر بھی خوب قادر تھے۔ ان کے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے فنِ تصوّف میں ایک معرکتہ الآراء کتاب تحریر فرمائی تھی جس کا نام ضیاء القلوب تھا۔ یہ فارسی زبان میں تھی۔ اور حاجی صاحب کے حکم پر مولانا محمد یعقوب نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا 'لیکن افسوس کہ یہ ترجمہ طبع نہ ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا یعقوب سے اپنی کتاب ترجمہ خود حاجی صاحب نے کرایا ہو گا تاکہ ان کے بے شمار عرب مرید بھی اس کتاب سے استفادہ کر سکیں۔ حاجی صاحب علیہ الرحمتہ کا قیام مستقل طور پر مکّہ معظمہ میں تھا اور وہاں اکثر لوگ آپ سے بیعت ہوئے تھے ' اس لئے یہ عربی ترجمہ ضروری سمجھا گیا۔ اس ترجمے کے علاوہ مولانا کے بعض مکاتیب کا عمدہ مجموعہ بھی موجود ہے جو انہوں نے اپنے مرید منشی محمد قاسم صاحب نیانگری کو تربیت سلوک کے سلسلے میں تحریر فرمائے تھے۔ ان مکتوبات کے دیباچے میں مولانا یعقوب کے بھتیجے حکیم امیر احمد عشرتی لکھتے ہیں: "ہر ایک خط بجائے خود دفترِ معرفت کر د گار ہے۔ ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف قندِ مکرر کا حکم رکھتا ہے " ۔ ان خطوں میں سے چیدہ چیدہ عبارتوں کے نمونے ہم اوپر درج کر آئے ہیں۔ مولانا یعقوب کو مطالعے کا بہت شوق تھا۔ ان کے شاگردِ رشید مولانا تھانوی کی روایت ہے کہ ایک دفعہ مولانا یعقوب نے فرمایا: "میں نے اب تک کم از کم ایک ہزار کتابیں تو مختلف علوم و فنون کی ضرور پڑھی ہوں گی " ۔ اس دور میں جبکہ علمی اور دینی کتابوں کی اشاعت اتنی عام نہ تھی ' اتنی بڑی تعداد میں کتب کا مولانا کے مطالعے سے گزر جانا حیرت انگیز بات ہے اور اسی سے ان کے علم و فضل کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مولانا محمد یعقوب نے بھی مولانا محمد قاسم کی طرح زیادہ لمبی عمر نہ پائی۔ دیوبند میں ہیضے کی وبا نازل ہوئی ' تو مولانا کے گھر میں چودہ افراد لقمہ اجل ہوئے مولانا نے آسمان کی طرف دیکھ کر ایک عالمِ جذب میں کہا تھا کہ کیا میری باری ابھی نہیں آئی 'لیکن مولانا کی باری واقعی آ چکی تھی ' آپ دیوبند سے اپنے وطن نانوتہ تشریف لے گئے اور وہیں ایک شب ہیضے کا حملہ آپ پر ہوا۔ کوئی دوا اور علاج کام نہ آیا اور آپ عشاء کی نماز کے بعد 3 ربیع الاول 1302ھ مطابق 1884ء رات ایک بجے اپنے پروردگار سے جا ملے۔ تدفین نانوتہ کے شمال میں واقع باغ نو کے اندر عمل میں آئی۔ یہ باغ مولانا کے فرزند ارجمند معین الدین نے اپنے ہاتھ سے لگا تھا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون " وفات کے وقت مولانا کی عمر 49 برس اور 14 دن تھی۔

Marfat.com

مولانا اشرف علی تھانویؒ (1)

تھانہ بھون .... ممالک متحدہ آگرہ واودھ کا ایک مشہور و معروف مردم خیز تاریخی قصبہ..... جو ضلع مظفر نگر میں واقع ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکمرانی سے پہلے اسے ہندو راجہ بھیم نے اپنے نام پر بسایا تھا اور قدیم تاریخوں میں اس کا نام تھانہ بھیم درج ہے۔ کثرتِ استعمال سے تھانہ بھون ہو گیا۔ جب یہاں مسلمان آن کر آباد ہوئے تو شرفائے قصبہ کے بعض اجداد نے اپنے ایک فرزند فتح محمدؒ کے نام پر اس کا نام محمد پور رکھا۔ یہ نام شاہی دور کے کاغذات میں ملتا ہے لیکن عام طور پر پرانا نام تھانہ بھون ہی مشور رہا۔ جنگِ آزادی 1857ء سے بہت پہلے اس قصبے کی آبادی اڑتالیس ہزار کی تھی پھر گھٹ کر چھتیں ہزار رہ گئی۔ محرم 1274ھ میں یہاں بھی جنگِ آزادی (غدر) کا اثر پہنچا تھا اور قصبے کو خاصا نقصان ہوا اس حادثے کی تاریخ مولانا اشرف علی تھانوی نے کیا خوب نکالی تھی یعنی خرابیٔ تھانہ...... گھٹتے گھٹتے آخر اس کی آبادی تقسیمِ ہند سے بھی کئی برس پہلے تک چھ سات ہزار رہ گئی۔

تھانہ بھون میں ہمیشہ مسلمان شرفاؒ بالخصوص شیوخ فاروقی النسل صاحبِ اقتدارؒ صاحبِ جائیداد رہے ہیں اور اگرچہ گردشِ لیل و نہار کے باعث تمول رخصت ہو کر افلاس غالب آگیا' تاہم ذی اقتدار ہستیاں اب بھی موجود ہیں مختلف علوم و فنون کے اہلِ کمال بھی بے شمار گزرے ہیں زمانۂ شاہی میں بڑے بڑے منصب دار جاگیر دار بھی تھے تھانہ بھون کے عقلاء خاص طور پر مشہور رہے ہیں چنانچہ ایک انگریز افسرِ بندوبست نے اپنی رپورٹ میں مختلف قصبات کے باشندوں کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے تھانہ

Marfat.com

بھون کے باشندوں کو "عاقلانِ تھانہ" لکھا تھا۔ گردونواح میں مسلمان شرفا کے بڑے بڑے قصبے ہیں مثلاً دیوبند، گنگوہ، کیرانہ، جھنجھانہ، کاندھلہ ، پانی پت وغیرہ جتنی دین داری اور جتنا علمِ دین کا چرچا ان اطراف میں ہے اتنا اور کہیں نہیں دیکھا گیا اور جس کثرت سے بڑے بڑے علماء، فضلاء اور مشائخ اس حصے میں گزرے ہیں اتنے اور کہیں نہیں گزرے۔ قنوج کے ایک دیندار بزرگ شیخ معشوق علی صاحب نے کیا خوب فرمایا تھا کہ ان اطراف کے لوگ ہماری طرف کے لوگوں سے ہر بات میں بڑھے ہوئے ہیں چنانچہ یہاں کا عالم وہاں کے عالم سے اچھا یہاں کا جاہل وہاں کے جاہل سے اچھا، حتیٰ کہ یہاں کا کافر وہاں کے کافر سے اچھا۔

شیوخ تھانہ بھون حضرت شیخ مجدد الف ثانی، حضرت شیخ جلال الدین، تھانیسری، حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر، یہ سب سلطان شہاب الدین المقلب بہ فرخ شاہ کابلی کی اولاد میں سے ہیں جو اولیائے کاملین میں شمار ہوتے ہیں اور سلوکِ صوفیہ سے پہلے والیٔ کابل رہے ہیں۔ سلطنتِ غزنویہ کے زوال کے بعد آپ کابل سے خروج کر کے کئی بار بڑی فوج کے ساتھ اسلام کی اشاعت اور کفّار کے ساتھ جہاد کیلئے ہندوستان تشریف لائے۔ آخر عنایتِ الٰہی سے ان کی توجہ سلوکِ طریقۂ عالیہ چشتیہ کی طرف ہوئی اور بزرگوں سے مستفید ہو کر درجۂ کمال کو پہنچے۔ ایک عالَم آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوا ترکِ سلطنت اور قبولِ فقر کے بعد آپ نے کوہستانِ کابل میں سکونت اختیار کی اور مدتوں وہیں رہ کر اللہ کی مخلوق کو فیض پہنچاتے رہے وصال کے بعد وہیں دفن ہوئے آج تک وہ موضع درّہ فرخ شاہ کے نام سے مشہور ہے اور آپ کی قبر زیارت گاہِ خاص وعام ہے۔

اسی تھانہ بھون میں ایک شریف اور ذی حیثیت خاندان کے ایک فرد عبدالحق کے گھر 5 ربیع الثانی 1280ھ مطابق 19 ستمبر 1863ء ایک ستارہ طلوع ہوا جس کا نام اشرف علی رکھا گیا کسی نے نومولود کا مادہ تاریخ "کرمِ عظیم" خوب نکالا کہ آگے چل کر یہی حکیم الامت، مجدّد المِلّت، قطب الارشاد، شیخ المشائخ، مرشد العالم، مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی کہلایا اور اس کی ذات بابرکات امت محمدیہ علی صاحبہا الصّلوٰۃ والتحیتہ کیلئے اللہ تعالیٰ کا کرمِ عظیم ہونا ثابت ہوئی۔ مولانا کی ولادت باسعادت ننھیال کے اس مکان میں ہوئی جو محلّہ خیل میں ہے ان کی پیدائش کا واقعہ بھی عجیب ہے جو خاندان میں اسی وقت سے مشہور چلا آتا ہے۔

مولانا کے والد عبدالحق مرض خارشت میں ایسے مبتلا ہو گئے کہ کسی دوا سے فائدہ نہ ہوتا تھا ایک ڈاکٹر نے کہا کہ اس مرض کی ایک دوا اکسیر ہے مگر وہ قاطع النسل ہے۔ عبدالحق صاحب چونکہ بیماری سے بہت تنگ آ گئے تھے اس لئے انہوں نے دوا یہ کہہ کر استعمال کر لی کہ بلا سے اولاد نہ ہو، بقائے نوعی سے بقائے شخصی مقدّم ہے عبدالحق صاحب کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو بہت پریشان ہوئیں کہ اس وقت تک کوئی اولادِ نرینہ زندہ نہیں رہتی تھی۔ شدہ شدہ یہ خبر عبدالحق صاحب کی خوش دامن تک پہنچ گئی انہوں نے اس

Marfat.com

زمانے کے مشہور مجذوب اور بزرگ حضرت حافظ غلام مرتضیٰؒ پانی پتی سے عرض کیا کہ حضرت ‘ میری اس لڑکی کے لڑکے زندہ نہیں رہتے۔ حافظ صاحبؒ نے فرمایا: عمرؓ اور علیؓ کی کشاکش میں مرجاتے ہیں اب کی بار علیؓ کے سپرد کر دینا‘ زندہ رہے گا۔ اس مجذوبانہ معمے کو کوئی نہ سمجھا آخر عبدالحق صاحب کی بیوی نے اپنی فہم خداداد سے اسے حل کیا اور فرمایا: حافظ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ لڑکوں کے باپ فاروقی ہیں اور ماں علوی‘ اب تک جو نام رکھے گئے وہ باپ کے نام پر رکھے گئے اب کی بار جو لڑکا ہو اس کا نام ننھیال کے ناموں کے مطابق رکھا جائے جس کے آخر میں علی ہو۔ حافظ صاحب یہ سن کر ہنسے اور فرمایا: واقعی میرا مطلب یہی تھا یہ لڑکی بڑی عقل مند معلوم ہوتی ہے۔ انشاء اللہ اس کے دو لڑکے ہوں گے اور زندہ رہیں گے ایک کا نام اشرف علی رکھنا‘ دوسرے کا اکبر علی‘ دونوں صاحبِ نصیب ہوں گے ایک میرا ہو گا وہ مولوی اور حافظ قرآن ہو گا اور دوسرا دنیادار ہو گا چنانچہ یہ سب پیش گوئیاں حرف بہ حرف درست ثابت ہوئیں کبھی کبھی مولانا کہا کرتے تھے کہ یہ جو میں اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگتا ہوں انہی مجذوب صاحب کی روحانی توجہ کا اثر ہے جن کی دعا سے میں پیدا ہوا ہوں۔ طبیعت مجذوبوں کی طرح آزاد ہے۔ الجھی ہوئی باتوں کی متحمل نہیں۔

اشرف علی کی پیدائش کے تقریباً چودہ ماہ بعد ہی ان کے چھوٹے بھائی اکبر علی پیدا ہوئے اور چونکہ ماں کا دودھ دونوں بچوں کیلئے کافی نہ تھا اس لئے اشرف علی کیلئے ایک انّا رکھی گئی وہ قوم کی قصائی تھی۔ چنانچہ مولانا مزاح میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے قصائی کا دودھ پیا ہے اس لئے بھی میرے مزاج میں حدّت ہے مگر الحمدللہ شدّت نہیں۔ ابھی آپ کی عمر پانچ سال کی تھی کہ والدہ کا سایۂ عاطفت سر سے اٹھ گیا لیکن والد نے بڑی محبت اور شفقت سے دونوں بھائیوں کی خود پرورش کی۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت اور اخلاق کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ تراویح میں ختمِ قرآن کی جو مٹھائی مسجدوں میں تقسیم ہوتی اس میں کبھی شریک نہ ہونے دیتے بلکہ اس روز خود بازار سے مٹھائی منگوا کر اس سے زیادہ کھلا دیتے اور کہتے کہ مسجدوں میں مٹھائی لینے کیلئے جانا بے غیرتی کی بات ہے۔

اشرف علی کی ذہانت بچپن کی شوخیوں میں بھی نمایاں تھی نئی سے نئی سوجھتی تھی۔ خود فرماتے تھے:
ایک دفعہ مجھے کیا شرارت سوجھی برسات کا زمانہ تھا‘ مگر ایسا کہ کبھی برس گیا‘ کبھی کھل گیا‘ مگر چارپائیاں باہر ہی بچھتی تھیں۔ جب برسنے لگا چارپائیاں اندر کر لیں‘ جب کھل گیا باہر بچھا لیں۔ ہم دونوں بھائیوں اور والد کی چارپائیاں ملی ہوئی بچھتی تھیں۔ ایک دن میں نے چپکے سے تینوں چارپائیوں کے پائے رسی سے آپس میں خوب کس کر باندھ دیئے۔ اب رات کو جو مینہ برسنا شروع ہوا تو والد صاحب جدھر بھی گھسیٹتے ہیں‘ تینوں کی تینوں چارپائیاں ایک ساتھ گھسٹتی چلی آتی ہیں۔ غرض والد صاحب بہت خفا ہوئے کہ یہ کیا نامعقول حرکت تھی۔

مولانا کہتے تھے کہ میں بچپن میں بہت شوخیاں کرتا تھا‘ مگر گندی شرارتیں نہ ہوتی تھیں۔ دیوالی

Marfat.com

کے زمانے میں میرٹھ چھاؤنی کے بازار میں سڑک پر دورویہ چراغ جلائے جاتے تھے۔ دونوں طرف ہم دونوں بھائی چلنا شروع کرتے اور رُومال کو حرکت دے کر چراغوں کو ایک طرف سے بجھاتے چلے جاتے تھے مگر کوئی برا نہ مناتا۔ ہندوؤں کو بھی ناگوار نہ ہوتا ایک کھیل یہ تھا کہ سب ساتھیوں کے جوتے جمع کیے ان کی صفیں بنائیں اور ایک جُوتا صفوں کے آگے رکھ دیا اور خوش ہوئے کہ جُوتے بھی نماز پڑھ رہے ہیں وعظ کا بھی بچپن سے شوق تھا اس کی بھی نقل اتارا کرتے جب کبھی بازار کی طرف کسی چھوٹے موٹے سودے کیلئے بھیجے جاتے تو مسجد راستے میں پڑتی' سیدھے منبر پر جا چڑھتے اور کھڑے ہو کر کچھ خطبے کی طرح پڑھ پڑھا کر وہاں سے چلے آتے۔

بہت چھوٹی عمر میں کہ ابھی عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے' پچھلی رات تہجّد کو اٹھتے اور نوافل اور وظائف پڑھتے۔ تائی صاحبہ محبت سے کہتیں کہ بیٹے' ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔ خاص طور سے سردی کے زمانے میں جب پچھلی رات کو اٹھ کر وضو کرتے اور تہجّد پڑھتے تو ان کا جی بہت کڑھتا اور برابر بیٹھی جاگا کرتیں۔ بچپن میں یہ عجیب عادت تھی کہ کسی کا ننگا پیٹ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ دیکھتے ہی فوراً قے ہو جاتی۔ دوسرے بچوں کو اس عادت کا علم تھا اس لئے تنگ کرتے اور بار بار پیٹ کھول کر دکھاتے اور اشرف علی قے کرتے کرتے پریشان ہو جاتے۔ مزاج کی یہ لطافت آخری دور تک یوں ہی رہی بچپن میں ایک نرالا خواب دیکھا والد ماجد ان دنوں میرٹھ میں تھے۔ مولانا کے الفاظ میں وہ خواب یوں تھا: میرٹھ کے جس مکان میں ہم لوگ رہتے تھے اس میں دو درجے کی دہلیز ہے۔ بڑے درجے میں ایک پنجرہ رکھا ہوا دیکھا اس میں دو خوبصورت کبوتر ہیں پھر دیکھا کہ شام ہو گئی اور وہاں اندھیرا ہو گیا۔ ان کبوتروں نے مجھ سے کہا اندھیرا ہو گیا ہمارے پنجرے میں روشنی کر دو۔ میں نے کہا تم خود ہی کر لو' چنانچہ انہوں نے اپنی چونچیں رگڑیں اور رگڑتے ہی خوب تیز روشنی ہو گئی تمام پنجرہ روشن ہو گیا جب ایک مدّت بعد میں نے ماموں واجد علی مرحوم سے یہ خواب بیان کیا' تو انہوں نے تعبیر دی کہ وہ دو کبوتر روح اور نفس تھے کیونکہ صوفیاءِ کرام اپنی اصطلاح میں روح کو نر اور نفس کو مادہ کہتے ہیں۔ روح اور نفس نے تم سے یہ درخواست کی کہ تم مجاہدہ کر کے ہم کو نورانی کرو۔ تم نے جواب دیا کہ تم خود ہی روشنی کر لو اور انہوں نے اپنی اپنی چونچ رگڑ کر روشنی کر لی اس کا مطلب یہ تھا کہ تم ریاضت و مجاہدہ نہ کرو گے' بلا ریاضت و مجاہدہ ہی حق تعالیٰ تمہاری رُوح اور تمہارے نفس کو نورِ عرفان سے منور فرمائیں گے۔ حضرت مولانا شیخ محمّد صاحب محدّث تھانویؒ جو حضرت میاں جی نور محمّد صاحب جھنجھانوی کے خاص خلیفہ تھے اشرف علی ان سے مکتب میں پڑھتے تھے' وہ فرمایا کرتے تھے کہ میرے بعد یہ لڑکا میری جگہ ہو گا مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی ؒ بھی کہا کرتے تھے کہ مجھے اشرف علی سے اس وقت سے محبت ہے جب وہ مجھے جانتے بھی نہ تھے غرض اشرف علی بچپن ہی سے بزرگانِ دین کے محبوب اور منظورِ نظر تھے اور ابتدائے عمر ہی سے سعادت اور مقبولیت کے آثار ظہور ہونے لگے تھے۔

..........☆..........☆..........

Marfat.com

اشرف علی نے قرآن مجید زیادہ تر حافظ حسین علی صاحب مرحوم سے حفظ کیا جو دہلی کے رہنے والے تھے۔ شروع کے چند پارے اخون جی سے پڑھے بالکل ابتدائی فارسی میرٹھ میں مختلف استادوں سے پڑھی۔ پھر تھانہ بھون میں فارسی کی متوسط کتابیں مولانا فتح محمدؒ صاحب سے پڑھیں اور انتہائی کتب ابوالفضل تک اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں جو ادب وفارسی کے کامل استاد تھے پھر تحصیلِ عربی کیلئے دیوبند چلے گئے وہاں فارسی کی باقی کتابیں مولانا منفعت علی صاحب سے پڑھیں یعنی پنج رقعہ ' قصائدِ عُرفی اور سکندر نامہ...... مولانا اشرف علی کو فارسی میں دست گاہِ کامل تھی۔ تحریر ' تقریر ' نظم ونثر سب پر ماہرانہ قدرت تھی۔ طالبعلمی کے زمانے میں جب کسی تکلیف کی وجہ سے چھٹی لے کر وطن آئے ' تو بطورِ مشغلہ فارسی زبان میں مثنوی " زیروبم " تصنیف کی اس وقت اٹھارہ برس کا سن تھا عربی کی پوری تکمیل دیوبند میں کی اور صرف انیس بیس برس کی عمر ہی میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ پانچ سال وہاں رہے۔ آخر ذی قعدہ 1295ھ میں داخل ہوئے تھے اور شروع 1301ھ میں فارغ ہوئے۔ عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے وطن تھانہ بھون میں مولانا فتح محمدؒ سے پڑھیں اور دیوبند پہنچ کر مشکوٰۃ شریف ' مختصر معانی ' نور الانوار اور مُلّا حسن شروع کی تھیں اشرف علی کی ذہانت ذکاوت اور حافظہ سب طالبعلموں میں مشہور تھا۔ تحصیلِ علم کا اس قدر شوق تھا کہ بعض اساتذہ سے خاص کتابیں جن کیلئے مدرسے میں وقت نہ تھا اس طرح پڑھیں کہ استاد تو نماز کیلئے وضو کر رہے ہیں اور اشرف علی ان سے سبق پڑھ رہے ہیں استاد بھی ان کا خاص لحاظ کرتے تھے ' چنانچہ جب مولانا رشید احمد گنگوہیؒ طلبہ کا امتحان لینے اور دستار بندی کرنے تشریف لائے ' تو مولانا محمود حسنؒ نے اشرف علی کی ذہانت اور ذکاوت کی خاص طور پر تعریف کی۔ تعریف سن کر حضرت گنگوہیؒ نے اشرف علی سے بہت مشکل سوالات کئے اور ان کے جوابوں سے بے حد خوش ہوئے۔

دستار بندی کا جلسہ 1300ء میں ہوا تھا جب اشرف علی نے سنا کہ دستار بندی ہونے والی ہے تو ہم سبقوں کو لے کر اپنے استاد حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ ہم نے سنا ہے ہمیں سندِ فراغ دی جانے والی ہے ' حالانکہ ہم ہرگز اس قابل نہیں اگر ایسا کیا گیا ' تو مدرسے کی بڑی بدنامی ہو گی کہ ایسے نالائقوں کو سند دی گئی۔ یہ سن کر مولانا محمد یعقوب کو جوش آ گیا۔ فرمایا: تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے یہاں چونکہ تمہارے اساتذہ موجود ہیں ان کے سامنے تمہیں اپنی ہستی کچھ نظر نہیں آتی۔ باہر جاؤ گے تب تمہیں اپنی قدر معلوم ہو گی۔ جہاں جاؤ گے بس تم ہی تم ہو گے۔ باقی سارا میدان صاف ہے مولانا کی یہ پیش گوئی بعد میں حرب بہ حرف پوری ہوئی۔

اشرف علی کو اللہ تعالیٰ نے اساتذہ بھی ایسے دیئے تھے کہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ غزالیؒ اور رازیؒ وقت تھا۔ مولانا محمد یعقوبؒ ابن مولانا مملوک علی نانوتوی کی ہستی سب سے زیادہ مقتدر تھی وہ بہت بڑے صاحبِ باطن اور شیخ کامل تھے۔ اشرف علی نے مولانا ممدوح سے نہایت فیوض و برکات حاصل کئے

Marfat.com

اور زیادہ تر علوم عجیبہ وغریبہ انہی سے حاصل کئے، کہتے تھے کہ ان کا حلقۂ درس کیا ہوتا تھا حلقۂ توجہ تھا یہ حال تھا کہ تفسیر کا سبق ہو رہا ہے آیات کا مطلب بیان فرما رہے ہیں اور آنکھوں سے زار و قطار آنسو جاری ہیں مولانا محمد یعقوب ؒ کو حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ؒ سے شرف بیعت حاصل تھا اور حاجی صاحب ؒ کے خلفائے عظام میں گنے جاتے تھے۔ اشرف علی کے دیگر استادوں میں مولانا سید احمد ؒ، ملا محمود ؒ مولانا عبدالعلی ؒ اور مولانا محمود حسن شیخ الہند ؒ کے اسمائے گرامی شامل ہیں قرأت کی مشق شہرۂ آفاق قاری محمد عبداللہ مہاجر مکی ؒ سے بمقام مکّہ معظمہ فرمائی تھی جو قرّائے عرب کے نزدیک بھی نہایت جیّد اور ماہر فن قاری تھے۔ اس زمانے میں قرأت کی مشق کرتے کرتے لہجے میں اپنے یگانۂ فن استاد سے اس قدر مشابہت پیدا ہو گئی تھی کہ جب قاری عبداللہ ؒ اشرف علی کو مدرسہ صولتیہ کی بالائی منزل پر قرأت کی مشق کراتے تو نیچے سننے والے تمیز نہ کر پاتے کہ اس وقت استاد قرأت کر رہے ہیں یا شاگرد...... غرض ہر استاد اپنے فن میں یگانۂ روزگار ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کا صاحبِ باطن اور کامل و مکمّل شیخ بھی تھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اشرف علی کی تربیت ظاہری و باطنی کا بہتر سے بہتر سامان شروع ہی میں جمع کر دیا تھا آخر میں وہ نعمت عطا ہوئی جو گویا ان تمام نعمتوں کی میزانِ کل ہے یعنی شیخ العرب والعجم حضرت حاجی شاہ امداد اللہ مہاجر مکی ؒ سے شرفِ بیعت زمانہ طالبعلمی ہی میں حاصل ہو گیا حضرت حاجی امداد اللہ ؒ کی ذاتِ والا صفات شہرۂ آفاق ہے اور ہرگز محتاجِ تعارف نہیں ان کے بارے میں مولانا مظفر حسین کاندھلوی ؒ کا ارشاد ہے کہ حاجی صاحب کی شان بالکل اکابر سلف کی سی تھی اگرچہ پیدا اِس زمانے میں ہوئے تھے سینکڑوں بڑے بڑے علماء اور دوسرے سلسلوں کے مشائخ نے بھی حضرت حاجی صاحب ؒ سے شرفِ بیعت حاصل کرنے کو اپنا فخر سمجھا، لہٰذا بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ ایسا محقّق اور جامع شریعت و طریقت شیخ اس زمانے میں کوئی نہیں۔ عرب و عجم کے بالخصوص برِّ صغیر کے جتنے چیدہ چیدہ اور مشہورِ زمانہ علماء تھے سب قریب قریب حاجی صاحب کے حلقۂ غلامی میں داخل تھے۔

اشرف علی ابھی کم سن تھے اور دار العلوم دیوبند میں طالبعلم کہ حضرت حاجی صاحب نے مکّہ معظمہ سے اشرف علی کے والدِ ماجد عبدالحق صاحب کو پیغام بھیجا کہ جب تم حج کو آؤ تو اپنے بڑے لڑکے کو بھی ساتھ لانا۔ عجیب بات تھی کہ حاجی صاحب اشرف علی کی ولادت سے بہت پہلے ہندوستان سے ہجرت فرما کر مکّہ معظمہ جا بسے تھے اور انہیں اشرف علی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ ظاہر ہے کم عمری اور طالبعلمی کے زمانے کے حالات ہی ایسے کیا ہوں گے جنہیں حاجی صاحب ؒ کے کانوں تک پہنچایا جاتا اور انہیں اتنا شدید غائبانہ تعلق پیدا ہوتا کہ خود مکّہ معظمہ بلانے کی دعوت دیتے۔ یقیناً یہ یاد فرمائی کسی اشارۂ غیبی یا کششِ معنوی کی بناء پر تھی۔

1301ھ میں اشرف علی فارغ التحصیل ہوئے اور فوراً بعد مدرسہ فیضِ کانپور میں مدرّس ہو گئے اسی سال حج مبارک کا سفر ہوا اور اپنے والد کے ساتھ اس سفر پر گئے مکّہ معظمہ میں حاجی صاحب کے

Marfat.com

ہاتھ پر بیعت کا شرف حاصل ہوا انہیں دیکھ کر حاجی صاحب ؒ بے حد مسرور ہوئے حج اور زیارتِ مدینہ منورّہ کے بعد انہوں نے خود مولانا اشرف علی سے فرمایا: تم میرے پاس چھ مہینے رہ جاؤ۔ مولانا نے اپنے والد سے اجازت چاہی لیکن ان کی شفقتِ پدری نے مفارقت گوارا نہ کی اور مولانا نے حاجی صاحب سے بصد افسوس عرض کیا کہ والد اجازت نہیں دیتے۔ حضرت ؒ نے فرمایا: والد کی اطاعت مقدّم ہے اس وقت چلے جاؤ پھر دیکھا جائے گا چنانچہ واپس ہندوستان آکر علومِ ظاہری اور تبلیغ احکامِ خداوندی میں بذریعہ درس و وعظ نہایت تندہی سے مشغول ہو گئے اور 1307ھ تک یہی علمی شغل رہا اس دوران حضرت حاجی صاحب سے خط و کتابت بھی جاری رہی اسی زمانے میں ذکر و شغل کا خاص اہتمام رہا اور یہاں تک متاثر ہوئے کہ حاجی صاحب سے ملازمت ترک کر دینے کا مشورہ لیا لیکن مصالحِ دینیہ کی وجہ سے اجازت نہ ملی غرض صدہا طالبعلم فارغ التحصیل ہوئے اور بہت سے سندِ حدیث لے کر چلے گئے ہزار ہا بندگانِ خدا مواعظِ حسنہ سے مستفید ہوئے۔ درس دینے میں بڑے بڑے لاینحل مقامات کی اس خوبی سے توضیح اور اس قدر تسہیل کی تقریر فرماتے کہ ادق سے ادق مضامین بالکل پانی ہو جاتے تھے۔ مواعظ کا یہ عالم کہ پانچ پانچ چھ چھ گھنٹے کھڑے ہو کر مسلسل تقریر فرماتے پھر بھی سامعین کا جی نہ بھرتا اور تمام مسلمانان کانپور جہاں ہر مشرب کے لوگ موجود تھے مولانا اشرف علی کے حسنِ بیان کے اس قدر گرویدہ ہو گئے تھے کہ محلّے محلّے طلبی ہوتی تھی یہاں تک کہ ایک بار مسلسل دو ماہ تک صرف نماز ہی کی ترغیب میں مختلف محلّوں میں وعظ ہوتے رہے ان کا اثر یہ ہوا کہ مسجدوں میں نمازیوں کی کثرت سے جگہ باقی نہ رہی اور نماز کے شوق کی یہ حالت تھی کہ تانگے والے مسلمان سواریوں سے پوچھ پوچھ کر نماز یاد کرتے تھے۔ اس فیضِ ظاہری کے بعد اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ امّتِ محمدیہ کو مولانا اشرف علی کے ذریعے فیضِ باطنی سے بہرہ اندوز فرمائے جس کے بغیر دین کی حقیقی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ یک بیک قلب میں ایک پرزور کششِ غیبی نہایت شدّومد کے ساتھ محسوس ہوئی اور ذکر و شغل کا ذوق و شوق جوش و خروش سے موجزن ہونے لگا اور وہ آتشِ محبّت الٰہی جو قلب میں دبی ہوئی تھی اس قوّت کے ساتھ ابھری کہ نہ صرف مولانا کو بلکہ ایک عالم کو سوختہ و افروختہ کر دیا۔ اب ادھر آتشِ عشقِ الٰہی نہایت تیزی سے دل میں شعلہ زن اور ادھر اپنے اور حضرت پیرومرشد کے درمیان اتنا فاصلہ کہ سمندر حائل سخت خلجان کہ کیونکر مقصود تک رسائی ہو۔ مولانا کا رنگ ہی بدل گیا اور گویا کایا پلٹ ہو گئی۔ شغلِ باطن سے یہاں تک دلچسپی بڑھی کہ تعلقات سے نفرت ہو گئی اور حضرت حاجی صاحب ؒ سے بذریعہ عریضہ ترکِ ملازمت کا مشورہ کر لیا جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا لیکن حاجی صاحب ؒ نے اجازت نہ دی کہ تمکین کا انتظار تھا چنانچہ مولانا اشرف علی نے حسبِ ارشاد سلسلۂ درس و تدریس جاری رکھا۔ آخر کار 1310ھ میں اس اشتیاق نے اس درجہ بے چین و مضطرب کر دیا کہ کسی طرح سکون ہی نہ ہوتا تھا اس کیفیت کو صوفیاؒ کی اصطلاح میں شوق سے تعبیر کرتے ہیں لہٰذا آپ نے چھ ماہ تک مکّہ معظمہ میں حاجی صاحب ؒ کے پاس قیام کرنے کا پختہ ارادہ کر کے درس و تدریس کے مشاغل سے خود کو فارغ کر

Marfat.com

لینے کا اہتمام کیا اور جلد ہی اس میں کامیاب ہو گئے اور پھر کچھ عرصے بعد پیرو مرشد کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ مرکز پر پہنچنا تھا کہ سارا اضطراب، سکون میں بدل گیا اور اب وہ کیفیت رونما ہوئی جسے صوفیاؒ کی اصطلاح میں اُنس کہتے ہیں۔ حاجی صاحب" مولانا اشرف علی کے مکہ پہنچنے سے ایسے مسرور ہوئے اور اس درجہ محبت اور شفقت سے پیش آئے کہ دوسروں کو حسد ہونے لگا۔ چند ہی دنوں میں باہم ایسی مناسبت ہوئی کہ حاجی صاحب" بے ساختہ فرمانے لگے: "میاں اشرف علی بس تم پورے پورے میرے طریق پر ہو۔" مولانا کی کوئی تقریر سنتے یا تحریر دیکھتے تو خوش ہو کر فرماتے: "تم نے تو بس میرے سینے کی شرح کر دی۔" اگر دوران علوم و معارف کوئی سائل حاجی صاحب" سے کچھ دریافت کرتا تو خود جواب دینے کے بجائے مولانا اشرف علی کی طرف اشارہ فرمادیتے کہ ان سے پوچھ لو، یہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ غرض اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں رہ کر بھی باطنی دولتوں سے مالا مال ہوئے لیکن توحید کا انکشاف بدرجۂ کمال ہوا جو شریعت اور طریقت کی گویا بنیاد اور مغزِ درویشی اور جس کا ثمرۂ لازمی عبدیّت ہے اور یہی سلوک کا سب سے اعلیٰ مقام ہے اور یہی وہ دولتیں ہیں جن کے حاجی امداد اللہ" خاص طور پر حامل تھے۔

مولانا پر حاجی صاحب" کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی پوچھتا یہ کون ہیں؟ تو فرماتے: میرے پوتے ہیں۔ مولانا کا بیان ہے کہ کوئی دُور کا رشتہ بھی حاجی صاحب" نے فرمایا تھا جس کی بناء پر مجھے اپنا پوتا کہتے تھے اسی محبت اور شفقت کا باعث تھا کہ مولانا کیلئے کوئی تعظیمی لفظ مولوی وغیرہ کا استعمال نہ کرتے بلکہ نام سے پہلے میاں کا اضافہ فرما کر خطاب کرتے۔ ایک مرتبہ ٹھنڈا پانی پی کر فرمایا: میاں اشرف علی پانی جب پینا ٹھنڈا پینا تا کہ ہر بُنِ مُو سے الحمد اللہ نکلے ورنہ زبان تو الحمد اللہ کہے گی، دل الحمد اللہ کہنے میں شریک نہ ہو گا یہ بھی بشارت دی کہ تم کو تفسیر اور تصوّف سے خاص مناسبت ہوگی۔

غایتِ خصوصیّت کی بنا پر رخصت کے وقت حاجی صاحب" نے اپنا کتب خانہ مولانا کے سپرد کرنا چاہا لیکن مولانا اشرف علی نے عرض کیا کہ حضرت کتابوں میں کیا رکھا ہے اپنے سینۂ مبارک سے کچھ دولت عطا فرما دیجئے یہ سن کر حاجی صاحب کو جوش آ گیا اور فرمایا: ہاں میاں، ہاں سچ تو ہے کتابوں میں کیا رکھا ہے۔

صد کتاب و صد ورق در نار کُن
سینہ را از نورِ حق گلزار کُن

تقریباً چھ ماہ مکہ معظمہ میں حاجی صاحب کے پاس قیام کے بعد مولانا نے اپنے شیخِ عالی مرتبت سے رخصت چاہی۔ عارف باللہ حاجی صاحب نے بطور خاص دو وصیتیں فرمائیں:

(ا) دیکھو میاں اشرف علی ہندوستان پہنچ کر تم کو ایک حالت پیش آئے گی، عجلت نہ کرنا۔

(ب) کبھی مدرسہ کانپور کے تعلق سے دلبرداشتہ ہو جاؤ تو پھر دوسری جگہ تعلق نہ کرنا توکّل علی اللہ تھانہ بھون جا کر بیٹھ جانا۔

Marfat.com

گویا 1308ھ میں جس ترکِ تعلق کو منع فرمایا تھا اب حصولِ تمکین کے بعد خود اس کے تُرک کا مشورہ دے رہے ہیں جب مولانا واپس تشریف لے آئے تو حاجی صاحب " گاہ گاہ حاجیوں کی زبانی مولانا کو اس عنوان سے سلام کہلوا کر بھیجا کرتے تھے کہ ہمارے مہین مولوی سے سلام کہہ دینا۔ "مہین سے مراد دقیقہ رس "نکتہ شناس اور لطیف المزاج ...... اس سے حاجی صاحب کی اعلیٰ درجے کی بصیرتِ باطنی ظاہر ہوتی ہے اس چھ ماہ کے قیام میں حاجی صاحب نے نہ صرف باطنی دولتیں مولانا کو ودیعت فرمائیں بلکہ اخذِ بیعت کی اجازت بھی عطا ہوئی اور اپنا جانشین و خلیفۂ خاص بنا کر منصب ارشاد و تلقین پر متمکّن فرمادیا۔

اللہ اللہ وہ کیسی مسعود و مبارک ساعت تھی جس میں ایک قطب الارشاد حکیمُ الاُمت، مجدّدِ دین وملت ایک شیخ العرب والعجم کے دستِ مبارک سے دنیائے اسلام سے رسوم و بدعات کو مٹانے اسلام کو اس کی اصلی صورت میں دکھانے، مسلمانوں کو افراط و تفریط سے ہٹانے، جادۂ مستقیم پر لانے علوم ومعارف کے دریا بہانے، عوام و خواص سب کو مستفید فرمانے، فیوض و برکات ظاہری و باطنی مشرق و مغرب میں پھیلانے بڑے بڑے عقدہائے لاینحل اور پیچیدہ پیچیدہ مسائل علمیہ و عملیہ کی گتھیاں سلجھانے بندگانِ خدا کو صحیح آدابِ عبودیت اور اصولِ معاشرت سکھانے، مسلمانوں کو صحیح معنوں میں مسلمان اور انسانوں کو صحیح معنوں میں انسان بنانے، اہلِ دنیا کے قلوب میں اہلِ دین کا سکّہ بٹھانے، تہذیبِ اسلامی کی خوبی و متانت کو عالم آشکارا کرنے اور تہذیبِ نو کی نظر فریب چادرِ زر نگار کو پارہ پارہ کر کے اس کی دھجیاں اڑانے، نئی روشنی کی مخفی ظلمات کھلی آنکھوں دکھلانے، بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھکانے، شبہاتِ جدیدہ کو اصولِ منطق و فلسفہ ہی کی بناء پر باطل ٹھہرانے بڑے بڑے مدعیان منطق و فلسفہ سے کتاب و سنت کے احکام و عقائد حقّہ منوانے، ہزاروں بے نمازیوں سے نماز پڑھوانے، سود خوروں سے سود اور ناجائز آمدنی والوں سے ناجائز آمدنیاں ترک کرانے، اہل حقوق کے حق دلوانے، صدہا اہل معاصی سے ظاہرہ و باطنہ معاصی چھڑانے

انتہائی مہلک امراضِ روحانی کے سہل سہل اور تیر بہدف معالجات اور نادر طریقِ اصلاح بتانے، باریک باریک مکائدِ نفس بجھانے، تصوّف کے تن پر صدیوں سے جمی ہوئی مصنوعی عبا و قبا اتروانے اور اصلی خرقۂ دیرینہ پہنانے سالکین کو سلف صالحین کے برگزیدہ اور کتاب و سنت کے مطابق پھر چلانے۔ ہزارہا مایوسین کی ڈھارس بندھانے اور صدہا طالبین کو محبوبِ حقیقی تک پہنچانے اور ہر شعبۂ دینی سے متعلق ہر ضروری خدمت بہ احسن وجوہ بجالانے کیلئے سریر آرائے منصب ارشاد ہوا۔

............☆............☆............

مولانا اشرف علی مکّہ معظّمہ گئے تھے اس حالت میں کہ نوجوانی تھی۔ خداداد جمال و جلال ایسا کہ طالبعلمانہ سادگی کے باوجود ہر نظر میں سماتے اور ہر دل میں اتر جاتے تھے مگر شش ماہا قیام کے بعد جب لوٹے ہیں تو عشق کے ہاتھوں عجب حال ہو چکا تھا دیکھنے والے دیکھتے تھے اور حیرت کیا کرتے تھے کہ یا اللہ، کیا تھا اور کیا ہو

Marfat.com

گیا۔ رنگ ہی کچھ اور تھا۔ خواجہ مجذوبؒ نے اپنے والد کا ایک قول اشرف السوانح میں یوں نقل کیا ہے۔

"فرماتے تھے ہم نے مولانا کا ایک تو وہ زمانہ دیکھا تھا کہ نہایت سرخ و سفید' ہشاش بشاش' خوبصورت اور چمکتے ہوئے پٹے دار بال' خوش لباس ایسے گویا ہر وقت دُولہا بنے رہتے تھے اور جوانی کا وہ عالم تھا کہ گویا شباب پھٹا پڑتا تھا پھر وہ زمانہ بھی دیکھا جب حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں قیام کرنے کے بعد تشریف لائے کہ چہرہ بالکل زرد اور اداس پژمردہ' ژولیدہ حال' نہ بالوں میں تیل کا اہتمام نہ کنگھی کا التزام' نہ اچکن نہ انگرکھا نہ پھیک' نہ بیل بوٹے...... صرف سادہ کرتا اور پاجامہ۔"

غرض واپسی کے کچھ عرصے بعد پھر شوقِ الٰہی کی کیفیت نہایت جوش و خروش سے وارد ہوئی مگر اب کی بار کچھ اور نقشہ تھا۔ پہلے اضطراب تھا اب اشتیاق جب پریشانی تھی اب فرحت' اس وقت کلفت تھی اب لذت' وہ سیر الی اللہ تھی یہ سیر فی اللہ۔ وہ زمانِ ہجر تھا یہ زمانِ وصال' وہ دورِ حسرت تھا' یہ دورِ شوق' وہ تلوین تھی یہ تمکین' وہ حالت مشاہدے سے پہلے کی تھی' یہ بعد کی۔ وہ اثرِ عشق تھا' یہ اثرِ حسن۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدرسے کا رنگ ہی بدل گیا' درسی کتابوں کا سبق ہو رہا ہے اور تصوّف کے مضامینِ عالیہ ارشاد ہو رہے ہیں' طالب علموں پر وجد طاری ہے یہاں تک کہ بہت سے مدرّسین اور طلبہ نے ذکر و شغل شروع کر دیا۔ مدرسہ خانقاہ ہو گیا۔ اس زمانے میں جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ خود مولانا فرماتے تھے "بس یہ جی چاہتا ہے کہ ساری دنیا کو ذاکر و شاغل اور ولیٔ کامل بنا دوں" یہ وہی کیفیت تھی جس کی پیش گوئی حاجی صاحبؒ نے مولانا کو رخصت کرتے وقت فرمائی تھی۔

غرض سارے مشاغل سے دل سرد ہو گیا۔ کہاں کا درس اور کیسا وعظ؟ اہلِ کانپور جو آپ کے مواعظ کے دلدادہ تھے' بے تاب ہو گئے۔ ایک مرتبہ بڑا جلسہ تھا' بیرونی علماء بھی آئے ہوئے تھے' لوگوں نے وعظ کے لئے مولانا سے اصرار کیا۔ اکابر علماء کو دیکھ کر نہ انکار ہوتا تھا نہ اپنی حالت کے پیشِ نظر اقرار ممکن تھا۔ جب کچھ بن نہ آیا' تو گردن جھکا کر بے اختیار رونے لگے۔ اسی طرح ایک اور موقع پر شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تشریف لائے ہوئے تھے' ان سے کانپور والوں نے عرض کی کہ وہ مولانا کو لب کشائی پر آمادہ کریں' تو شاہ صاحب نے عجیب جواب دیا۔ فرمایا: "اگر ایسی حالت میں اس شخص سے وعظ کہلوایا تو بس منبر پر بیٹھتے ہی اس کے منہ سے پہلا لفظ جو نکلے گا' وہ انا الحق ہو گا' ایسی حالت میں اصرار ہرگز مناسب نہیں" شاہ صاحب کی اس رائے کی تصدیق بعد میں خود مولانا نے بھی یوں فرمائی کہ اس زمانے میں مجھ پر توحید کا بہت غلبہ تھا' اس لئے میں نے وعظ کہنا چھوڑ دیا تھا کہ نہ جانے منہ سے کیا نکل جائے اور عوام کو غلط فہمی ہو کر دینی نقصان پہنچے۔

اتفاقاً انہی دنوں کوئی صاحب مکہ معظمہ جا رہے تھے۔ مولانا نے ان کے ذریعے حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں پورا احوال لکھ بھیجا جب یہ عریضہ حاجی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچا' تو ان کا یہ عالم

Marfat.com

تھا کہ کبھی گھر میں تشریف لے جاتے اور کبھی باہر نکل آتے اور بار بار فرماتے جوان آدمی ہیں' غلبہ ہو گیا ہے' تحمل نہیں ہوسکا' مگر میں تو اتنی دور ہوں کیا کروں؟ عریضہ لے جانے والے صاحب نے عرض کیا کہ حضرت' میں جلد ہی واپس جانے والا ہوں۔ یہ سن کر حاجی صاحبؒ بہت خوش ہوئے اور جواب لکھ کر ان کے حوالے کیا اور فرمایا میاں اشرف علی سے کہنا کہ جب تک تمہارا خادم زندہ ہے' کیوں کسی دوسرے کی طرف رجوع کرتے ہو۔

جب پیغام لے کر وہ صاحب ہندوستان آئے اور مولانا اشرف علی کو ان کے آنے کی اطلاع ملی تو عین دوپہر کے وقت مشتاقانہ ان کے گھر پہنچے۔ انہوں نے حاجی صاحبؒ کا والا نامہ حوالے کیا اور زبانی پیغام بھی دیا۔ اس کا جو اثر ہُوا وہ خود مولانا کی زبانی سنئے۔

"حضرت کا پیغام سنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے دہکتے ہوئے تنور پر کسی نے بھری ہوئی مشک چھوڑ دی اور جلتے ہوئے سینے پر برف کا ٹکڑا رکھ دیا۔ عصر تک نصف سے بھی کم پریشانی رہ گئی اور مغرب تک تو بس مطلع بالکل صاف تھا"

1313ھ کے اختتام تک مولانا نے ٹھان لیا کہ بس اب خانقاہ تھانہ بھون ہی کو اپنا گوشۂ عافیت بنایا جائے۔ کانپور میں درس و تدریس کا شغل اختیار کئے چودہ برس بیت چکے تھے اور تعلقات سے وحشت ہوتی تھی۔ اس وقت حضرت حاجی صاحبؒ کی وصیت یاد آئی کہ اگر کبھی کانپور سے دل برداشتہ ہو جاؤ تو پھر توکل بخدا تھانہ بھون ہی میں جا کر بیٹھ جانا۔ خانقاہ تھانہ بھون حضرت حاجی امداد اللہ' حضرت حافظ ضامن شہیدؒ اور حضرت شیخ محمد محدث تھانویؒ کی برکات سے " کانِ معرفت " کہلاتی تھی اور مولانا اشرف علی کو اب اپنی طرف پوری قوت سے کھینچ رہی تھی۔ آخر نہایت خوش اسلوبی سے اہلِ کانپور کو ناراض کئے بغیر مولانا 1315ھ میں وہاں سے نکلے اور تھانہ بھون پہنچ کر حاجی صاحبؒ کو اس کی اطلاع دی۔ وہاں سے جواب آیا "بہتر ہُوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے آئے۔ امید ہے آپ سے خلائقِ کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہو گا۔ آپ ہمارے مدرسے کو از سرِ نو آباد کریں' میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے" چنانچہ پیرو مرشد کے ارشاد کی تعمیل میں 1315ھ سے مولانا اشرف علی کا وہ دور شروع ہوتا ہے جو زندگی کے آخری سانس تک باقی رہا' یعنی مستقل قیام تھانہ بھون۔ اس کانِ معرفت کی رونق شیخ محمد محدث تھانویؒ کی رحلت' حافظ ضامنؒ کی شہادت اور حاجی امداد اللہ صاحبؒ کی ہجرت کے سبب ماند پڑ چکی تھی۔ مولانا کی وجہ سے پھر رونق پر آ گئی۔ اس دور میں مولانا خود سراپا سوز و گداز تھے' اس لئے جو آتا سوختہ و گداختہ ہو جاتا۔ آپ اپنی جگہ بیٹھے ہوئے اصلاحِ باطن کے کام میں مشغول رہے اور سلوک کی منزلیں طے کرتے گئے' کتنی ہی گھاٹیوں سے اتارے گئے اور چڑھائے گئے۔ اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ آپ کو ایک اعلیٰ ترین مقام پر فائز کرے اور اس راہ کی دشوار ترین گھاٹی سے بھی گزار دے تاکہ پھر دوسروں کی رہبری میں آپ کو حیرانی و پریشانی نہ ہو اور یہ مقام خوف و

Marfat.com

رَ جاتھا جسے ہیبتِ اُنس بھی کہتے ہیں۔ اس میں کبھی ہیبت اور کبھی اُنس کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ کیفیت ایک برس تک رہی، الحاصل وہ مرتبہ ملا جسے عبدیت کہتے ہیں اور جس کی لازمی صفت بندگی و سرافگندگی ہے۔ اس مرحلے سے گزرنے کے بعد مسندِ ارشاد پر مستقلاً جلوہ فرما ہوئے اور ہمہ تن تزکیہ و تصفیۂ خلق کے کام میں مشغول ہو گئے۔

مشہور نعت گو شاعر حضرت محسن کاکوروی ؒ کے فرزند مولانا نورالحسن کا ایک خواب درج ہے اس سے مولانا اشرف علی کے منجانب اللہ مقامِ ارشاد پر فائز ہونے اور اپنے وقت کے مجدّد ہونے کی بشارت ملتی ہے میں نے سفرِ حج میں بمقام مدینہ طیبّہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ، کے متعلق ایک خواب دیکھا، حالانکہ اس زمانے میں مجھ کو حضرت مولانا سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی البتہ ایک بڑا عالم سمجھتا تھا غرض مجھ کو مدینہ طیبّہ میں مولانا کا کوئی بعید سے بعید خیال بھی نہ تھا کہ ایک شب خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم ایک چارپائی پر بیمار پڑے ہوئے ہیں اور حضرت مولانا تھانوی تیمارداری فرما رہے ہیں اور ایک بزرگ دور بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے جن کے متعلق خواب ہی میں معلوم ہوا کہ یہ طبیب ہیں۔ آنکھ کھلنے پر فوراً میرے ذہن میں یہ تعبیر آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو کیا بیمار ہیں حضور ؐ کی امت بیمار ہے اور مولانا تھانوی اس کی تیمارداری اور اصلاح فرما رہے ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ دُور بیٹھے ہوئے وہ بزرگ طبیب کون تھے۔ ہندوستان واپس آن کر میں نے مولانا تھانوی کی خدمت میں یہ خواب لکھ کر بھیجا اور جتنی تعبیر میری سمجھ میں آئی تھی وہ بھی لکھ دی اور یہ بھی لکھ دیا کہ سمجھ میں نہیں آیا وہ بزرگ طبیب کون تھے جو دُور بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا نے تحریر فرمایا کہ وہ حضرت امام مہدی علیہ السلام ہیں اور چونکہ ابھی زمانا بعید ہیں اس لئے خواب میں مکاناً بعید دکھائی دیئے۔

اسی طرح کا ایک اور واضح خواب مولانا تھانوی کے ایک خلیفۂ مجاز حضرت مولانا مفتی، محمّد حسن امرتسری ؒ نے دیکھا تھا وہ خواب یوں ہے: "کچھ عرصہ ہوا، تقریباً 1350ھ کا ذکر ہے خانقاہ (امدادیہ تھانہ بھون) کی مسجد کے وسط میں بیت اللہ شریف اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا روضۂ پاک دیکھا کہ دونوں بالکل قریب قریب ہیں اور بیت اللہ شریف غالباً حضرتِ والا (مولانا تھانوی) کی سہ دری کی طرف ہے لیکن روضۂ پاک بھی بیت اللہ شریف ہی کی شکل کا ہے یعنی اس پر گنبد نہیں ہے۔ بیت اللہ شریف اور روضۂ پاک دونوں پر اس قدر سبز اور خوبصورت غلاف ہیں کہ دنیا میں ان کی نظیر نہ ہوگی اور دونوں پر شعاعیں اور انوار معلوم ہوتے ہیں۔ حضرتِ والا، بیت اللہ شریف کے پاس کھڑے ہوئے ہیں اور اس قدر خوش ہیں کہ ایسا ہشاش بشاش میں نے حضرتِ والا کو کبھی نہیں دیکھا نیز ایک کھجور کی ٹہنی بطور جھاڑو کے دستِ مبارک میں لئے ہوئے ہیں جس کی ڈنڈی میں دستہ چھوڑ کر ادھر ادھر شاخیں نکلی ہوئی ہیں اور یہ ارادہ فرما رہے ہیں کہ بیت اللہ شریف اور روضۂ پاک کے ارد گرد جو غبار ہے اسے دُور فرمائیں۔"

چنانچہ مولانا نے تھانہ بھون کے گوشے میں بیٹھ کر اور دنیائے دوں کو ٹھکرا کر مسلمانوں کی جو حقیقی

Marfat.com

خدمت انجام دی اور اس ذریعے ان کے قلوب کی جو پادشاہی حاصل کی وہ کم کسی کے نصیب میں آتی ہے صرف ہندوستان کے شمال وجنوب اور مشرق ومغرب ہی سے نہیں ایران کے سبزہ زاروں' افریقہ کے ریگستانی ساحلوں اور برطانیہ کی تاریکیوں سے بھی روشنی کے طالب آئے اور اس شمعِ ضیا پاش سے اپنی اپنی بساط بھر روشنی لے گئے وہ بھی آئے جن کی پیاس اور چشموں سے نہ بجھتی تھی اور اس دریائے پُر آب نے انہیں سیراب کر دیا۔

مریدین اور معتقدین کی آمد سال کے بارہ مہینوں میں ایسی متواتر اور مسلسل رہتی تھی کہ حکومت نے اس کی وجہ سے قصبہ تھانہ بھون کو ایک مستقل ریلوے سٹیشن قرار دیا اور اس "دکانِ معرفت" پر خریدارانِ علم وعرفان کا وہ ہجوم ہوا جو حضرت سلطان الاولیاء قدس سرہٗ اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے بعد تاریخِ ہند میں شاید اپنی نظیر آپ تھا۔ مولانا کے علمی و دینی فیوض وبرکات اس قدر مختلف الانواع ہیں کہ حیرت ہوتی ہے ان کے اوصاف ومحامد میں جس صفت پر سب سے پہلے مبصر کی نگاہ جاتی ہے وہ کمال درجہ کو پہنچی ہوئی جامعیت ہے۔ مولانا ہی کے خلیفہ سلیمان ندوی" کے الفاظ میں وہ قرآن پاک کے حافظ ہیں' مترجم ہیں' مجوّد ہیں' مفسّر ہیں اس کے علوم وحکم کے شارح ہیں' محدّث ہیں' فقیہہ ہیں' مفتی ہیں 'خطیب ہیں' واعظ ہیں' صُوفی ہیں۔ انہوں نے تصوّف کے اسرار وعوامص کو فاش کیا ہے ان کی مجلسوں میں علم ومعرفت اور دین وحکمت کے موتی بکھیرے جاتے تھے اور یہ موتی جن گنجینوں میں محفوظ ہیں وہ ملفوظات ہیں وہ ایک مرشدِ کامل ہیں' وہ مصلحِ امت ہیں' غرض ان کی زندگی میں مسلمانوں کی کم ایسی مذہبی ضرورت ہوگی جس کا مداوا اس حکیم الامت نے اپنی زبان وقلم سے نہیں فرمایا اور جس کی وسعت کا اندازہ تحقیق اور مطالعے کے بعد ہی نظر میں آسکتا ہے ان کی تصنیفات ملک کے پورے طول وعرض میں پھیلیں اور ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کی اصلاح وفلاح کا باعث ہوئیں اردو عربی کے علاوہ مسلمانوں نے اپنے ذوق سے ان کی متعدد تصانیف کا ترجمہ دوسری زبانوں میں بھی کیا چنانچہ متعدد کتابوں کے ترجمے انگریزی' بنگالی' گجراتی اور سندھی میں شائع ہوئے۔

ان تصانیف کی تعداد جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور ضخیم تصانیف سب داخل ہیں آٹھ سو کے قریب ہے۔ 1354ھ میں ایک صاحب نے مولانا کی تصانیف کی فہرست شائع کی تھی جو بڑی تقطیع کے پورے 86 صفحوں میں آئی ہے۔ اس کے بعد نو برسوں میں جو تصانیف ترتیب پائیں' وہ اس تعداد کے علاوہ ہیں علمائے اسلام میں ایسے بزرگوں کی کمی نہیں جن کی تصانیف کے اوراق اگر ان کی زندگی کے ایام پر بانٹ دیئے جائیں تو اوراق کی تعداد زندگی کے ایام پر فوقیت لے جائے۔ امام جریر طبری' حافظ خطیب بغدادی' امام رازی' حافظ ابن جوزی' حافظ سیوطی وغیرہ متعدد نام اس سلسلے میں لئے جاسکتے ہیں۔ برِّصغیر میں مولانا ابوالحسنات عبدالحئ فرنگی محلی اور نواب صدیق خاں مرحوم کے نام بھی اس سلسلے میں داخل ہیں اور آخری نام مولانا اشرف علی تھانوی کا ہے۔ مولانا کی تصانیف کا بیشتر حصہ اصلاحی وفقہی ہے۔ مذہبی

Marfat.com

تصانیف میں علومُ القرآن ' علومُ الحدیث ' کلام و عقائد ' فقہ و فتاویٰ ' اور سلوک و تصوّف اور مواعظ اکثر ہیں۔ فن تجوید اور قرائت پر مولانا نے دس کتابیں لکھی ہیں۔ تفسیر بیان القرآن بارہ جلدوں میں ہے اور پورے قرآن پاک کی تفسیر ہے جسے ڈھائی سال کی مدت میں مولانا نے تمام فرمایا۔ اس کی بے شمار خصوصیتیں ہیں جن میں سے چند یہ ہیں۔ سلیس و بامحاورہ 'حتی الوسع تحتُ اللّفظ ترجمہ ' نیچے "ف" کے اشارہ فائدہ سے آئت کی تفسیر ' تفسیری روایاتِ صحیحہ اور اقوالِ سلفِ صالحین کا التزام کیا گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مسائل کی توضیح کی گئی ہے۔ لغات اور نحوی ترکیبوں کی تحقیق فرمائی ہے۔ شبہات اور شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے صوفیانہ ذوقی معارف بھی درج کئے گئے ہیں تمام کتبِ تفاسیر کو سامنے رکھ کر ان میں سے کسی قول کو دلائل سے ترجیح دی گئی ہے۔ ذیل میں اہلِ علم کیلئے عربی لغات اور نحوی تراکیب کے مشکلات حل کئے گئے ہیں اور حاشیے پر عربی میں اعتبارات و حقائق و معارف الگ لکھے گئے ہیں ماخذوں میں سب سے زیادہ آلوسی بغدادی حنفی کی تفسیر روح المعانی پر اعتبار فرمایا گیا ہے یہ تفسیر اس لحاظ سے حقیقتاً مفید ہے کہ تیرھویں صدی کے وسط میں لکھی گئی ہے اس لئے قدماء کی تصانیف کا خلاصہ ہے اور مختلف و منتشر تحقیقات اس میں یکجا ملتی ہیں۔

علومُ الحدیث میں مولانا کی تالیفات حقیقۃ الطریقۃ التشرف (چار جلدیں) جامع الآثار خطبات الاحکام ' مناجاتِ مقبول وغیرہ مشہور ہیں۔ علومِ الفقہ میں حوادث الفتاویٰ ' بہشتی زیور (دس جلدیں) فتاویٰ اشرفیہ ' بہشتی گوہر (مردوں کیلئے) تصنیف فرمائیں۔ علومِ سلوک و تصوّف میں قصد السبیل نہایت عمدہ رسالہ ہے۔ مولانا نے کوزے میں دریا بند کر دیا ہے دوسری تالیف التکشف پانچ جلدوں میں مثنوی مولانا روم کی شرح کلید مثنوی ' دیوانِ حافظ کی شرح عرفانِ حافظ ' طالبین و سالکین کی تربیت کیلئے "تربیت السالک" جس کی ضخامت بارہ سو بہتر صفحات ہے۔

مولانا اشرف علی کے ملفوظات کا سلسلہ تقریباً ساٹھ جلدوں اور رسائل میں مدوّن ہوا ہے اور ہر ایک ملفوظ خود مولانا کی نظر سے گزار کر چھاپا گیا ہے ان گرانقدر ملفوظات میں بزرگوں کے قصّے ' سنجیدہ لطیفے ' قرآن وحدیث کی تشریحات ' مسائل فقہیہ کے بیانات ' سلوک کے نکتے ' اکابر کے حالات ' طالبعلموں کی ہدایات و تنبیہات ' آداب و اخلاق کے نکات ' اصلاحِ نفس و تزکیئے کے مجربات اس خوبی سے درج ہیں کہ اہلِ شوق کے دل اور دماغ دونوں اس آبِ زلال سے سیراب ہوتے ہیں۔ اصلاحیات میں مولانا کی سب سے اہم چیز "مواعظ" ہیں جو شہر بشہر ہوئے اور انہیں ضبطِ تحریر میں لفظ لفظ لایا گیا پھر حضرت مولانا کی نظر سے گزار کر دوسرے مسلمانوں کے عام فائدے کی غرض سے شائع کیا گیا۔ تقریباً چار سو مواعظ ہیں جو احکامِ اسلامی رَدِّ بدعات ' نصائح دلپذیر اور مسلمانوں کیلئے مفید تدابیر و تجاویز پر مشتمل ہیں۔ مواعظ کے علاوہ اسی سلسلے میں اہم کڑی مولانا کی کتاب "حیوٰۃ المسلمین" ہے جس میں قرآن مجید اور احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں مسلمانوں کی دینی و دنیاوی ترقی اور فلاح کا مکمّل پروگرام مرتّب فرمایا

Marfat.com

ہے۔ حضرت نے بارہا ارشاد فرمایا کہ انہوں نے اپنی ساری تالیفات میں سے اس کتاب کی تالیف میں جو محنت اٹھائی ہے وہ کسی میں پیش نہیں آئی اور یہ بھی کہا کہ میں اپنی ساری کتابوں میں اس کتاب کو اپنے لئے ذریعۂ نجات گمان کرتا ہوں۔ غرض خانقاہِ امدادیہ میں بوریے پر بیٹھ کر کامل نصف صدی تک مولانا نے مسلمانوں کی تربیتِ اخلاق 'اصلاح اور علمی تحقیق کا جو کام کیا وہ کسی اور سے نہ ہو سکا۔ ممکن ہے خانقاہ کے لفظ سے بعض حضرات کا تصوّر کسی اور جانب چلا گیا ہو لیکن یہ وہ خانقاہ نہ تھی جس میں جوگیانہ رسوم ورواج کو زیادہ دخل ہوتا ہے اور دین واخلاق اور معاشرت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ یہ ایک ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت ہے کہ ہر دور میں چند خانقاہیں ایسی ضرور رہیں جہاں تربیتِ اخلاق کا عظیم الشّان فرض ہمیشہ انجام پاتا رہا ہے اور یہاں آکر بڑے بڑے اہلِ علم نے اپنے غرورِ علمی کو بڑے بڑے امراء نے اپنی نخوتِ دولت وجاہ کو اور کٹر دنیا داروں نے اپنی حبِ دنیا کو دور کیا ہے اور اس روح پرور ماحول میں رہ کر صبروشکر 'ایثار و تواضع 'توکّل وقناعت اور اخلاص وہمت کی اعلیٰ انسانی صفات اپنے اندر پیدا کی ہیں چنانچہ کون کہہ سکتا ہے کہ گذشتہ نصف صدی تک گنج مراد آباد میں شاہ فضلِ رحمٰن صاحب کے واسطے بھوپال میں شاہ ابو احمد صاحب ؒ کے فیض سے تھانہ بھون ' دیوبند اور سہارنپور میں حضرت حاجی امداد اللہ ' مولانا محمد قاسم ' مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ اور مولانا خلیل احمد صاحب ؒ کے قیام سے اور حیدر آباد دکن میں شاہ سعد اللہ صاحب مجدّدی ؒ کے وجود سے یہی دینی ماحول پیدا نہ تھا؟ اور حقیقی خانقاہیت موجود نہ تھی؟ دورِ حاضر کی آخری کڑی خانقاہِ امدادیہ تھانہ بھون تھی جہاں حکیم الامت مولانا اشرف علی کے ذریعے تعلیمِ اخلاق وتزکیۂ نفوس کا ایک عظیم الشّان اور وسیع ترین کام انجام پایا جو موجودہ حالات میں کہیں انجام نہیں پا رہا تھا۔

تھانہ بھون کی فضا اللہ والوں کے اجتماع اور ان کی پُرخلوص طاعتوں کے باعث ایسی پُرنور اور روح پرور ہو گئی تھی کہ جو شخص بھی چند روز یہاں قیام کرتا اس کی کایا پلٹ ہو جاتی کتنے جنٹلمین یہاں آکر ایسے ہو گئے کہ مولوی بھی ان کے تقویٰ وطہارت سے شرمانے لگے اور کتنے علماء یہاں پہنچ کر عقلی کاوشوں سے نجات پا گئے اور یقینِ کامل کے سرمایے سے مالا مال ہو گئے اور دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت بھی سدھار لی۔ کتنے اخلاق کے کچے معاملات کے کھوٹے یہاں تربیت پا کر معلمِ اخلاق ومعاملات بن گئے ' کتنے ناآشنائے حقیقت محض کشف وکرامات اور الوان ولطائف کے حصول میں جان کھپانے والے آئے اور یہاں آن کر ان پر دین کی اصل حقیقت کھل گئی اور محض "رضائے الٰہی" کا حصول ان کا مدّعا بن گیا۔ اس خانقاہ پر انوارِ الٰہی کی جو بارش ہوتی تھی اس کو لوگوں نے محسوس ہی نہیں کیا بلکہ بعض نے کھلی آنکھوں اس کا مشاہدہ بھی کیا۔ حضرت حافظ جلیل احمد صاحب علی گڑھی مولانا تھانوی کے خلیفہ تھے ایک مرتبہ رات کی ٹرین سے تھانہ بھون آئے جب ٹرین خانقاہ کے محاذ سے گزر رہی تھی تو انہوں نے صاف دیکھا کہ خانقاہ کی مسجد کے گنبد سے آسمان تک انوار کا تار بندھا ہوا ہے۔

حضرت مولانا کی مجدّدانہ شان کا یہ وصف بہت ممتاز ہے کہ آپ نے اپنی خارجی وداخلی زندگی کا ایسا

Marfat.com

اصولی نمونہ پیش کیا کہ دنیا جان گئی اہلِ حق ایسے بھی ہوتے ہیں خانقاہ امدادیہ میں وہ سارے اصول برتے جاتے تھے اور ان پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا جن پر ایک استاد شاگرد اور پیر و مرید کے زیادہ سے زیادہ افادے کا مدار ہے یہ اسی اصول پسندی کا اعجاز تھا کہ تنہا حضرت تھانوی نے علمی و عملی وہ نقوش چھوڑے اور کثرت سے چھوڑے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے اور اہلِ علم یہ جانتے ہیں کہ یہ سب اصول معلمِ اخلاق صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ماخوذ و مستنبط تھے۔

Marfat.com

مولانا اشرف علی تھانویؒ (2)

تھانہ بھون کی خانقاہِ امدادیہ میں حکیم الامت کے شب و روز جس عالَم میں گزرتے تھے اگر اس کا ہلکا سا نقشہ یہاں پیش کر دیا جائے تو مضائقہ نہ ہوگا کہ اس مضمون کی اصل غرض و غایت یہی ہے۔ قارئین دیکھ لیں اور جان جائیں کہ ایک مصلح، ایک شیخ، ایک مصنّف، ایک معلّم، ایک مفسّر، ایک واعظ اور ان سب سے بڑھ کر ایک انسان، ایک مسلمان اور ایک مردِ مومن کے شب و روز کیسے ہوتے ہیں۔ بقول مولانا عبدالماجد دریا آبادی: حضرت شیخ کے کمالات و فضائل اپنی جگہ پر، بہرحال اشرف علی تھانوی نامی ایک انسان تواسی صدی میں ہوئے ہیں۔ ان کی عمر کے آخری پندرہ سولہ سال کے زمانے میں اس نامۂ سیاہ کو ان سے نیاز اور اپنی بساط کی حد تک گہرا نیاز حاصل رہا اور اس نے اپنے لمبے تجربے اور سابقے میں انہیں ایک بہترین انسان پایا اور چونکہ ان کی انسانیت ان کے مفسّر و فقیہہ درویش ہونے سے الگ بھی نہیں کی جا سکتی اس لئے ضمناً ذکر ان کے علم و فضل اور تفقّہ و سلوک کا بھی ناگزیر ہو گیا۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ان پندرہ سولہ برسوں میں عبدالماجد دریاآبادی مرحوم نے مولانا اشرف علی کو کیسا پایا، اس کی تفصیل انہوں نے اپنی ضخیم تالیف "حکیم الامت" میں بیان فرمائی ہے۔ مولانا تھانوی کی زندگی کے آخری پندرہ برسوں کا یہ ایک نرالا مرقع ہے اور اس میں فقہ، تفسیر، حدیث، سلوک و کلام اور ادب و حکمت کے صدہا مضامین سمٹ آئے ہیں۔ مولانا عبدالماجد کی حکیم الامت سے پہلی ملاقات کا احوال بڑا دلچسپ ہے اور

Marfat.com

اس سے پتا چلتا ہے کہ ان دنوں میں خانقاہ میں مولانا تھانوی کی آمدورفت' نشست و برخاست' مہمانوں، طالبینِ اصلاح اور اپنے ہمعصروں سے ملاقاتوں کے کیا طور طریق اور ضابطے قائم تھے۔ مولانا عبدالماجد کچھ عرصہ قبل ہی کفروالحاد کی وادیوں میں ٹھوکریں کھانے کے بعد نئے سرے سے اسلام پر ایمان لائے تھے اور اب زوروشور سے اسلام کی تبلیغ اور اپنی اصلاح کے کام میں مشغول تھے۔ اس زمانے میں ان کا اخبار ہفتہ وار "سچ" باقاعدگی سے نکلتا تھا اور اسی اخبار کی ایک اشاعت میں "مرشد کی تلاش" کے عنوان سے ایک مضمون بھی ان کے قلم سے نکلا تھا اس کے بعد ہی ان کی رسائی آستانۂ اشرفیہ تک ہوئی۔ مولانا تھانوی سے اوّلین ملاقات کیسے ہوئی یہ مولانا دریاآبادی سے سنئے:

"مہینہ یہی جولائی کا تھا...... ہائے یہی مہینہ جس نے پندرہ سال بعد دل و جگر خون کر ڈالا۔ تیس جون 28ء کی شب تھی کہ سہارنپور...... شاہدرہ لائن کے قدیم سٹیشن تھانہ بھون پر تین مسافروں کا ایک مختصر سا قافلہ کوئی دس ساڑھے دس بجے اترا۔ سالارِ قافلہ دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحب اور باقی دو میں سے ایک مولانا عبدالباری ندوی (استاد جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن) اور دوسرا یہ نامۂ سیاہ "سچ" کا ایڈیٹر "ہمدرد" دہلی کا ڈائریکٹر اور صوبہ اودھ کی خلافت کمیٹی کا صدر...... اس وقت تک ٹاؤن کا سٹیشن کھلا نہ تھا' وہی پرانا سٹیشن تھا جو اب عوام کی زبان پر جلال آباد کے نام مشہور ہے۔ یہاں سے قصبہ تھانہ بھون کا فاصلہ کوئی تین میل کا ہو گا۔ تانگہ کرایے پر کیا او سنسان راستوں سے گزرتے ہوئے کوئی آدھ گھنٹے میں قصبے کے اندر پہنچ گئے۔ جذبات میں جب بجائے جزر کے مدّ ہو اور خیالات میں تلاطم ہو تو یہی آدھ گھنٹہ کئی گھنٹوں کا معلوم ہونے لگتا ہے۔ عقیدت تازہ بھی تھی اور تیز بھی۔ تخیّل خوب خوب نقشے پیش کرتا رہا۔

تانگہ خانقاہِ امدادیہ کے دروازے پر رکا۔ امدادیہ کو یہاں کوئی صاحب انگریزی لفظ (CO-OPERA-TIVE) کا ترجمہ نہ سمجھ لیں جیسا کہ آگرے کے ایک مشہور شاعر چند سال ہوئے یہی سمجھے تھے۔ مولانا اشرف علی کے مرشد حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ کا وطن بھی یہی قصبہ تھا یہیں ان کا حجرہ اب تک اسی حالت پر قائم ہے اور صحن' مسجد' عمارت اور خانقاہ میں بہت زیادہ اضافہ کر کے مجموعے کا نام انہی کے اسم مبارک پر خانقاہ امدادیہ رکھ دیا گیا ہے۔ رات زیادہ جا چکی تھی۔ خانقاہ کا پھاٹک قدرتاً بند ملا۔ مولانا حسین احمد صاحب کی رفاقت پھر کام آئی۔ حکیم الامت کے ایک خادم کو ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے پڑوس کے ایک چھوٹے سے مکان میں تین چارپائیوں کا انتظام کر دیا۔ اب بقیہ رات کسی طرح گزارنا تھی یکم جولائی کی مختصر سی رات اس کے گھنٹے بھی اب گے باقی رہ گئے تھے۔ عقیدت کا وفورِ جوش اتنے گھنٹے بھی کب سونے دیتا ہے۔ کچھ سوتے' کچھ جاگتے' باقی رات بھی کٹ گئی اور نماز فجر کا ابھی بالکل اوّل وقت تھا کہ ہم لوگ دیدار اشرف" کیلئے تیار ہو گئے۔

جس مکان میں مولانا تھانوی اس وقت قیام فرماتے تھے اس سے خانقاہ اور مسجد کوئی سو گز کے فاصلے پر ہو گی اور جہاں ہم لوگ رات کو ٹھہرائے گئے تھے وہ حضرت کے کاشانے سے کوئی دس ہی گز کے فاصلے پر تھا

Marfat.com

اور حضرت کا راستہ اسی طرف سے تھا میں اشتیاق کا مارا بہت تڑکے گھر سے نکل عین راستے پر ذرا کنارے ہٹ کر کھڑا ہو گیا کہ زیارتِ جمال پہلے یہیں ہو جائے۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ آرزو پوری ہوئی ایک بزرگ ادھر سے گزرے۔ مسن، لیکن خوش رُو نظریں نیچی، چال متین، نورانی چہرہ، نورانی داڑھی، زیادہ سفید کچھ سیاہ اور شاید اسی نورانیت کی مناسبت سے لباس بھی خوب سفید بُراق، سر پر نازک سی گول اُبھری ٹوپی، جسم پر لمبا کرتا، نازک و نفیس غالباً تن زیب کا، تاریکی ابھی کچھ باقی تھی اور ذرا فاصلہ بھی تھا۔ نگاہ سے نگاہ ملنے کا کوئی موقع نہ تھا اور کہنا چاہیئے کہ صرف جھلک ہی دیکھنے میں آئی تھی اس پر بھی دلکشی، رعنائی، زیبائی بحیثیت مجموعی ایسی محسوس ہوئی کہ زبان نہ سہی، دل تو بے اختیار آواز دے ہی اٹھا۔

قربان بہ یک نگاہِ تو عمرِ درازِ ما

نماز ہوئی حضرت ہی نے پڑھائی۔ خود ہی پڑھانے کا معمول تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ بار بار امام بدلتے رہنے سے جماعت کے نظم میں فرق آ جاتا ہے۔ اکثر عادت فجر کے وقت کسی قدر طویل قرأت کی تھی۔ مثلاً: سورۃ الدہر یا المنافقون۔ صورت کی دلکشی کا تجربہ ابھی ہو چکا تھا صوت کی دلکشی کا اندازہ اب ہوا اور غالب کے دیوان سے ندا آئی

وہ جنتِ نگاہ، یہ فردوسِ گوش ہے

تجوید خود ایک مستقل فن ہے اس کے معیار سے اظہار رائے صرف ماہرینِ فن کا کام ہے یہاں ذکر آواز کی صرف دلکشی اور تاثیر کا ہے۔ اس عامیٔ محض کو اپنی عمر میں ہندوستان کے علاوہ عرب و مصر سے بھی آئے ہوئے اچھے اچھے قاریوں کو سننے کا اتفاق ہوا ہے مشہور و غیر مشہور دونوں قسم کے بعض باکمالوں کی داد بھی دل کھول کر دی ہے بعض سے طبیعت متاثر بھی بہت ہوئی ہے لیکن اس درجہ مؤثر لہجہ، اتنے خوبصورت بول شاید ہی کبھی کسی کے سننے میں آئے ہوں۔ ہر لفظ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سانچے میں ڈھلا ہوا نکل رہا ہے اور پھر بالکل ہی سادہ اور بے تکلف...... کہیں سے شبہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ کوئی شخص فن کے قواعد کے لحاظ سے ادا کر رہا ہے۔ صاف یہی معلوم ہوتا تھا کہ قدرتی لہجہ اور طبعی لحن ہے۔ نماز کے طویل قیام میں، میں بڑا کچا اور بودا ہوں۔ یہ قرأت اشرفی کا اعجاز تھا کہ طویل قرأت سے بھی جی اکتانا کیسا، جی یہی چاہے گیا بھی سنتے جایئے۔ ادھر قرأت ختم ہوتی جاتی تھی اور اِدھر حسرت باقی رہی جاتی ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی اور شاخ میں شاخ کیسی نکل آئی ذکر اس خاص نماز اور پہلی نماز کا تھا اور چھڑ گئی مولانا کی عام خوش نوائی کی داستان...... نماز ختم ہوئی، سلام پھیرا، دعا مانگ کر جونہی حضرت اٹھے ہیں نگاہ پہلی صف میں مولانا حسین احمد پر پڑ گئی ان کی طرف خود ہی بڑے تپاک سے بڑھے اور بڑے التفات سے ملے لوگ تو کہتے تھے بڑے خشک مزاج ہیں خشک مزاج ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یہ نرم بشاش چہرہ، یہ ہنستا مسکراتا بشرہ کہیں خشک مزاج کا ہو سکتا ہے؟ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ ان کے اور انکے درمیان بے لطفی ہے۔ ناچاقی ہے۔ کانوں نے بے شک یہی سنا تھا لیکن اس وقت آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ دو دشمن نہیں،

Marfat.com

دو دوست گلے مل رہے ہیں۔

مولانا حسین احمد نے ہم دونوں کا تعارف کرایا ہم سے بھی شگفتہ اخلاق والتفات سے پیش آئے"۔

میں اتفاق سے چند ہفتے قبل ٹائیفائڈ میں مبتلا ہوا تھا حضرت نے کمال شفقت سے اس کا حوالہ دے کر خیریت دریافت فرمائی، میں دنگ کہ اس کی انہیں کیونکر خبر ہوئی۔ مجھے ہرگز توقع نہ تھی کہ میرا نام بھی کبھی حضرت کے کان میں پڑا ہو گا، رہی دو ایک بار کی خط و کتابت تو ایسے خط خدا معلوم کتنے روز ہی آتے رہتے ہوں گے۔ کس کس کے نام ذہن میں رہ سکتے ہیں، لیکن نہیں، 'ناواقفیت کیسی' یہاں تو میری تازہ علالت تک سے واقفیت و باخبری نکلی۔

خانقاہ میں آپ داخل ہو چکے ہیں اور نماز سے بھی اب فراغت ہو چکی ہے تو ایک نظر اس عمارت پر بھی کرتے چلیے۔ خانقاہ کی عمارت قصبے کی بالکل مغربی سرحد پر ہے کوئی دو فرلانگ پر ٹاؤن کا ریلوے سٹیشن ہے۔ قصبے کی اکثر پرانی شاندار عمارتوں کی طرح سڑک بھی پرانی لکھوری اینٹ اور کھڑنجے کی ہے۔ عین خانقاہ کے دروازے تک آتی ہے پھاٹک کے اندر ایک وسیع صحن، کنارے کنارے چاروں طرف پختہ بر آمدہ یا ٹین کا سائبان اس سلیقہ مندی کے ساتھ کہ آدمی برسات میں ٹین کے نیچے نیچے پورا چکر لگا لے، نصف صحن کے قریب ایک پختہ حوض زیادہ حصہ پٹا ہوا' ایک لمبا حصہ کھلا ہوا...... لیکن برا معلوم نہیں ہوتا۔ پھاٹک میں داخل ہوتے ہی آپ کو دونوں طرف غسل خانے ملیں گے۔ چھوٹے لیکن ضرورت کیلئے کافی۔ جاڑوں میں پانی گرم کرنے کا انتظام موجود اور سائبان کے نیچے بالکل متصل کنواں، بروٹھا طے کر کے آپ اندرونی دروازے میں داخل ہوئے، جوتے اتارے کہ صحن مسجد شروع ہو گیا جوتا رکھنے کیلئے ایک چیڑ کا بڑا بکس کھلا رکھا ہوا...... اب آپ مشرق سے بائیں طرف یعنی شمال کی جانب مڑے یہیں کنواں، اس کے آگے بیت الخلا جانے کا راستہ' اس کے بعد مہمان خانے کا زینہ' مہمانوں کیلئے کمرہ کوٹھے پر' سادہ مگر ہوادار' گنجائش اتنی کہ چار مہمان ایک وقت میں چارپائیوں پر آسانی سے لیٹ سکیں۔ زینے سے چند ہی قدم اور چلے کہ اپنے دائیں ہاتھ کو یعنی مغرب کی جانب رخ کرنا پڑا۔ ایک لمبا برآمدہ ملا۔ اس برآمدے میں دو سہ دریاں ہیں۔ پہلی سہ دری کے عقب میں کتب خانے کا کمرہ' دوسری سہ دری میں خاص حضرت کی نشست گاہ' ایک حجرہ اس کے عقب میں' دوسرا حجرہ اس کے مغربی کونے پر...... یہی حجرہ حضرت حاجی صاحب" کا تھا...... ایک کوٹھڑی اس کے جواب میں برآمدے کے مشرقی کونے پر۔ اب دوسری سہ دری سے نکل کر مسجد میں آ گئے۔ مسجد کچھ ایسی بڑی نہیں، لیکن بڑی پُررونق اور پُرانوار۔ ختم مسجد کے بعد اسی مغربی لائن میں دالان اور اس کے عقب میں طالبین وسالکین کیلئے حجرے...... اس کے ختم پر زینہ اور کچھ حجرے یہ سب طالبعلموں کیلئے ہیں۔ لیجئے مکان کی ناپ جوکھ میں ہم آپ کچھ ایسے محو ہوئے کہ مکین ہی کی طرف سے غافل ہو گئے۔ حضرت ہم تینوں کو لئے ہوئے صحن مسجد سے چار قدم چل کر بیٹھے۔ اب اخلاق والتفات ہم تینوں سے فرداً فرداً شروع ہوا۔ بار بار فرماتے تھے: اچھی طرح بیٹھئے' کھل کر بیٹھئے' یہاں

Marfat.com

ہیبت شروع ہی سے دل میں بیٹھی ہوئی تھی۔ لطف و کرم کا ہر فقرہ اس کیفیّت کی افراط میں اعتدال پیدا کرتا جاتا تھا۔ خانقاہ میں طالبین و سالکین کا ایک گروہ ذکر و شغل میں مشغول ہمیشہ موجود رہا کرتا۔ مولانا کا معمول تھا کہ بعد نمازِ فجر سب سے پہلے انہی کے کام کی طرف متوجہ ہوتے یہ لوگ اپنے حالاتِ باطنی لکھ لکھ کر سہ دری میں لگے ہوئے لیٹر بکس میں ڈال دیتے۔ حضرت خود اسے اپنے ہاتھ سے کھولتے۔ ایک ایک پرچہ پڑھ کر، ہر ایک کے مناسبِ حال اسی پر جواب اور ہدایتیں لکھ، پرچوں کو مسجد کے منبر پر رکھا دیتے۔ اس سے فارغ ہو کر کلامِ مجید کی تلاوت کرتے، حافظِ قرآن ہونے کے باوجود اکثر چھوٹی حمائل ہاتھ میں لئے ہوا خوری کیلئے آبادی سے باہر نکل جاتے۔ آج یہ معمول کچھ دیر کیلئے ملتوی رہا۔ حضرت ہم لوگوں کی خا[illegible] میں لگے رہے۔ چائے منگوالی، حالانکہ خود چائے نہیں پیتے تھے پُرشفقت مکالمت کا سلسلہ کوئی پون [illegible]ٹے جاری رہا۔ اس کے بعد حضرت نے اپنے دوسرے معمولات پورے کرنے کیلئے ہم لوگوں سے [illegible] چاہی۔ اس التجا اور لجاجت کے لہجے میں گویا وہ چھوٹے ہیں اور ہم لوگ بڑے۔

دوسری نشست چاشت کے وقت شروع ہوئی اس میں حضرت نے خوب کھل کر باتیں کیں۔ مختلف بزرگوں کے واقعات، عام دینی ہدایات، اخلاقی و روحانی مذاکرات، سب بڑے دلکش دلچسپ و مؤثر انداز میں..... واعظانہ خشکی کا نام و نشان نہیں۔ یہ نشست حضرت کی خاص سہ دری میں ہوئی۔ درمیان میں شرقی غربی دیوار سے متصل، ڈیسک کے سامنے ایک مسند نما فرش پر حضرت تشریف فرما ہاتھ میں تسبیح، ایک چھوٹی گھڑی سامنے ڈیسک پر قلمدان وغیرہ ساتھ رکھی ہوئی، دوسری بڑی گھڑی، دھوپ گھڑی کے حساب سے دیوار میں لگی ہوئی، داخلہ والے در پر حضرت کا نظام نامۂ اوقات لگا ہوا، غافل انسان کو وقت کی قیمت اور اہمیت کا سبق دینے والا، بیٹھنے بٹھانے، سب کے آداب قاعدے حضرت کی مجلس میں مقرر تھے۔ ہر چیز میں ترتیب اور ڈھنگ، ہر بات میں نظم اور ہم آہنگ، یہ تو مجلسِ خاص اور خصوصی تھی بعدِ ظہر مجلسِ عام میں بھی قاعدہ تھا کہ ہر شخص جہاں جگہ پائے، بیٹھ جائے، کسی دوسرے کو نہ اٹھائے، نہ کھسکائے۔

یاد کر لیجئے کہ 1928ء تھا، باتیں خوب ہوئیں، صبح اور دوپہر کی ملا کر طویل صحبت میں سیاسی پہلوؤں پر گفتگو آ جانا ناگزیر ساتھا۔ گفتگو آئی، حضرت نے اتنی معقولیت سے کی کہ ساری بدگمانیاں دُور ہو کر رہیں۔ کون کہتا ہے کہ حضرت "گورنمنٹی" آدمی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ جس نے بھی ایسا کہا، جان بوجھ کر یا بے جانے، بہر حال جھوٹ ہی کہا یہ تو خالص مسلمان کی گفتگو تھی۔ مسلمان بھی ایسا جو جوشِ دینی اور غیرتِ ملی میں کسی "خلافتی" سے کم نہیں۔ پاکستان کا تخیّل، خالص اسلامی حکومت کا خیال، یہ سب آوازیں بہت بعد کی ہیں پہلے پہل اس قسم کی آوازیں یہیں کان میں پڑی۔

☆ ☆

حضرت کی مالی و معاشی حالت اگر کچھ زیادہ اچھی نہ تھی تو بری بھی نہیں کہی جا سکتی۔ بہتوں سے بہتر تھی۔ اولاد کوئی نہ تھی لیکن محل دو تھے۔ دونوں کیلئے الگ مکان ایک دوسرے سے فاصلے پر..... ملازم بھی

Marfat.com

دو تھے، دونوں ایک ایک ڈیوڑھی پر..... دونوں کے ساتھ مولانا کا برتاؤ قابلِ دید تھا، بجائے خود ایک درسِ ہدایت...... کام کو جب فرماتے، تو خوب ٹھہر ٹھہر کر سمجھا کر...... اکثر تکرار کے ساتھ فرماتے کہ غلط فہمی کا احتمال نہ رہے۔ ملازمین جب آتے، تو حکم تھا کہ زبان سے السّلامُ علیکم کہہ کر بیٹھ جائیں بات چیت بیٹھ کر کریں، بلاضرورت کھڑے نہ رہیں۔ کام کی مشقت کبھی بہت زائد نہ ڈالتے۔ کام بگاڑتے، تو حضرت غصّہ بھی فرماتے اور غصّہ کرنا ایسے موقع پر تو امرِ طبعی ہے، لیکن اس میں بھی حدود کے اندر رہتے مسجد سے چھوٹے زنانہ مکان کا فاصلہ اچھا خاصا تھا، لیکن شب میں عشاء کے بعد جب گھر تشریف لے جاتے، تو لالٹین اپنے ہاتھ میں لئے رہتے، کسی ملازم کو اس کیلئے نہ بلاتے کبھی کوئی بات ہنسی کی بھی ان سے کہہ دیتے جس سے ان کا دل کھِل جاتا۔ برتاؤ ہمیشہ خشک ہی نہ رکھتے۔ ان کے کپڑوں، ان کے بیوی بچوں سب کا لحاظ رکھتے۔

حضرت کی شان ہی سب سے الگ، سب سے نرالی تھی۔ نہ فقروفاقہ، نہ تجرّد، نہ بیوی بچوں کا ترک اور شدید قسم کے مجاہدے اور نہ رسمی درویشی اور مشائخیّت کے کوئی بھی آداب ورسوم، بلکہ دیکھنے میں سارا سامان دنیاداری ہی کا موجود...... اچھے خاصے پختہ اور بلند مکان، نوکر چاکر، کھانے دو دو تین تین قسم کے لباس خاصا اجلا شفاف بڑی زبردست ڈاک کی آمد، غرض بظاہر ہر طرف دنیا ہی دنیا، لیکن وہ دنیا ایسی کہ اس کے ہر جزو پر دین کی حکومت غالب طبیعت وبشریت کی پوری پوری آزادیاں، لیکن وہی شریعت کی پابندی میں مولانا کی ذات خود دینی حیثیت سے عجب ذات تھی کوئی صرف فقیہہ ہوتا ہے اور طریقت سے کورا، کوئی محض صوفی ہوتا ہے اور کلام کے مباحث سے نا آشنا، یہ حضرت ایک ہی وقت میں صوفیٔ محقّق بھی تھے اور متکلمِ بے بدل بھی، رومیٔ عصر بھی اور رازیٔ وقت بھی، فقہ اصولِ فقہ، تفسیر، حدیث و تصوّف کے علاوہ کلامِ قدیم وجدید کے بھی خدا معلوم کتنے مسائل یہاں مجلسوں میں وعظوں میں برابر بیان ہوتے رہے اور ہم جیسے کتنے بےمایہ اور کم مایہ یہیں سے خوشہ چینی کر کر کے اپنی بات بناتے، اپنی دکان چمکاتے...... گفتگو کا بیشتر حصّہ مولانا خود فرماتے، لیکن دوسروں کو بھی بے تکلّف بولنے چالنے، پوچھنے اور سوال وجواب کرنے کی اجازت تھی کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی سائل کے سوال پر خود ہی مولانا کسی فقہی، کلامی تفسیری، سلوکی مسئلے پر کوئی مستقل و مسلسل تقریر ذرا لمبی شروع فرما دیتے جسے حاضرین بڑی انشراحِ قلب سے سنتے، لیکن ایسا بہت کم ہوتا عموماً اور بیشتر یہ تھا کہ معمولی طرز پر دوستوں کے درمیان جیسے ہی گفتگو ہوا کرتی ہے ہوتی رہتی اور بغیر اس کے کہ سننے والے کوئی دماغی بار محسوس کرنے پائیں کہ انہیں کوئی خاص تعلیم دی جارہی ہے، خدا جانے کتنے مسائل، کتنے کام کی باتیں، باتوں باتوں میں ان کے کان میں پڑ جاتیں۔

ان طویل صحبتوں اور روزمرہ گفتگوؤں نے رفتہ رفتہ بتایا اور دل میں اتارا کہ اصل شے تو احکامِ شریعت ہیں۔ مدارِ کار تو اتباعِ کتاب وسنّت پر ہے۔ البتّہ پورے اخلاص وتزکیہ قلب کے ساتھ...... اللہ کے حقوق بقدرِ امکان ادا کیجئے، فرض وواجبات میں حتّی الامکان غفلت نہ کیجئے اللہ کے بندوں سے اچھی

Marfat.com

طرح ملئے جلئے، باپ، بھائی، بیٹے، بیوی، شوہر، ماں، بہن، لڑکی، استاد، شاگرد، ملازم، آقا، دوست، پڑوسی سب کے حق پہچانئے اور امکان بھر ادا کیجئے۔ بلاضرورت دنیا کے مخمصوں اور دوسروں کے قصے قضیے میں نہ پڑیئے۔ بلاوجہ کسی کی ادنیٰ سی بھی دل آزاری، دل شکنی نہ کیجئے، احتسابِ نفس کرتے رہئے، اپنی صلاح کی فکر میں لگے رہئے، طاعتِ ارادی کو جانے نہ دیجئے، غفلتِ غیر ارادی کی پرواہ نہ کیجئے، بس یہی عطرِ تصوّف اور جانِ طریقت ہے جو علوم و معارف روزمرہ کی ان بے تکلف مجلسوں میں سننے میں آتے رہے، ان کی بات ہی کچھ اور ہے۔ گہری سے گہری باتیں دلچسپ رنگ میں ادبی لطیفے مزاحی چٹکلے، لفظی مناسبتوں کے مظاہرے اس پر مستزاد...... بڑا ہی ظالم بلکہ مفتری تھا وہ جس نے ایسے پیارے من موہنے مولانا کو خشک مشہور کیا۔

.... ☆ .... ☆ ....

عتاب کے منظر بھی اس مدّت میں بارہا دیکھے۔ مولانا کے ہاں کوئی چیز راز کی پوشیدہ نہ تھی۔ یہ منظر اکثر دوپہر کی مجلسِ عام میں پیش آتے۔ مولانا بڑے ہی لطیف المزاج اور ذکی الحس تھے۔ کسی بے ڈھنگی اور بے قاعدہ بات کی برداشت نہ تھی۔ لوگ آتے اور ذرا بھی بے قاعدہ باتیں کرتے کہ موردِ عتاب ہو جاتے۔ تکلّف اور مصنوعی ادب و تعظیم تو گویا حضرت کی چڑ تھی اور لوگ عموماً اسی کے عادی ہیں...... خیر، جس پر جو گزرنا ہوتی، گزر جاتی، لیکن اتنا فائدہ بہرحال ہوتا کہ خود اس کو بھی آئندہ کیلئے سبق مل جاتا اور دیکھنے والوں کو بھی ہدایت و بصیرت ہو جاتی۔ صحبتِ بابرکت کی ایک خاص برکت یہ تھی کہ اپنی کوتاہیاں، اپنے عیوب، اپنے گناہ مشاہدے میں آ جاتے اور بغیر اس کے کہ مولانا خطابِ خاص سے مخاطب فرمائیں یا صراحتاً کسی کو اس کے عیب پر توجہ دلائیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جیسے غفلت کے پردے نگاہوں سے از خود ہٹتے جاتے ہیں اور عمر بھر کی عادتیں بے نقاب نظر آنے لگتی ہیں۔ مولانا اپنے نیازمندوں سے رازداری برتتے تھے تاہم اصلاحی شان سب پر غالب تھی اور اپنے مخلصوں کو ضرورت کے موقع پر ضررِ دینی سے بچانے کیلئے نہ ٹوکنا، تدوین و آئینِ صداقت کے بجا طور پر خلاف سمجھتے تھے۔ طبیب کی دوستی اور خیراندیشی یہی ہے کہ وہ مریض کی مرضی پر نہیں، مریض کے مرض پر نظر رکھے۔ اللہ نے کیا دل اور کیا دماغ اور پھر ساتھ ہی کیا قلم دیا تھا پورے پورے علوم چھوٹے چھوٹے فقروں کے اندر سمائے ہوئے ہوتے تھے اور تسکینِ قلب کا تو معلوم ہوتا کہ ایک اتھاہ سمندر ہر وقت بہہ رہا ہے۔ بدتر سے بدتر اپنی حالت پیش کیجئے اور جواب میں تسکین و تسلّی ہی حاصل کیجئے۔ مایوس کرنا تو گویا حضرت جانتے ہی نہ تھے۔

حضرت کے خلیفہ اور عاشقِ زار خواجہ عزیز الحسن مجذوب صاحبِ "اشرفُ السّوانح" نے ایک بار نہایت حسرت سے عرض کیا کہ حضرت، جب میں خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو قلب کی حالت بہت اچھی ہو جاتی ہے اور جب یہاں سے چلا جاتا ہوں تو رفتہ رفتہ پھر حالت خراب ہو جاتی ہے۔ فوراً نہایت لطف کے

Marfat.com

ساتھ تسلی فرمائی: "پھر ہرج ہی کیا ہے؟ آپ اپنے کپڑے میلے کر دیتے ہیں' دھوبی ان کو دھو دیتا ہے' آپ پھر میلے کر دیتے ہیں' دھوبی ان کو پھر دھو دیتا ہے" چنانچہ مولانا کا یہ اثر عام تھا کہ جس کو تعلق ہو گیا اسے شریعت پر عمل کرنے کا بے حد اہتمام ہو جاتا اور جائز و ناجائز کا بہت خیال رہنے لگتا تھا ایک اہلِ علم نے اپنے مدرسے کی مسجد میں کسی اجنبی طالبعلم کو دیکھا کہ مسجد کے چراغ کی روشنی میں مطالعہ کرتے کرتے جب وہ وقت آیا جو وہاں کے معمول کے مطابق چراغ گل کر دینے کا مقرر تھا تو اس طالبعلم نے فوراً مسجد کا چراغ گل کر کے اپنا ذاتی چراغ روشن کیا اور مطالعہ کرنے لگا۔ یہ دیکھ کر ان اہلِ علم نے کسی سے کہا معلوم ہوتا ہے یہ طالبعلم مولانا اشرف علی تھانوی سے تعلق رکھتا ہے' ورنہ ایسی احتیاط کون کرتا ہے بعد کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہ واقعی مولانا سے بیعت تھا۔

ایک حجام' حضرت سے بیعت ہوئے' تو اپنا پیشہ محض اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ اس میں اکثر مسلمانوں کی داڑھیاں مونڈنی پڑتی تھیں انہوں نے پکوان سیکھا اور اسی کو اپنا ذریعہ معاش بنایا' پھر اپنی دیانت داری کی وجہ سے اس درجے مقبول ہوئے کہ آمدنی پہلے سے بھی کہیں زیادہ بڑھ گئی اور عمدہ عمدہ غذائیں نصیب میں آئیں۔ یہ حال جب غیر تعلیم یافتہ افراد کا ہو گیا تو جو اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے' ان کا پوچھنا ہی کیا...... ڈاکٹر عبدالحئی صاحب نے بی اے اور ایل ایل بی کی سند علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی اور وکالت کو ذریعۂ معاش قرار دیا' مگر حضرت تھانوی ؒ کے ساتھ جب تعلق استوار ہوا تو خود بخود وکالت ترک کر دی اور ہومیو پیتھی کی تعلیم حاصل کی اور اب کوئی پچاس برس سے ایک کامیاب معالج کی حیثیت سے مخلوقِ خدا کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اہلِ تعلق میں یہ اثر نہ صرف حضرت شیخ کی نگرانی و تربیت کا نتیجہ تھا بلکہ خود آپ کے عمل مستحکم کا باعث بھی تھا ایک مرتبہ مولانا تھانوی ؒ سہارنپور سے کانپور تشریف لے جا رہا تھے کچھ گنے ساتھ تھے۔ مولانا نے ضابطے کے تحت ان کو تلوانا چاہا' سٹیشن کے غیر مسلم ملازمین نے ازراہِ عقیدت عرض کیا. آپ یونہی لے جایئے' تلوانے کی ضرورت نہیں' ہم گارڈ سے کہہ دیں گے مولانا نے فرمایا: یہ گارڈ کہاں تک جائے گا؟ غازی آباد تک ارشاد ہوا: غازی آباد سے آگے کیا ہو گا؟ جواب ملا: یہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا۔ مولانا نے پھر سوال کیا: آگے کیا ہو گا؟ انہوں نے بتایا: دوسرا گارڈ کانپور تک پہنچا دے گا اور وہاں آپ کا سفر ختم ہو جائے گا یہ سن کو مولانا تھانوی ؒ نے فرمایا: جی نہیں' وہاں سفر ختم نہیں ہو گا بلکہ آگے ایک اور سفر آخرت کا بھی ہے وہاں کا انتظام کیا ہو گا؟ یہ سن کر سب دنگ رہ گئے اور کہا کہ ایسے محتاط بندے بھی ہوتے ہیں غرض غیر اقوام پر مسلمانوں کی ساکھ اسی طرح قائم ہوتی ہے مگر شب و روز نے ہزاروں کروٹیں بدلی ہوں گی کہ نادانوں اور نفس پرستوں نے اسے یکسر محو کر دیا تھا۔ مولانا تھانوی ؒ نے اسے پھر زندہ کیا یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ مولانا کے متعلقین میں حلال و حرام کی تمیز' ادائے حقوق کا پاس' صفائے معاملات کا لحاظ اور احتسابِ نفس کی گرمجوشی ملے گی۔ چنانچہ حضرت کی تمام تر روک ٹوک اور دارو گیر کا منشا اپنے متبعین میں بھی اسی فکر و اہتمام ذہن کا پیدا کر دینا ہے جو سارے اعمالِ حسنہ کی جڑ ہے

Marfat.com

اور جسے حضرت دُھن اور دھیان سے تعبیر فرمایا کرتے ہیں۔ حضرت کا ارشاد یہ بھی ہے کہ اگر اصول تو ہوں نرم، لیکن ان کی پابندی کرائی جائے سختی سے تو یہ سختی نہیں، بلکہ مضبوطی ہے جیسے ریشم کا رسا، نرم تو ایسا کہ چاہے اس میں گرہ لگالو لیکن ساتھ ہی مضبوط بھی اتنا کہ اگر اس سے ہاتھی کو باندھ دیا جائے تو وہ بھی اسے توڑ نہیں سکتا، لہٰذا ریشم کے رسّے کو سخت نہ کہا جائے گا، بلکہ مضبوط کہا جائے گا۔ اس کے برعکس لوہے کی زنجیر کو سخت کہا جائے گا کہ لوہا اپنی ذات ہی میں سخت ہے۔ اگر زنجیر کسی کے پیروں میں ڈال دی جائے تو وہ پیروں ہی کو زخمی کردے۔ بخلاف ریشم کے رسّے کے کہ پابند رکھنے کی صفت میں تو لوہے کی زنجیر سے بڑھ کر ہے، مگر اس سے پاؤں زخمی نہیں ہوتے، بلکہ بہت آرام میں رہتے ہیں اسی طرح اگر کوئی میرے یہاں آکر اصولِ صحیحہ کا پابند رہے تو اسے کبھی کسی ناگواری کا موقع عمر بھر بھی میری طرف سے پیش نہ آئے۔ لوگ خود ان صحیح اصولوں کو توڑ توڑ کر اور بے اصول باتیں کر کرکے اپنے ہاتھوں مصیبت میں پڑتے ہیں۔ الحمد اللہ میرے اندر حِدّت تو ہے شِدّت نہیں۔

اس پر ایک عاقل کا قول یاد آتا ہے۔ انہوں نے جب حضرت کی دارو گیر اور ڈانٹ ڈپٹ کے حالات سنے، تو نہایت گہرا اور پُر مغز سوال ایک صاحب سے کیا کہ مولانا کا بچوں کے ساتھ کیسا برتاؤ ہے۔ انہوں نے کہا بچوں کے ساتھ تو بہت بے تکلّف ہیں اور نہایت شفقت سے پیش آتے ہیں، کیونکہ جو سخت ہوتا ہے وہ بچوں کو بھی منہ نہیں لگاتا۔

حضرت کی اصلاح کا طریق نہایت عجیب، پُراثر اور نافع تھا۔ مختصر مختصر جملوں میں بڑی بڑی نفسانی بیماریوں کے علاج تجویز کر دیتے تھے ایک طالب نے عبادت میں کسل اور سستی کا علاج دریافت کیا۔ حضرت نے تحریر فرمایا: سستی کا علاج چستی...... ایک طالب نے غلبۂ خشیۃ...... میں لکھا کہ مجھے سخت خطرہ ہے حضرت نے جواب دیا: یہ خطرہ تو بحرِ معرفت کا قطرہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بڑھا کر دریا کر دے۔ خواجہ مجذوب نے اپنے ایک عریضے میں کوئی باطنی پریشانی بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ سخت الجھن ہوتی ہے۔ مولانا نے تحریر فرمایا: یہ الجھن مقدمہ ہے سلجھن کا۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا مزید ارشاد ہوا: شیخ کے ساتھ طالب کو کیا معاملہ رکھنا چاہئے۔ بس ان ہم قافیہ الفاظ کو یاد رکھے۔ اطلاع اور اتباع، اعتقاد اور انقیاد...... یہ بھی فرمایا اس طریق میں دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے۔ دُھن اور دھیان۔ ایک طالب نے شکایت کی کہ میں تو بالکل کورا رہ گیا، فرمایا: کورا ہونا برا نہیں، کور ہونا برا ہے۔ بلا سے کورا ہو، مگر کور نہ ہو۔ ایک بار فرمایا: اس طریق میں خود رائی نہ کرے بلکہ خود کو رائی کر دے، یعنی اپنے کو حقیر و ذلیل سمجھے۔ ایک صاحب کو خیال ہو گیا تھا کہ وہ ابدال ہو گئے ہیں فرمایا: ہاں، پہلے گوشت تھے اب دال ہو گئے۔ ارشاد ہوا: نئی تہذیب، تہذیب نہیں تعذیب ہے اور آج کل کی قومی ہمدردی، ہمدردی نہیں، ہمہ دردی ہے، شملے کے سفر کے بعد وہاں کی جو برائیاں غالب ہیں بیان کر کے فرمایا: ہم نے تو سنا تھا کہ شملہ بمقدارِ علم ہوگا، لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شملہ بمقدارِ جہل ہے۔

Marfat.com

ایک طالب کا خط فضول مضامین اور استفسارات سے لبریز تھا اور آخر میں لکھا تھا کہ مضمون طویل ہونے سے تکلیف ضرور ہوئی ہوگی۔ معاف فرمائیں۔ حضرت نے اس آخری بات کا یہ جواب تحریر فرمایا:

• خط طویل ہونے سے تو تکلیف نہیں ہوئی ' البتہ لاطائل ہونے سے ہوئی۔ ایک صاحب سے تحریکِ خلافت کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ حضرت نے فرمایا: کہ بلا امیرُالمومنین کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا: ہم آپ کو امیرُالمومنین بناتے ہیں فرمایا: جب تک امیرُالمومنین میں قوّتِ قہریہ نہ ہو' وہ امیرُالمؤمنین ہی نہیں...... میں ایسا امیرُالمومنین نہیں ہونا چاہتا کہ آج تو امیرُالمومنین بنوں اور کل کو اسیرُالکافرین ہو جاؤں۔

فرمایا: آج کل لوگوں کی نظر مال پر تو ہے 'مآل پر نہیں۔

فرمایا: لوگ بعض اہلِ صنعت کافروں کو بڑا عاقل سمجھتے ہیں کوئی کافر بھی کہیں عاقل ہو سکتا ہے؟ عاقل تو کیا ہوتے ہاں...... آکل خوب ہیں۔ فرمایا: دُرستی تو درشتی ہی سے ہوتی ہے ایک بار کسی سے کہا کہ آج کل کے اکثر مدعیانِ توکل تو کیا ہوتے 'اہل تاکل ضروری ہیں فرمایا: بعض طلبہ کی دستار بندی تو ہو جاتی ہے 'لیکن ان میں دس تار تو کیا' ایک تار بھی علم و عقل کا نہیں ہوتا' غرض اس قسم کے لطیفے جو سراسر آئینۂ حقیقت ہیں' حضرت کی زبانِ فیض ترجمان اور قلمِ ہدایت رقم سے بکثرت صادر ہوتے رہتے تھے۔

حضرت مولانا کے ہاں ڈاک کثرت سے آتی اور روز کے روز اس کا جواب جاتا۔ ڈاک آتے ہی جن تحریروں سے حضرت مانوس ہوتے خصوصاً پوسٹ کارڈ' انہیں اسی وقت پڑھ ڈالتے اور جواب ظہر کی مجلس کیلئے اٹھا رہتا۔ خطوط کی تعداد روزانہ تیس چالیس سے کیا کم ہوتی بلکہ اس سے بھی زائد...... پھر خط بھی مختصر اور چند سطری نہیں' بڑے لمبے چوڑے اور فقہ' سلوک' کلام وغیرہ کے مسائل سے متعلق...... اب حضرت ہیں اور خطوط کا پشتارہ اردگرد حاضرین' بزم جلسہ کئے ہوئے خواص بھی' عوام بھی...... مسئلے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے چھڑے ہوئے۔ حضرت لوگوں سے مخاطب بھی ہیں' حاجت مندوں کو تعویذ بھی لکھ لکھ کر دیتے جاتے ہیں اور خط کا جواب بھی اسی کے حاشیے پر یا بین السطور تحریر کرتے جا رہے ہیں۔ جواب کی جامعیت سبحان اللہ کتنا دماغ پایا تھا۔ عموماً یہ سارے جوابات اسی طرح قلم برداشتہ لکھ دیئے جاتے اور اتنے جامع اور محققانہ ہوتے کہ دوسروں سے شاید پورے غور و فکر کے بعد بھی نہ بن پڑتے...... اگر دن ختم ہو گیا اور ڈاک ختم نہ ہوتی' تو اب مولانا اس سن و سال میں بعد نمازِ مغرب واورادِ مغرب لالٹین سامنے رکھ اور قلم ہاتھ میں لے بیٹھ گئے ہیں اور رات تک کام کر کے ڈاک اپنے ہاتھ سے ختم کر کے ہی اٹھے ہیں۔ حضرت کی داخلی اور خارجی زندگی اتنی متوازن تھی کہ دیکھنے والوں کو نہ صرف اس پر حیرت ہوتی بلکہ اسے صریحاً کرامات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے سفر ہو یا حضر آپ نے کبھی فرمائشی وعظ کہے نہ وعظ گوئی کا کوئی معاوضہ قبول کیا۔ بلکہ اس درجہ احتیاط تھی کہ جہاں جاتے' عام دعوتوں سے گریز کرتے کہ یہ بھی معاوضے ہی کی ایک صورت ہے۔ اپنے ساتھیوں کا بار کسی پر نہ ڈالتے ہمراہیوں کو اس امر کی سختی سے تاکید تھی کہ جب تک میزبان ان سے بطورِ خاص درخواست نہ کرے اور وہ حضرت سے اس بارے میں اجازت حاصل نہ کرلیں کوئی دعوت

Marfat.com

قبول نہ کریں کبھی ایسے مقام پر قیام نہ کرتے جہاں عام مسلمانوں کو آنے اور ملاقات کرنے میں دشواری ہو۔ والیانِ ریاست اور امراء کی ملاقات سے عموماً گریز فرماتے' کیونکہ اس میں دینی نفع کی کوئی امید نہ پاتے تھے۔

جب سفر کا قصد کرتے تو پہلے اس کی غرض وغایت متعیّن ہوتی پھر اس کے مطابق سامان اور دوسری سہولتیں مہیا کی جاتیں۔ اتنے دنوں کیلئے ڈاک کا انتظام پہلے ہی کر لیا جاتا۔ دورانِ سفر ہر جگہ سے گھر کو خط لکھتے رہتے تاکہ اہل خانہ اور اہل خانقاہ مطمئن و بے فکر رہیں۔ سفر میں درجہ سوم کو ترجیح دیتے۔ اس دوران بھی خطوط کے جوابات اور تصنیف کا کام برابر جاری رہتا تھا۔ سفر کرتے ہوئے جب غیر مسلموں سے گفتگو کی نوبت آتی تو ایسی جامع اور دلنشین گفتگو کرتے کہ اہلِ باطل پر اسلام کی حقانیّت کا سکّہ بیٹھ جاتا تھا۔ سفر کے دوران کسی کو بیعت نہ کرتے' بلکہ اس سے کہتے کہ تھانہ بھون آ کر کچھ عرصہ دیکھ لے' صرف باتوں میں نہ آ جائے کہ باتیں بنانا بہت آسان ہے اصل شے عمل واخلاص ہے جس کے بغیر بیعت کا مقصد حاصل ہونا محال ہے۔ اس اصول میں دوسری مصلحت یہ تھی کہ لوگ بیعت کو محض رسم اور سستا سودا نہ سمجھ لیں' بلکہ اس کی حقیقت اور وقعت بھی ان کے ذہن نشین ہو جائے البتّہ سفر میں خواتین کو بیعت فرما لیتے' بشرطیکہ ان کا محرم ساتھ ہو۔

اب آیئے داخلی زندگی کی طرف تاکہ یہ بات بھی کھل جائے کہ وعظ و پند' اصول و ضوابط صرف اغیار ہی کیلئے نہ تھے بلکہ عمر کی نجی زندگی میں بھی اُن پر پُوری پُوری نگاہ رکھی جاتی تھی اس کا مختصر حال خواجہ مجذوبؒ کی زبانی سنئے۔ حضرت کی ازواجِ محترمات دو ہیں اور ان میں عدل کا اس درجے اہتمام ہے کہ شاید و باید۔ چونکہ حضرت حقوق العباد کے متعلق بہت زیادہ محتاط ہیں اس لئے عدل کی جزئیات میں بڑی دشواری پیش آئی' رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ نے سب دشواریاں آسان کر دیں اور عدل کا طریقۂ عمل سمجھ میں آ گیا بعض احباب کے اس کہنے پر کہ آپ نے تو عقدِ ثانی کا دروازہ کھول دیا' یہ جواب ارشاد فرمایا کہ نہیں' میں نے دروازہ کھولا نہیں ہے بند کر دیا ہے کیونکہ جب لوگ دیکھیں گے کہ عدل کی اتنی رعایت کرنی پڑے گی تو اسے دشوار جان کر عقدِ ثانی کی ہمت ہی نہیں کر سکیں گے۔

حضرت نقد یا غیر نقد جو کچھ دیتے ہیں دونوں بیویوں کو برابر دیتے ہیں اور اس کا یہاں تک اہتمام ہے کہ ایسی چیزوں کی تقسیم کیلئے جو وزن کی جاتی ہیں ایک نہایت صحیح کانٹا اپنی نشست گاہ کے سامنے لٹکا رکھا ہے جسے مزاحاً میزانِ عدل کہا کرتے ہیں۔ کھانا ایک دن ایک گھر میں اور ایک دن دوسرے گھر میں تناول فرماتے ہیں اگرچہ برادری میں ادائے مہر کا دستور نہیں ہے مگر حضرت نے دونوں گھروں میں مہر ادا کر دیا ہے بلکہ کہا کرتے ہیں کہ اگر عورت مہر' معاف بھی کر دے تب بھی مرد کی غیرت کا تقاضا یہی ہونا چاہئے کہ وہ مہر ادا کر دے۔ کرایہ مکان بھی ادا کرتے ہیں کہ اپنے دونوں مکان' دونوں بیویوں کی ملک میں دے چکے ہیں' حالانکہ شرعاً یہ رقم حضرت کے ذمے واجب الادا نہیں مگر غیرت طبیعت میں بے انتہا ہے اور کسی

Marfat.com

کا اتنا احسان لینا بھی گوارا نہیں۔اسی طرح حتی الامکان گھر والوں پر کوئی بوجھ نہیں ڈالتے۔ یہاں تک کہ کسی خاص کھانے کی بھی فرمائش نہیں کرتے۔ گھر میں نہایت نرم لہجے میں گفتگو کرتے ہیں اور اعزہ کے یا مہمانوں کے بچوں سے خوب مزاح فرماتے رہتے ہیں ایک بار فرمایا: میں تو بعض اوقات چولہے ہی کے پاس بیٹھ کر کھانا کھالیتا ہوں اور ضرورت کے وقت گھر کا کام کاج بھی کرتا ہوں غرض حضرت گھر میں مخدومیت کی شان سے نہیں رہتے اور گھر والوں کی طرف! ایسے ملتفت رہتے ہیں جیسے ان کے ساتھ بہت زیادہ تعلق ہو، لیکن جب خانقاہ میں تشریف لاکر مشاغل دینیہ میں مصروف ہو جاتے ہیں تو پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی سے کچھ تعلق ہی نہیں۔ حضرت والا کسی سے اس وقت تک خدمت لینا گوارا نہیں فرماتے جب تک اس سے دل نہ کُھل جائے بلکہ جن سے دل کُھلا ہوا ہے ان سے بھی بطورِ خود شاذ و نادر ہی کسی بہت خفیف کام کی فرمائش کرتے ہیں لیکن اگر کوئی خود سبقت کرے تو منع بھی نہیں کرتے تاہم مسلّط ہو جانا ان کا بھی گوارا نہیں۔ فرماتے ہیں: میں چاہتا ہوں سب اپنے اپنے کام میں لگے رہیں خوامخواہ میری خدمت کیلئے مجھ پر مسلّط نہ ہوں تاکہ وہ بھی آزاد رہیں، میں بھی آزاد رہوں۔ آزادی بڑی دولت ہے میں نے اپنی ضروریات اتنی مختصر کر رکھی ہیں کہ میں ان کو خود ہی پورا کر لیتا ہوں کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے تمام کام انتظام کے ساتھ کرے اس سے خود کو بھی راحت ہوتی ہے اور دوسروں کو بھی......
اگرچہ میں متقی پرہیزگار تو نہیں، تاہم خدا کا شکر ہے اپنی اصلاح سے غافل بھی نہیں۔

حضرت نفس کے دھوکوں سے خوب واقف ہیں اور اس کی تاویلیں اچھی طرح سمجھتے ہیں رات دن کام یہی ہے کہ طالبین کے مکائدِ نفس بلکہ اپنے نفس کی بھی ہر وقت دیکھ بھال کرتے ہیں۔ حدودِ شریعت کے تحفظ کا یہ حال ہے کہ پورے دو سال کی تحقیق و تفتیش سے اپنے والد ماجد کی چاروں بیویوں کے وارثوں کا پتا لگایا اور والد کے ذمے جو مہر ان بیویوں کا رہ گیا تھا وہ والد کے ترکے سے ادا کیا اور جب تک ایک ایک پائی ادا نہ ہوئی چین نہ آیا۔ حضرت کی عادت ہے نہ آپ کو یہ پسند کہ مخالفین کے اعتراضات کے جواب دیئے جائیں۔ حق بات کا اظہار کر کے خاموش رہتے اور فرمایا کرتے ہیں کہ جب میں سنتا ہوں کسی مناظرے میں مخالفین کے مقابلے میں اپنی جماعت غالب آگئی تب بھی صدمہ ہوتا ہے کہ عوام کیا کہتے ہوں گے کہ مولوی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایسے مناظروں سے عوام کو بے حد نقصان پہنچتا اور باطل کو فروغ ملتا ہے۔ پھر یہ بھی کمالِ توازن ہی کا نتیجہ ہے کہ مخالف سے اختلاف خواہ کتنا ہی شدید ہو، مگر اس کی خوبیوں پر برابر نظر رہتی ہے اور جس طرح اختلاف کا اظہار بے باکانہ ہوتا اسی طرح خوبی کا اعتراف بھی پوری فراخ دلی سے کرتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر سے حضرت کا سیاسی اختلاف عالم آشکار تھا لیکن دیکھئے کہ ان کے جوہر پر بھی کیسی نظر تھی اور اس کا کس بے نفسی سے اعتراف فرمایا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر عبدالماجد دریابادی کے نام ایک مکتوب کی چند سطریں: "محمد علی کی وفات کا میرے قلب پر جو اثر ہے بیان نہیں کر سکتا۔" "خدا جانے کتنی دفعہ دعا کر چکا ہوں اور کر رہا ہوں مجھ کو مرحوم کی جس صفت کا اعتقاد

Marfat.com

اور اس اعتقاد کی بناء پر محبت ہے صرف ایک صفت، مسلمانوں کی سچی بے غرض محبت ہے باقی دوسری صفات دیکھنے والے جانتے ہیں میں نے کبھی دیکھا نہیں اس لئے ایک ہی صفت سے محبت ہے اور اس کو میں روح الصفات سمجھتا ہوں۔"

دینی مسائل ہوں یا دنیوی 'ایک مصلحِ امت جب انہیں پرکھے گا تو اس کی کسوٹی صرف کتاب و سنت ہی ہو سکتی ہے، چنانچہ ایک پرانے قصبے کی کہنہ مسجد کے گوشے میں ایک دُور بین زندہ مردِ درویش بیٹھا ہوا مسلمانوں کے سارے احوال اور ان کی زندگی کے ہر شعبے پر نظر ڈال کر حق و باطل 'نیک و بد اور صحیح و غلط کے درمیان تفرقہ کی لکیر بنانے میں مصروف تھا۔ اس کے سامنے دین کی صحیح تمثال تھی اور اسے دیکھ دیکھ کر موجودہ مسلمانوں کی زندگی کی تصویر میں جہاں جہاں غلطیاں تھیں وہ ان کے درست کرنے میں مشغول تھا اس نے پوری زندگی اس کام میں صرف کی کہ مسلمان کی تصویرِ حیات کو اس شبیہ کے مطابق بنادے جو دین کے مرقع میں نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ اس وقت بھی جبکہ تحریکِ خلافت نے نہ صرف عام مسلمانوں کو 'بلکہ بڑے بڑے علماء کو کانگریسی مسلک سے متفق کر دیا تھا اس مردِ آخر بین کی نظریں اس ہنگامہ آرائی کے ہولناک مناظر دیکھ رہی تھیں۔ عین اس طوفانی دور میں حضرت نے اپنی جان اور عزت کی پرواہ کئے بغیر جو کچھ حق سمجھا اس کا برملا اظہار کیا اِس کے صلے میں جن الزامات اور اعتراضات سے نوازا گیا وہ یہ تھے کہ انگریز کا پٹھو ہے۔ انگریز اسے تنخواہ دیتا ہے سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ مسلمانوں کا جذبۂ جہاد ختم کرنا چاہتا ہے وغیرہ' وغیرہ حتیٰ کہ دشمنوں نے اس زبانِ حق ہی کو ہمیشہ کیلئے خاموش کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ ہتھیاروں سے لیس بدمعاشوں کا ایک گروہ تھانہ بھون بھیجا گیا اور یہ لوگ اس راستے میں چھپ گئے جدھر سے مولانا تھانوی گزرا کرتے تھے! ارادہ تھا کہ جب صبح کی نماز کیلئے مسجد جا رہے ہوں تو کام تمام کر دیا جائے۔ حضرت کو بھی ان شرپسندوں کے آنے کی خبر ہو گئی مراقب ہوئے 'میلانِ قلبی یہ رہا کہ معمول کے مطابق مسجد میں جایا جائے' چنانچہ ایک ہاتھ میں لالٹین اور ایک ہاتھ میں لاٹھی لئے ہوئے صبحِ صادق سے پہلے ہی گھر سے نکلے جب اس مقام پر پہنچے جہاں غنڈے چھپے ہوئے تھے تو حضرت کو دیکھ کر ان پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ سب کے سب بے تحاشا وہاں سے بھاگ نکلے اور پہلی ٹرین پر سوار ہو کر تھانہ بھون سے چلے گئے اس کے بعد پھر کسی نے ایسی جرأت نہ کی۔

حضرت مولانا کا طبعی میلان یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف تعلیم و تربیت اور اصلاحِ اُمت و ہدایتِ خلق کی طرف تھا اس لئے عملی طور پر سیاسی اور ملکی تحریکوں میں براہِ راست حصہ لینے کی نوبت نہ آئی اور نہ آپ کسی سیاسی جماعت سے منسلک ہوئے 'البتہ جب کبھی ملک میں کوئی سیاسی تحریک شروع ہوئی اس کے بارے میں ایک ماہرِ شریعت عالمِ دین ہونے کے اس کی شرعی حیثیت میں فقیہانہ نظرِ بصیرت ڈال کر نتائج و عواقب واضح کرنے اور ملت کی علمی اور دینی رہنمائی کا فریضہ ادا کرنے میں کبھی دریغ نہ فرمایا۔

آل انڈیا نیشنل کانگریس شروع میں ایک اعتدال پسند جماعت تھی لیکن بعد میں ظاہر ہو گیا کہ اس کی

Marfat.com

کارروائیوں سے مسلمانوں کے مفادات کو زبردست نقصان پہنچ سکتا ہے۔ سرسیّد احمد خاں مرحوم پہلے آدمی تھے جنہوں نے اعلانیہ کانگریس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس سے الگ رہیں اور اپنے آپ کو تعلیم کیلئے وقف کر دیں۔ مولانا تھانوی کا بھی مشورہ یہی رہا اور ان کی دلیل یہ تھی کہ کانگریس میں چونکہ اکثریت غیر مسلموں کی ہے اس لئے اس جماعت کی اصلاح ناممکن ہے۔ حضرت کے خیال میں کانگریس کی مقبولیت کی اصل وجہ یہ تھی کہ مسلمان اس میں شریک تھے۔ فرمایا: ہندوؤں کی پچاس سالہ مردہ کانگریس کو مسلمانوں نے زندہ کیا۔ جب تک مسلمانوں نے شرکت نہ کی تھی کسی نے کانگریس کا نام بھی نہ سنا تھا اگر خدانخواستہ یہ جماعت ہندوستان میں برسرِ اقتدار آ گئی تو یہ بھی ہندوستان میں وہی کرے گی جو بالشویک کر رہے ہیں۔

اس زمانے میں جمعیت العلماء ہند کا اجلاس دہلی میں ہوا مولانا تھانوی کو بھی شرکت کی دعوت ملی جواب میں تحریر فرمایا: "واقعات نے مجھ کو اس رائے پر بہت پختہ کر دیا ہے کہ مسلمانوں خصوصاً علماء کا کانگریس میں شریک ہونا میرے نزدیک مذہباً مہلک ہے بلکہ کانگریس سے بیزاری کا اعلان کر دینا بہت ضروری ہے۔ علماء کو خود مسلمانوں کی تنظیم کرنی چاہئے اور مسلمانوں کا کانگریس میں داخل ہونا اور داخل کرنا میرے نزدیک ان کی اپنی موت کے مترادف ہے ...... بعض اہلِ علم فرماتے ہیں کہ ہم کانگریس میں شرکت اس وجہ سے کرتے ہیں کہ اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے اور ہمارا غلبہ ہو اگر مقصود واقعی یہ ہے تو اس کا حصول مسلم لیگ میں زیادہ آسان ہے، کیونکہ مسلم لیگ والے اتباع کیلئے آمادہ ہیں چنانچہ مسلم لیگ کے بڑے بڑے ارکان نے مجھے لکھا ہے کہ ہم حضراتِ علماء کی رائے کے اتباع کیلئے تیار ہیں اور کانگریسی تو خود اپنا تابع بناتے ہیں ان پر غلبہ پانا مشکل ہے"

ہندوؤں کے ایک بڑے گروہ کو اردو زبان سے ہمیشہ نفرت رہی ہے اور وہ اسے مسلمانوں کی تہذیبی اور ثقافتی زبان سمجھ کر نیست و نابود کرنے کے درپے رہے ہیں۔ کانگریس نے قوت پکڑنے کے بعد اردو زبان کے بجائے اک مردہ زبان سنسکرت کی جب سرپرستی شروع کی تو زبردست لسانی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا' چنانچہ مولانا تھانوی نے اُردو زبان کی حمایت میں فوراً فتویٰ جاری کیا اگر خدانخواستہ یہ زبان (اردو) ضائع ہو گئی تو مسلمانوں کا تمام اسلامی ذخیرہ ضائع ہو جائے گا اور عام مسلمانوں کیلئے تو علمِ دین سے واقفیت کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہے گا کیا کوئی مسلمان اسے برداشت کر سکتا ہے کہ یہ ذخیرہ ضائع ہو جائے؟ اردو زبان کی حفاظت اس وقت دین کی حفاظت ہے اس لئے یہ حفاظت حسبِ استطاعت واجب ہو گی اور باوجود قدرت کے اسمیں غفلت اور سستی کرنا موجبِ مواخذۂ آخرت ہو گا۔"

مولانا عبدالماجد دریاآبادی راوی ہیں کہ حضرت تھانوی کو بعض معاصر علماء کی طرح جنگِ آزادی' جنگِ حقوقِ آزادی وطن وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی ان کے سامنے مسئلہ سیاسی نہیں' تمام تر دینی تھا وہ صرف اسلام کی حکومت چاہتے تھے۔ 1928ء میں جب پہلی بار حاضری ہوئی تو اس ملاقات میں

Marfat.com

حضرت نے دارالسلام کی سکیم خاصی تفصیل سے بیان فرمائی تھی کہ جی یوں چاہتا ہے ایک خطّے پر خالص اسلامی حکومت ہو، سارے قوانین تعزیرات کا اجرا احکام شریعت کے مطابق ہو، بیت المال ہو، نظامِ زکوٰۃ رائج ہو، شرعی عدالتیں قائم ہوں وغیرہ...... دوسری قوموں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے یہ نتائج کہاں سے حاصل ہو سکتے ہیں؟ اس مقصد کیلئے صرف مسلمانوں کی جماعت ہونی چاہئے اور اسی کو یہ کوشش کرنی چاہئے۔"

گویا خانقاہ امدادیہ میں بوریہ نشین اس مردِ درویش نے حصولِ بقائے پاکستان کا لائحۂ عمل اور نظامِ پاکستان کا نقشہ اس وقت پیش کیا جب پاکستان چاہنے والوں کو اس کا خواب وخیال بھی نہ تھا اس زمانے میں صدرِ جمعیتِ علماء ہند مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب، حضرت تھانوی سے مسائلِ حاضرہ پر گفتگو کرنے تشریف لائے۔ حضرت نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنے سے کراہت کا اظہار کیا مفتی صاحب نے کہا: "احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہود کو اپنے ساتھ جہاد میں لیا ہے۔" حضرت تھانوی نے اس کا جو جواب دیا، وہ مولانا ظفر احمد عثمانی مرحوم کے الفاظ میں یوں تھا۔: فرمایا: کفّار اور مشرکین کو آپ جہاد میں اس وقت لے سکتے ہیں کہ جھنڈا مسلمانوں کا رہے اور کفّار ہمارے حکم کے تحت ہوں۔ اس وقت حالت برعکس ہے کانگریس میں ہندوؤں کا غلبہ ہے اور انہی کا حکم غالب ہے۔" غرض حضرت تھانوی ہمیشہ سے مسلمانوں کی الگ تنظیم کے حامی رہے حتیٰ کہ جب تک مسلم لیگ نے کانگریس کا ساتھ دیا اس وقت تک حضرت نے مسلم لیگ کا ساتھ بھی نہیں دیا اور جب مسلم لیگ کانگریس سے علیحدہ ہوئی، تب حضرت نے اعلانیہ مسلم لیگ کی حمایت فرمائی۔ مسلم لیگ نے کانگریس سے الگ ہونے کے بعد پہلا الیکشن جھانسی کے علاقے میں لڑا تھا وہاں کے مسلمانوں نے تار کے ذریعے حضرت تھانوی سے پوچھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں میں سے کس کو ووٹ دیا جائے؟ اس وقت تک حضرت کا ذہن مسلم لیگ کی حمایت کے بارے میں واضح نہ تھا بلکہ یہ خدشہ محسوس کرتے تھے کہ یہ لوگ کہیں مصطفیٰ کمال پاشا کی طرح دین کو مسخ نہ کر دیں اس لئے تار کا جواب دینے میں تامّل تھا آخر آپ کے بھانجے مولانا ظفر احمد عثمانیؒ نے مشورہ دیا، "آپ کانگریس کی حمایت کے خلاف تو ہیں ہی، تامّل صرف مسلم لیگ کی حمایت کرنے میں ہے۔ اس لئے آپ یہ جواب دے دیں کہ کانگریس کو ووٹ نہ دیا جائے۔" یہ جواب حضرت نے پسند فرمایا اور اسی مضمون کا جوابی تار روانہ کر دیا گیا نتیجہ یہ کہ مسلم لیگ کامیاب ہو گئی۔ الیکشن میں مسلم لیگ کی کامیابی کی خوشخبری دینے کیلئے مولانا شوکت علی مرحوم اپنے چند ساتھیوں کو لے کر تھانہ بھون آئے انہوں نے بتایا کہ ہم نے حضرت تھانوی کے جوابی تار کو فتوے کی صورت میں چھپوا کر بڑی تعداد میں تقسیم کرایا اور جگہ جگہ چسپاں کیا اس کا اثر یہ ہوا کہ جو لوگ کانگریس کو ووٹ دینے آتے تھے وہ بھی یہ فتویٰ دیکھ کر مسلم لیگ کو ووٹ دیتے تھے۔

جب کانگریس میں مسلمانوں کے بلاشرط داخلے سے خطرناک نتائج وعواقب تقریباً سامنے آ گئے تو

Marfat.com

حضرت تھانوی نے مسلم لیگ کی حمایت اور شرکت کی رائے دی۔ "آپ کا فتویٰ بنام تنظیم المسلمین شائع ہوا۔ یہ فتویٰ 9 ذی الحج 1356ھ بمطابق 10 فروری 1938ء کا تحریر شدہ ہے اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ کی دینی حالت درست کرنے کو حضرت تھانوی مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں مسلم لیگ کے زعماء کے پاس اپنی طرف سے وفود بھیجتے رہے۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس پٹنہ منعقدہ 26 دسمبر 1938ء کو حضرت نے تبلیغی وفد روانہ کیا اس وفد نے قائداعظمؒ کو نماز کی تلقین کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلم لیگ کا اجلاس دو بجے یہ کہہ کر ملتوی کر دیا گیا کہ سب صاحب نماز پڑھیں۔ قاضیٔ شہر کی امامت میں قائداعظمؒ سمیت کوئی ایک لاکھ افراد نے نماز ادا کی۔ مولانا ظفر احمد عثمانی اس وفد کے امیر تھے اور حضرت تھانوی کی ہدایت کے مطابق انہوں نے قائداعظمؒ سے ملاقات میں کہا کہ مسلمان ایک دینی قوم ہے جب تک سیاست کو دین سے نہ ملایا جائے گا کامیابی نہ ہوگی۔ آپ بھی مسلم لیگ میں دین کو شامل کریں۔ قائداعظمؒ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ سیاست کو دین سے علیحدہ ہی رکھنا چاہیئے۔ مولانا نے جواب دیا: یہ تو یورپ کی سیاست ہے۔ اسلامی سیاست یہ ہے کہ خلیفۂ اسلام قائدِ حرب بھی تھا اور نماز کا امام بھی جب تک مسلمان، مسلمان رہے یہی صورت رہی اور جب سے سیاست نے دین کو چھوڑا .... مسلمانوں کا تنزل شروع ہو گیا۔ ترکی کے مصطفیٰ کمال نے دین کو چھوڑا، تو سلطنت مختصر ہو کر رہ گئی۔ افغانستان کے امان اللہ خان نے دین کو خیرباد کہا تو اسے قوم نے الگ کر دیا...... قائداعظمؒ پر ان کلمات کا اثر ہوا کہ اگلے دن کھلے اجلاس میں اعلان کر دیا: "اسلام عقائد و عبادات، معاملات، اخلاق اور سیاست کا مجموعہ ہے۔ قرآن مجید نے سب کو ساتھ ساتھ بیان کیا ہے اس لئے سیاست کے ساتھ دین کو بھی لینا چاہیئے۔" قائداعظمؒ کی یہ تقریر دہلی کے اخبار "الامان" نے اس شہ سرخی کے ساتھ شائع کی تھی:

"مولانا حکیم الامت تھانوی کی روحانیت کی تاثیر اور قائداعظمؒ کی تقریر"۔

............☆............☆............

کرامات، بزرگی کا لازمہ بن گئی ہیں، حالانکہ اگر یہ حقیقی بھی ہوں تو بھی کسی کے اختیار میں نہیں، محض عطائی ہیں۔ بندہ اختیاری امور کا پابند ہے اور انہی امور کی پابندی اس کیلئے وجۂ بزرگی ہے۔ ولایت شعبہ ہے نبوت کا اور جو جتنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوگا اتنا ہی بڑا ہوگا، خواہ اس سے ایک بھی خرقِ عادت سرزد نہ ہو، اسی لئے صوفیائے ربانی میں کسی کا قول مشہور ہے کہ شریعت پر استقامت ساری کرامات سے افضل ہے، چنانچہ بزرگانِ دین نے اپنے کشف اور کرامات کو چھپایا ہے اور ان سے بچنے کی دعا مانگی ہے۔ مولانا تھانویؒ کو فراستِ مومن سے حصہ وافر ملا تھا جو آپ کی بزرگی پر شاہد ہے

Marfat.com

اور آپ کی کرامات وہ آثارِ علمیہ اور نقوشِ عملیہ ہیں جن سے تجدیدِ دین کا مہتم بالشان کام ظہور میں آیا لیکن ساتھ ہی آپ کی ذات بابرکت سے بیسیوں نہیں، سینکڑوں واقعات ایسے بھی ظاہر ہوئے جنہیں "کرامات" کہا جاسکتا ہے اور جس کی صحیح اصطلاح انعاماتِ الٰہیہ ہے۔

پہلی کرامت جو ہر شخص کو نظر آتی تھی وہ حضرت کے وقت میں حیرت خیز برکت تھی اسی کی بناء پر آپ تن تنہا وہ خالص علمی و فنی کام کر گئے جو اتنی مدت میں ایک متحدہ جماعت سے بھی بمشکل انجام پا سکتا ہے۔ آپ بہت کم بیمار پڑتے تھے اور اگر ہوتے بھی تو جلد شفایاب ہو جاتے تھے جس مضمون یا مسئلے کی تلاش ہوتی، غیب سے اس کے سامان مہیا ہو جاتے تھے، مثلاً: شرحِ مثنوی مولانا روم لکھتے وقت کبوتر بازی کی ایک اصطلاح کا مفہوم جاننے کی ضرورت پیش آئی۔ ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ ایک کبوتر باز تعویذ لینے آیا اور اس سے وہ بات معلوم ہو گئی۔

ایک شخص کا نام کلیم اللہ تھا وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ بیمار رہتا ایک مرتبہ آپ کے پاس آیا تو آپ نے نام بدل کر سلیم اللہ رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ بالکل تندرست ہو گیا۔ اس تبدیلیٔ نام کی وجہ آپ نے خود یہ بیان فرمائی کہ "کلیم" کے معانی "جراحت" کے بھی ہیں اس لئے نام بدل دیا۔ ایک صاحب کا لڑکا کوئی نو دس برس کا نہایت غبی اور کُند ذہن تھا، آپ کی خدمت میں لایا گیا آپ نے مزاحاً و تفریحاً اس کا سر اپنے سر سے ٹکرایا، اس کے بعد لڑکے کا ذہن تیز ہو گیا اور یہ تو روزانہ ہی کا معاملہ تھا کہ جو کوئی اپنے ذہن میں اشکال یا غلط خیالات لے کر آتا، اس کے اظہار سے قبل ہی وہ جواب پا کر مطمئن ہو جاتا۔ حضرت مولانا محمد حسن امرتسری علیہ الرحمۃ بیان کرتے تھے۔: ایک دفعہ مجھ پر دو سو روپے قرض ہو گیا اور اس کے ادا کرنے کی فکر لاحق تھی ایک موقع ایسا آیا کہ اگر اس سے فائدہ اٹھایا جاتا، تو قرض ادا ہو جاتا، لیکن عین انہی دنوں میں تھانہ بھون جانے کا قصد تھا اس لئے ہمّت کر کے حضرت کی خدمت میں حاضری ہی کو ترجیح دی یہ وہ زمانہ تھا کہ احقر کو حضرت کی مجلس میں کلام کی اجازت نہ تھی۔ جب میں تھانہ بھون حاضر ہوا اور حضرت کو سلام عرض کرنے کے بعد مصافحہ کیا آپ نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے تین مرتبہ جوش سے فرمایا: "دو سو روپے بھی کوئی چیز ہے، علماء کی جوتیوں کی گرد ہے۔" بس اس جملے سے میری ساری تشویش دور ہو گئی اور جب امرتسر واپس گیا تو بہت جلد غیب سے امداد ہوئی اور وہ قرض خدا کے فضل سے ادا ہو گیا۔"

علی گڑھ کی نمائش میں حضرت کے ایک معتقد نے دکان لگائی تھی ایک روز عین اس وقت جبکہ گاہکوں کا ہجوم تھا ان کے قلب میں وحشت سی شروع ہوئی اور وہ نقصان کا خیال کئے بغیر سامان قبل از وقت سمیٹنے اور صندوق میں بھرنے لگے۔ صندوق بھر چکے تھے کہ اچانک نمائش میں آگ لگ گئی۔ انہیں پریشانی کہ اکیلے ایسے وزنی صندوق کیونکر اٹھائے جائیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے سے حضرت تھانوی چلے آتے ہیں اور آتے ہی فرمایا: "جلدی کرو" چنانچہ ایک طرف سے انہوں نے اور دوسری طرف سے حضرت شیخ نے ایک ایک صندوق اٹھایا اور محفوظ مقام پر پہنچا دیا جب سارا سامان اٹھ چکا تو حضرت وہاں سے غائب تھے اور

Marfat.com

درحقیقت آپ اس وقت تھانہ بھون میں تھے" ۔ جب آپ سے یہ واقعہ بیان کیا گیا' توفرمایا: مجھ کو اس کی خبر نہیں ' البتہ بعض اوقات حق تعالیٰ کسی کی دستگیری اور اعانت اس صورت سے فرماتے ہیں کہ لطیفۂ غیبیہ کومانوس شکل میں ظاہر فرمادیا اور اس کے ذریعے کام بنوادیا' اور خود اس شکل والے کو کچھ خبر نہیں ہوتی۔"

☆ ☆

1337ھ تک ملک کے اکثر مقامات اور شہروں میں پیغام حق کی منادی کر کے وقت آیا کہ آپ ہمیشہ کیلئے خانقاہِ امدادیہ ہی میں عزلت نشین ہو جائیں۔ فتق (ہرنیا) کا عارضہ لاحق ہوا۔ طبیبوں نے سفر کی قطعاً ممانعت کر دی۔ حضرت نے اعلان فرمادیا کہ اب کوئی سفر کی دعوت نہ دے۔ ویسے دمِ آخر تک زائرینِ خانقاہ کو ملفوظات کی اور طالبین کو مکتوبات کی راہ سے برابر مستفیض فرماتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب آپ کے چلنے پھرنے کی ضرورت بھی کیا رہ گئی تھی؟ ساٹھ برس کی جدّوجُہد اور ہمّت سے ہزاروں کی سیرتیں بن چکی تھیں ' سینکڑوں "سیرت گر" تیار ہو چکے تھے جو ملک کے طُول وعرض میں پھیلے ہوئے اپنی اپنی جگہ تبلیغ ورُشد میں مصروف تھے۔ چنانچہ آخری زمانۂ حیات میں جب علامہ سیدّ سلیمان ندوی کا تعلق خانقاہِ اشرفیہ سے قائم ہوا تو حضرت تھانوی نے کئی بار فرمایا: اب میرا کیا کام ہے۔ الحمد اللہ مجھے اطمینان ہے کہ میرے مذاق کو سمجھنے والے اور اسے پھیلانے والے موجود ہیں۔

☆ ☆

پانچ سال کی طویل مدّتِ علالت میں حضرت برابر تحریری 'تقریری افاضات بدستور فرماتے رہے۔ لکھنؤ' سہارنپور ' تھانہ بھون غرض جہاں رہے ایسے ایسے نافع ' موثر اورپُرجوش ملفوظات سننے میں آتے رہے اور ارشاد وتلقین کی اتنی اتنی طویل مجلسیں منعقد ہوتی رہیں کہ عقل دنگ تھی کہ ایسے سخت مرض میں اتنی مشقت برداشت کرنا حیرت انگیز امر ہے۔ بعض طبیبوں نے اس سے روکنا چاہا' تو حضرت نے فرمایا جب میں کوئی خدمت ہی نہ کر سکا تو پھر میرے زندہ رہنے کی کیا ضرورت ہے؟" پیروں پر اکثر ورم رہتا تھا لیکن اس کی طرف کبھی التفات نہ فرماتے۔ کوئی توجہّ دلاتا تو فرمادیتے کہ علاج ماہر اور خیر خواہ طبیب کے سپرد ہے۔ حالات کا پہنچانا سمجھدار تیمارداروں کے سپرد ہے' پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ خوامخواہ فکر میں پڑوں؟ حضرت کے اس طرز سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ علاج صرف عالمِ اسباب میں ہونے کی حیثیت سے کرا رہے ہیں ورنہ نتیجے کے لحاظ سے نظر مُسبب الاسباب پر ہے۔

اگرچہ دوا اور پرہیز سے تنگی کا اظہار فرماتے رہتے لیکن طبیبوں کا بے حد لحاظ رکھتے اور حتی الامکان ہدائیت پر سختی سے عمل کرتے۔ جب کسی چیز کو جی چاہتا تو طبیبوں کو دکھا کر بلکہ چکھا کر اجازت نہ لے لیتے ، نوش نہ فرماتے اور جب کسی طبیب کو بدلتے تو ایسی لطیف تحریر اس کے پاس بھیجتے کہ اسے ذرا

Marfat.com

ناگواری نہ ہو اور دوبارہ رجوع کی صورت میں شرمندگی نہ ہو' فرماتے تھے " طبیب کا بدلنا تو برا نہیں لیکن علاج کے دوران میں دخل دینا فن کی توہین کرنا ہے۔ آہستہ آہستہ حضرت پر استغراق کا عالم طاری رہنے لگا اور حاضرین گھنٹوں خاموش حسرت سے دیکھتے ہوئے بیٹھے رہتے تھے جب اتفاق سے حضرت چونکتے تو اظہارِ شرمندگی فرماتے کہ میں تو کبھی خاموش پڑا رہنے والا نہ تھا لیکن کیا کروں؟ آنکھیں بند ہی ہوئی جاتی ہیں۔ غنودگی بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس میں مرض کی تکلیف محسوس نہیں ہوتی اور یہ حضرت کا دائمی حال تھا کہ ہر حال میں حق تعالیٰ کا شکر ادا فرماتے رہتے تھے۔تکلیف میں بھی کوئی نہ کوئی پہلو ایسا نکال لیتے جو قابلِ شکر ہو۔

شدید علالت کی خبر اِدھر اُدھر پہنچانے کی خدام کو ہمیشہ ممانعت تھی۔کسی کی اعانت کسی کام میں حتی الامکان نہ لیتے۔ اگر کوئی سبقت کرتا تو ناگواری کے ساتھ منع کر دیتے۔ صاحبِ فراش ہونے سے پہلے اگرچہ چلنے میں نہایت دشواری ہوتی اور قدم لڑکھڑاتے لیکن کسی کا سہارا نہ لیتے' بلکہ ملازم کو ساتھ رہنے کی ہدایت فرماتے تاکہ گرنے لگیں تو ہاتھ پکڑ کر سہارا لے لیں۔ جب بالکل مجبور ہو گئے اور نقل و حرکت کے قابل بھی نہ رہے اس وقت بیٹھنے کیلئے دوسرے کا سہارا لیتے بعض اوقات خدام اور ملازم مرضی کے مطابق کسی کام کو نہ کر پاتے تو اس عنوان سے اظہارِ ناراضی کرتے کہ میں تو سب کام ہمیشہ اپنے ہاتھ سے کرتا تھا' مگر اب اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کا محتاج بنا کر دیا ہے اس لئے مجبور ہوں ' خواجہ عزیز الحسن مجذوب سے فرمایا: دیکھئے خواجہ صاحب طبیعت کے ضعف کی تو یہ حالت اور پھر لوگ کہتے ہیں کہ سخت مزاج ہے میں کیا کروں اللہ تعالیٰ نے طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ذرا سی بے ڈھنگی بات کا مجھ پر اتنا اثر ہوتا ہے کہ دوسرے کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ " خواجہ صاحب کا بیان ہے حضرت کی خدمت میں کچھ عرصے احقر کارات کو بھی رہنا ہوتا تھا اس وقت اندازہ ہوا کہ واقعی حضرت کو ذرا سی اذیّت کا اثر بھی بے حد ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ بستر میں ذرا سی شکن بھی پڑ جاتی تو فوراً پیروں سے محسوس فرما لیتے اور اس طرح سسکیاں بھرنے لگتے جیسے کوئی کانٹا چبھ رہا ہو۔ ایک بار فرمایا: مجھے شکن ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے کسی نے لکڑی اڑا کر رکھ دی ہو۔ ایک مرتبہ مزاحاً فرمایا: نانا شاہ تو نازک مزاج تھا ہی میں بھی بانا شاہ ہوں اور بانا' نانا سے افضل ہوتا ہے۔ کیونکہ کپڑا' کپڑا اسی سے ہوتا ہے کاغذ الٹنے میں جو خفیف سی آواز ہوتی ہے وہ بھی کانوں پر اتنی ثقیل ہوتی تھی کہ پریشان ہو کر رہ جاتے اور فوراً منع فرماتے۔ غرض دوائیں حضرت کیلئے بے حد تکلیف دہ تھیں اور فرماتے تھے جب دوا سامنے آتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پھانسی پر چڑھنا ہے اسی طرح پرہیز کا بھی تحمّل نہ تھا اکثر طبیب پرہیز سختی کے ساتھ کراتے کہ مرض ہی سخت تھا اور حضرت کی یہ حالت کہ نامرغوب غذا کسی طرح کھا ہی نہ سکتے تھے حلق سے نہ اترتی چاہے جتنے فاقے ہو جاتے۔ آخری روز بھی اسی قسم کی شکایت کی اور دوا پینے سے گریز فرمایا' تو خواجہ صاحب نے عرض کیا' حکیم صاحب کو خود اس کا بہت اہتمام ہے کہ جہاں تک ہو سکے لطافت کی رعایت رکھی جائے' لیکن وہ دوا کو غیر دوا تو بنا سکتے نہیں۔ یہ سن کر فرمایا ......

Marfat.com

اس کا جواب یہ ہے۔:

پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

20 جولائی 43ء کی صبح کھل کر اجابت ہوئی' ورم بھی بالکل اتر گیا اس وقت یہ معلوم ہوا کہ سارا بدن صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچا۔ اور کچھ نہیں۔ حضرت نے فرمایا آج تو ہاتھ پیروں کی جان سی نکل گئی ہے۔ ایک روز پہلے بائیں پاؤں کے پنجے پر ورم تحلیل ہو جانے کے بعد سخت ٹیسیں اُٹھنے لگی تھیں پھر ظہر کے بعد تنفس کی شکایت پیدا ہوئی۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب کا بیان ہے: احقر سمجھا کہ ویسے ہی شکایت ہے جو جاتی رہے گی یہ خبر نہ تھی کہ دم اکھڑ گیا ہے اور یہ پیش خیمہ سفرِ آخرت کا ہے حضرت نے بھی فرمایا کہ اتنی شدید تکلیف مجھے عمر بھر نہیں ہوئی اور بجائے کراہنے کے اللہ اس انداز سے کہا کہ مجھے تشویش ہو گئی کہ بہت تکلیف ہے۔ بظاہر گھبراہٹ کے آثار نہیں پائے جاتے تھے اور اسی وقت کیا تمام بیماری میں آخر تک سراسیمگی یا بے تابی کسی وقت طاری نہیں ہوئی۔ ہر حال میں کوہِ استقلال بنے رہے کبھی آرام کا پہلو اختیار نہ فرمایا' عمر بھر طالب علمانہ انداز میں سارا سامانِ راحت ہوتے ہوئے بھی مشقت کی زندگی بسر فرمائی۔ خود کہتے تھے کہ میں نازک مزاج تو ہوں' لیکن خدا کا شکر ہے۔ نازک بدن نہیں۔ بجز قیلولے کے وقت کے دن بھر تخت پر نشست رکھتے اور تخت پر بھی ٹُھولا نہیں' عرضاً جس کی وجہ سے پاؤں بھی نہ پھیلا سکتے تھے کہتے تھے کہ چارپائی پر بیٹھنے میں آرام نہیں ملتا اور یہ بات بھی طبیبوں اور خادموں کے عرض کرنے پر فرماتے۔ زندگی کے آخری دنوں میں اکثر پاؤں لٹکے ہوئے رہتے اور بار بار نیند کے جھونکوں میں گر گر پڑتے۔ شب کو بھی گاؤ تکیہ لگا کر سوتے جس میں سر اونچا رہتا او غنودگی میں پیچھے گر پڑتا۔

بائیں ہاتھ کی کہنی میں بہت بڑا داغ پڑ گیا تھا اور کھال سخت ہو گئی تھی' کیونکہ طالبعلمی کے زمانے میں کہنی زمین پر ٹیک کر لکھنے کی عادت رہی۔ جب گھر کے برآمدے میں دھوپ بالکل پلنگ کے قریب آ جاتی' تو عرض کیا جاتا کہ پلنگ سرکا لیا جائے۔ اس پر فرماتے کہ دھوپ جا رہی ہے۔ گرمی کی شدت میں عرض کیا گیا بجائے برآمدے کے اندر کمرے میں رہا جائے فرمایا: اب تو برسات آ رہی ہے غرض برآمدے میں گرمی' جاڑا برسات سب موسم کاٹ دیئے' حالانکہ طبیعت ایسی حسّاس تھی کہ موسم کا ذرا سا تغیر بھی اثر کرنے لگتا تھا آخر میں حرارتِ عزیزیہ بہت کم ہو گئی تھی۔ سخت گرمی میں بھی گرمی محسوس نہ ہوتی تھی اور چادر اوڑھے رہتے تھے سامان سب بالکل سادہ رکھتے۔ لوگ عمدہ سے عمدہ چیز پیش کرتے' مگر اکثر و بیشتر خود استعمال نہ فرماتے۔ گاڑھے کی جو چادر بستر پر تھی وہی آخر دم تک رہی۔ ہنسی اور مزاح آخر میں بالکل موقوف ہو کر رہ گیا تھا لیکن طبیعت میں جُودت ویسی ہی تھی سب سے اعلیٰ اور سب سے ارفع عمل باطنی تو کیفیتِ فنا و عبدیت تھی جو ہر وقت حضرت پر نہایت شدت کے ساتھ طاری رہتی تھی اور جس کے اثر سے متاثر ہو کر بار ہا یہاں تک فرما دیا کرتے تھے کہ میں تو اپنے کو کُتوں اور سُوروں سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ ایک بار فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایسا مراقبہ دل میں ڈال دیا ہے کہ ظاہری یا باطنی کیسی ہی پریشانی لاحق ہو' میں بے چین نہیں ہوتا وہ مراقبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی...... حاکم ہونے کی حیثیت سے تو انہیں ہمارے ظاہر و باطن میں ہر طرح کے تصرّف کرنے کا پورا حق حاصل ہے دم مارنے کی مجال نہیں اور

Marfat.com

حکیم ہونے کی حیثیت سے اطمینان ہے کہ وہ تصرّف حاکمِ جابر کا سا نہ ہوگا بلکہ حکمت پر مبنی ہوگا' چاہے وہ حکمت ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

دنیا سے بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ کئی بار فرمایا میں خود کو تنہا پاتا ہوں اور یہ محسوس کرتا ہوں کہ بس دنیا میں اللہ میاں ہیں اور میں ہوں اور کوئی نہیں ہے۔ یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے محبت تو اپنے سب احباب اور متعلقین سے ہے لیکن ایسا تعلق کسی سے نہیں کہ دل اٹکا رہے۔ یہ تعلّق تو بس اللہ تعالیٰ ہی سے رکھا جائے اگر توفیق ہو۔ فرمایا: جب کوئی متقی مرتا ہے تو خیال ہوتا ہے نہ معلوم کس بات پر گرفت ہو جائے اور جب کوئی غیر متقی مرتا ہے تو خیال آتا ہے نہ جانے کس بات پر مغفرت ہو جائے۔ بارہا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ میرے ساتھ ایسا ہے جیسے ہر موقع پر یہ فرماتے جاتے ہوں کہ دیکھ' ہم نے تیرے ساتھ یہ احسان کیا' دیکھ ہم نے تیرے اوپر یہ رحمت کی' دیکھ ہم نے تجھ کو یہ نعمت دی بس آواز تو آتی نہیں' باقی ہوتے سب معاملات ایسے ہی ہیں جیسے ساتھ کے ساتھ جتاتے بھی جا رہے ہوں...... ان واقعات اور حالات سے معلوم ہوا کہ حضرت ہر وقت اپنے قلب اور اپنے جذبات کی کس قدر نگرانی فرماتے تھے اور انہیں کس اہتمام سے جادۂ اعتدال پر رکھتے تھے فرماتے: الحمدللہ میں کبھی اپنی طبیعت کو عقل پر اور عقل کو شریعت پر غالب نہیں آنے دیتا۔ بالکل آخر میں جب سرکنے کی بھی سکت نہ رہی تو بیٹے لیٹے تیمّم سے اور اشاروں سے نماز ادا فرمانے لگے۔ نماز آخر دم تک کوئی قضا نہ ہونے دی۔ نظافت کا یہ اہتمام تھا کہ اگر ذرا سی بھی نجاست لگ جاتی یا دوا وغیرہ کا دھبہ پڑ جاتا تو فوراً پانی منگوا کر اسی وقت خود صفائی کر لیتے اور یہ ہمیشہ معمول رہا۔ وفات سے دو چار روز پہلے خواجہ عزیز الحسن مجذوب سے فرمایا: مجھے دو چیزوں کا بہت خیال ہے نماز کا اور حقوق کا' چنانچہ نماز تو آخری وقت تک حضرت نے پڑھی اور حقوق کی ادائیگی تو حضرت کا آخری ہی عمل تھا۔ روزوں کا اتنا اہتمام تھا کہ ضعف اور مرض کے باوجود گذشتہ رمضان شریف کے پورے روزے رکھے اور اس سے پہلے کے رمضان کے دو روزے جو علاج کے دوران میں قضا ہوئے تھے ایک ایک کر کے سب رکھ ڈالے۔ انہی دنوں انتہائی کمزوری کے باوجود ایک روز پھر بھی امتحاناً روزہ رکھ کر دیکھا اور فرمایا: اس تصوّر ہی سے وحشت ہوتی تھی کہ سب تو روزے سے ہوں گے اور میں نہ ہوں گا۔ ایسا معلوم ہوگا جیسے شریفوں میں چمار بیٹھا ہوا ہے۔"

خدماتِ مالیہ کا یہ حال تھا کہ شروع ہی سے برابر زکوٰۃ کے علاوہ چوتھائی حصہ صدقاتِ نافلہ میں صَرف فرماتے۔ اس طرح ربع آمدنی کے حساب سے اپنی عمر میں ہزاروں لاکھوں روپے صدقات میں صَرف کئے' بلکہ ترکے کا چوتھائی حصہ کارہائے خیر میں خرچ کئے جانے کی وصیّت فرما گئے۔ کوئی سائل خالی نہ جاتا...... حسبِ گنجائش ضرور کچھ نہ کچھ خدمت کرتے۔ اہل خانقاہ' اہلِ قصبہ' متعلّقین' مقامی' بیرونی سب حاجت مندوں کی ضروریات پر جہاں تک عمل ہو سکتا نظر رکھتے اور حسبِ موقع مدد کرتے۔ بڑے بڑے چندے بھی کارِ خیر میں دیتے رہتے۔ اکثر دیکھا کہ کبھی کپڑے مساکین میں تقسیم کئے جا رہے ہیں کبھی نقد' کبھی کھانا' خیرات بھی بڑے انتظام اور اصول سے کرتے جیسا ہر چھوٹے بڑے کام میں معمول تھا۔ قرض دینے کی بھی الگ مد تھی۔ محض اعتماد کے مواقع پر بڑی بڑی رقمیں بے تامّل بطور قرض عطا فرما دیتے۔ جو لوگ

Marfat.com

قرض واپس نہ دے سکتے اکثروبیشتر معاف کر دیا کرتے تھے۔ مزاج میں استغنا حد درجہ تھا۔ کسی کا ہدیہ خواہ کتنا بڑا ہو' اگر اصول کے خلاف ہے تو ادنیٰ تامل کے بغیر واپس کر دیتے۔ صدقاتِ مالیہ جاریہ بھی حضرت نے بہت کئے۔ لیکن اب .... مولانا عبدالماجد دریاآبادی کے الفاظ میں .... "سورج ڈوبنے کو تھا۔ شفق پھول چلی تھی عین اسی زمانے میں اردو کے مشہور شاعر جگر مراد آبادی نے ایک فارسی غزل پانچ شعروں کی "زتشنہ لبی خوشم' بوالعجبی خوشم' کی زمین میں لکھ کر اور پانچوں شعر رنگین و پر بہار حضرت کی خدمت میں نذرانے کے طور پر بھیجی۔ حضرت باضابطہ شاعر تو پہلے بھی نہ تھے اور اب اس وقت تو ضعف و انحطاط نے جسم و دماغ پر بالکل ہی قابو پالیا تھا' اس پر جو شعر جواب میں لکھ کر بھیجا' وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

نہ بہ نثر ناثر بے بدل' نہ بہ نظم شاعرِ خوش غزل
بہ غلامئ شہِ عزّوجل وبہ عاشقئ نبی خوشم

اس شعر کے ساتھ جو مختصر خط حضرت نے جگر صاحب کو لکھا تھا وہ بھی اپنی بلاغت اور رنگینئ عبارت میں کچھ کم دلآویز نہ تھا۔

مئی اور جون کے مہینے تو خیر کٹ گئے جولائی سے پھر تشویش ناک خبریں آنے لگیں لیکن مسلسل نہیں بلکہ افاقے کے درمیانی وقفوں کے ساتھ ...... اور آہ ...... انسان کی فریب خوردگی کہ طبیعت ان ہی عارضی اور وقتی افاقوں کا سہارا ڈھونڈتی رہی ...... جولائی کی غالباً 13 تاریخ تھی کہ تھانہ بھون سے اطلاع آئی کہ حضرت پر مسلسل غفلت اور غنودگی طاری ہے۔ طبیب اپنی مادّی اصطلاحوں میں جسے غفلت اور غنودگی سے تعبیر کر رہے ہیں یہ تو سب سامان خلق سے انقطاع اور آخرت کی طرف توجہ و یکسوئی کے حصول کے ہو رہے ہیں۔ 16 جولائی کو دوپہر کو خواجہ عزیزالحسن مجذوب حضرت عاشقِ زار اور خلیفۂ خاص کا کارڈ ملا۔ لکھا تھا: افاقے کی صورت معلوم ہو رہی ہے 'ضعف بے انتہا ہے' خدا کرے روز بروز صحت اور قوت ہوتی چلی جائے۔

اس خط سے دل کو ڈھارس آن کی آن ہوئی ٹوٹی ہوئی امید ذرا کی ذرا بندھی شاید کہ اُمتِ محمدیہ کو وقت کی اس نعمتِ عظمیٰ سے فائدہ اٹھانے کی کچھ اور مہلت مل گئی ہو۔ کسے خبر تھی کہ عین جس وقت یہ تسلی نامہ پڑھ رہا تھا ساعتِ موعود اتنی قریب آ گئی تھی آفتابِ علم و عرفان کی آخری کرنیں بھی روپوش ہونے کو تھیں۔ اللہ کی رحمت نا اہلوں' و ناقدرے لوگوں سے واپس لی جا رہی تھی۔ رسولِ اسلام کا ایک سچا جانشین اپنے مالک و مولیٰ کے دربار میں حضوری کیلئے بے قرار ہو رہا تھا۔ لشکرِ اسلام کا جری اور دلیر' اپنے وقت کا بڑا جرنیل' دین کے ہر ہر محاذ ہر معرکے' ہر ہر مورچے کا دلاور اپنے جسم کا پور پور دین کی راہ میں چور چور کئے ہوئے قلب خاشع اور نفس مطمئنہ کے ساتھ عالمِ ناسوت کی بالکل آخری منزلوں سے گزر رہا تھا۔

حضرت کی چھوٹی بیوی نے نزع کے وقت دیکھا کہ جب سانس زور سے اوپر کو آتا تو داہنے ہاتھ کی انگشتِ شہادت اور بیچ کی انگلی کے درمیان پشت کی طرف ایک تیز چمک جگنو کی سی پیدا ہوتی تھی اور اس کے باوجود کہ بجلی کے دو قمقمے اس وقت روشن تھے پھر بھی اس کی چمک غالب ہو جاتی تھی پھر دوسرے سانس میں غائب ہو جاتی جب دیر تک ایسا ہی ہوتا رہا تو انہوں نے دوسری مستورات جو ان کے قریب تھیں متوجہ کیا

Marfat.com

سب نے دیکھ کر تصدیق کی کہ سانس بند ہو جانے کے بعد چمک بھی بند ہو گئی۔ یہ عجیب واقعہ سن کر ایک اہلِ علم اور صاحبِ ذوق نے نہایت لطیف توجیہہ بیان کی اور کہا کہ عجب نہیں یہ نور اس وجہ سے ظاہر ہوا ہو کہ انہی دو انگلیوں سے بڑے بڑے علوم اور دقائق اور معارف و حقائق طویل مدت تک معرضِ تحریر میں آتے رہے۔

مولانا ظفر احمد عثمانی برابر یٰسین شریف پڑھتے رہے اور آبِ زمزم چمچے سے دہنِ مبارک میں ڈالتے رہے۔ عشاء سے بہت پہلے غشی طاری ہو گئی تھی پھر آخر وقت تک ہوش نہ آیا۔ رات بھر بہت سے خدّام حاضرِ خدمت رہے۔ صبح متعدد صلحاو علماء نے سنّت کے مطابق اچھی طرح غسل دیا۔ یہ منظر دیکھ کر کوئی آنسوؤں سے 'کوئی دل سے اور کوئی چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ پانچ سال کی اس طویل و شدید علالت نے سوائے استخواں کے کچھ چھوڑا ہی نہ تھا۔ تجہیز و تکفین کے بعد جنازہ اٹھایا گیا اس وقت ایک کہرام برپا تھا اکثر کلمہ توحید پڑھ رہے تھے۔ یکایک ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی۔ گھر سے خانقاہ تک جنازے کو سنبھال کر لانا دشوار ہو گیا۔ مخلوقِ خدا بے تابانہ مثلِ پروانہ ٹوٹی پڑتی تھی۔ نمازِ جنازہ حضرت کے خواہرزادہ مولانا ظفر احمد عثمانی نے پڑھائی اور "قبرستانِ عشق بازاں" میں اس خزینۂ اشرفی کو دفینۂ جواہرات علمیہ و عملیہ کی صورت میں منتقل کر 'ہاتھ جھاڑ' سب فاتحہ پڑھنے کو کھڑے ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہ واِنّا الیہ راجعون بیشمار حضرات نے برجستہ مادہ ہائے وصال کہے 'ان میں "مقربِ عظیم" "لقد اُوتی خیراً" اور "اشرف علی نور اللہ مرقدہٗ" الہامی مادے ہیں ان سب سے سالِ وفات 1362ء ہجری بر آمد ہوتا ہے۔ خاکسار راقم الحروف نے بھی "چراغِ محفل" سے سنِ وصال بر آمد کیا ہے۔

حضرت کی وفات سے چند ماہ بعد مولانا عبد الماجد دریاآبادی مزار کی زیارت کیلئے آئے۔ گذشتہ پندرہ برسوں میں بارہا تھانہ بھون آئے تھے لیکن اب کی مرتبہ آنا اور طرح کا تھا۔ نظریں کسی کو ڈھونڈتی ہوئیں 'دل کسی کو تلاش کرتا ہوا' آیئے ان کے ساتھ مزار اشرف پر چلیں۔ "تھانہ بھون سٹیشن پر اترا اور سیدھا مزار پر حاضر ہو گیا۔ سٹیشن سے مزار کا فاصلہ ہی کتنا 'پورے دو فرلانگ بھی تو نہیں اور مزار .... آہ مزار؟ نہ کوئی بلند گنبد 'نہ کوئی کلس دار قبّہ 'نہ چار دیواری 'نہ آستانہ 'نہ جنگلہ 'نہ کٹہرا .... ایک اوسط درجے کی وسعت کا باغ 'ایک سمت میں مختصر پر فضا عمارت 'وسط باغ میں چند گز مربع کا ایک مسطح تختہ اور وہی اللہ کے اس شیر کی خواب گاہ .... نہ شامیانہ 'نہ چھت 'صرف آسمان کی کھلی ہوئی چھت کے نیچے ایک نیچی سی کچی تربت ' سادگی کی تصویر 'صاحبِ قبر کی بے نفسی کا آئینہ 'نہ لوح نہ کتبہ نہ پھول نہ چادر 'چند قدم کے فاصلے پر دوسرے مخلصین پیشوائی کے شوق میں پہلے ہی سے پہنچے ہوئے۔ شیخ کی قبر ان سب قبروں سے بھی پست...... زندگی میں بھی تو اپنے کو اپنے متوسّلین سے پیچھے رکھتے تھے۔ تصوّر کی آنکھ نے کیا کیا دیکھا 'تخیّل کے کان میں کیا کیا آوازیں آئیں 'کوئی کہے تو کس زبان میں کہے۔

ایں حدیثے را بیانِ دیگرست

Marfat.com

توکل شاہ انبالویؒ

کئی برس ہوئے اس عاجز راقم الحروف نے ایک عجیب خواب دیکھا جس کی یاد آج بھی حافظے کی لوح پر تروتازہ ہے۔ ان دنوں دنیاوی پریشانیوں کا ہجوم تھا اور کوئی راستہ ان پریشانیوں سے نکلنے کا سجھائی نہ دیتا۔ ایسے لمحوں میں ہم دنیادار لوگوں کو خدا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی یاد آنے لگتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس یاد میں اخلاص شامل نہیں ہوتا۔ کیا دیکھا کہ ایک خوبصورت اور وسیع باغ ہے۔ اس باغ کے اندر ایک اونچی عالی شان عمارت کھڑی ہے۔ بہت سے آدمی اس عمارت کے قرب و جوار میں موجود ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے سبھی اپنی اپنی مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ میں ان آدمیوں میں کوئی شناسا چہرہ ڈھونڈ رہا ہوں' لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ دفعتاً خواب کا منظر بدلتا ہے۔ اب میں اپنے سامنے ایک خوش رو' طویل قامت اور بھاری جسم کی ایک بارُعب شخصیّت کو کھڑے پاتا ہوں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ ڈاڑھی براق سفید اور گنجان' آنکھیں بڑی بڑی اور ان میں سرخ ڈورے پڑے ہیں۔ چہرے کا رنگ بھی سرخ سفید اور چاند کی مانند چمکتا ہے۔ لباس بھی نرالا ہے ٹخنوں تک لمبا کرتا' سر پر عمامہ۔ یہ دونوں کپڑے سفید' کرتے کے نیچے شاید تہبند۔ میں انہیں مبہوت ہو کر دیکھ رہا ہوں۔ وہ اپنا دایاں ہاتھ بڑی شفقت سے میرے سر پر رکھ کر فرماتے ہیں......

"اللہ پر توکل رکھو...... توکل...... ہاں...... بس...... سب پریشانیاں دور......"۔

خواب ہی میں مجھے یہ جملے سن کر تسکین سی ہونے لگتی ہے اور جیسے ساری ذہنی پریشانیاں چھٹ جاتی

Marfat.com

ہیں۔

میں عرض کرتا ہوں حضرت آپ کون ہیں؟ اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

مسکرا کر فرماتے ہیں۔ "میرا نام توکل شاہ ہے...... تمہیں معلوم نہیں یہاں حضرت احمد سرہندی تشریف لائے ہیں اور یہ سب لوگ آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہیں؟"

اس کے بعد اچانک آنکھ کھل جاتی ہے اور میں اس خواب کی خوشبو میں دیر تک ڈوبا رہتا ہوں۔ تحیّر، سرور اور بے پناہ مسرت کی ایسی خوشبو جو یہ سطریں لکھتے ہوئے بھی میرا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ بیداری بھی خواب کا یہ سارا منظر مجھے اچھی طرح یاد رہتا ہے۔ جن بزرگ کی شبیہہ میں نے دیکھی ہے'...... انہوں نے اپنا اسمِ گرامی توکل شاہ فرمایا تھا اور یہ واقعہ ہے کہ میں نے اس سے پہلے یہ نام کبھی سنا اور نہ پڑھا تھا۔ اس لئے خواب کی بات جان کر کسی سے تذکرہ کیا نہ یہ جاننے کی جستجو ہوئی کہ اس دنیائے آب و گل میں اس نام یا عرف کے حامل واقعی کوئی بزرگ گزرے ہیں؟ وقت پر لگا کر اڑنے لگا' آہستہ آہستہ وہ پریشانیاں' جو بڑی حقیر تھیں دُور ہونے لگیں اور نئی نئی مصروفیات نے گھیر لیا اور پھر عارضی طور پر یہ مبارک خواب بھی متعدد خوابوں کے ہجوم میں گھر کر اوجھل ہو گیا اور توکل شاہ کا نام بھی ذہن سے محو ہونے لگا۔

ایک روز پنجاب پبلک لائبریری میں کتابوں کی الماریوں کے پاس کھڑا ایک خاص کتاب کی تلاش میں تھا کہ ایک پرانی بوسیدہ سی کتاب ہاتھ میں آئی اسے کھولا' تو سامنے ہی جلی سرخی پر نگاہ پڑی اور وہیں جم کر رہ گئی۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں' لاکھویں حصے سے بھی کہیں زیادہ سرعت سے کئی برس پہلے کے دیکھے ہوئے خواب کی یاد تازہ ہو گئی اور ان نورانی صورت والے بزرگ کی شبیہہ سامنے آ گئی جنہوں نے اپنا اسمِ مبارک توکل شاہ بتلایا تھا۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس لمحے میرے قلب کی کیا حالت ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اچھل کر یا تو سینے سے باہر آن پڑے گا یا اس کی حرکت رک جائے گی۔

کتاب کا نام تھا......

تذکرۂ توکلیہ مؤلف نے منشی نور احمد نیچے لکھا تھا......

مقبولِ بارگاہِ صمدیت' حبیب الرحمٰن قطب الارشاد حضرت سائیں توکل شاہ صاحب انبالوی قدس سرہٗ کے حالات بابرکات کا ایک مختصر تذکرہ۔

☆ ☆ ☆

اور یوں اس رات کا خواب دن کی ایک روشن حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔

حضرت توکل شاہ علیہ الرحمتہ کے حالات پر مشتمل یہ کتابچہ دیکھا' تو پیاس اور بڑھ گئی' بہت جستجو اور محنت کے بعد مختلف کتابوں اور تذکروں سے حضرت کے حالاتِ سیرت سامنے آئے۔ ایک گرانقدر

Marfat.com

تالیف حضرت کے خلیفۂ اعظم مولانا محبوب عالم رحمتہ اللہ علیہ کی نظر سے بھی گزری۔ معلوم ہوا حضرت توکل شاہ تیرھویں صدی ہجری کے ایک بہت بڑے بزرگ تھے۔ انبالے میں آپ نے برسوں تک رُشدو ہدایت کا بازار گرم کیا اور وہیں کی خاک میں آرام فرما رہے ہیں۔

1315ھ میں رحلت فرمائی تھی گویا حضرت کا وصال ہوئے اسی برس گزر چکے۔ نقش بندی سلسلے کے بزرگ تھے اور حضرت احمد سرہندی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کے روحانی اور معنوی فرزند۔ آپ کے فیضان میں سر سے پیر تک ڈوبے ہوئے ظاہری علوم سے نا آشنائے محض، لیکن علم لدُنی کے سمندر میں پیرے ہوئے اور اس کی گہرائیاں چھانے ہوئے۔ آپ کی ذات مبارک شریعت و طریقت کا بہترین نمونہ تھی۔ علمِ حقائق اور حُبِ الٰہی میں اپنی نظیر آپ۔ پورے برِ صغیر میں آپ کا سلسلۂ رشدو ہدایت پھیلا ہوا تھا اور خود حضرت کے قابلِ صد احترام معاصرین بزرگ بھی برملا فرماتے کہ فقر اور عشق کا امتزاج اگر دیکھنا ہو، تو توکل شاہ کو دیکھ لو ۔ ان معاصرین میں حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی قدس سرہٗ، حضرت مولانا قاری حافظ عبدالرحمٰن پانی پتی قدس سرہٗ۔ شیخِ عرب والعجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ جیسے اکابر شامل ہیں۔

حضرت کے ابتدائی حالات اور خاندانی واقعات ابھی تک پردۂ گمنامی میں ہیں۔ صحیح تاریخ پیدائش کا بھی علم نہ ہوسکا۔ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں ارشاد فرمایا...... "ہمارا گھر موضع کھوکی میں ہے جو ضلع گورداسپور میں موضع اترچھتر اور ڈیرہ بابانانک کے درمیان واقع ہے" ۔ والدین آپ کے ہوش سنبھالنے سے پیشتر ہی دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے تھے اس لئے حضرت کی پرورش نانا صاحب نے فرمائی جن کو لوگ میاں الہ دین شاہ مست کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ آپ کے نام رکھے جانے میں بھی روایتوں کا اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں حضرت کا اصل نام کریم شاہ تھا اور بعض کی رائے ہے کہ والدین نے مستان شاہ رکھا تھا۔ حضرت کے پیرو مرشد خواجہ قادر بخش صاحب قدس سرہٗ نے خلقی و طبعی صفت توکل آپ میں دیکھ کر توکل شاہ کہنا شروع کر دیا اور اسی نام نے شہرت اور بقا پائی۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ سرتاپا توکل کی علامت تھے اور یہ صفت آپ نے مجاہدے اور ریاض سے اس قدر پختہ فرمالی تھی کہ اس کی نظیر دوسری جگہ اس زمانے میں نہ تھی۔

آپ کبھی کبھی اپنے اوائل عمر کے حالات خدّام کے سامنے بیان فرمایا کرتے اور وہی ہمارے اس تذکرے کا مآخذ ہیں۔ ایک روز ارشاد ہوا، ہمیں بچپن سے عادت تھی کہ جہاں کسی اچھے بزرگ کے قیام کا حال معلوم ہوتا، وہیں چلے جایا کرتے۔ اسی طرح پھرتے پھراتے ہم اجمیر شریف چلے گئے اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ کے روضے پر رہنے لگے۔ وہاں ہم نے ایک مولانا صاحب کو دیکھا جن کی طرف قلب کو بہت میلان ہوا۔ وہ ایک حجرے میں گوشہ نشین تھے اور کسی سے ملا نہیں کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ ہم نے ان کی خدمت شروع کی۔ انہیں پانی لادیا کرتے، وضو کرادیتے اور زیادہ سے زیادہ وقت ان کی

Marfat.com

قربت میں گزارنے کی کوشش کرتے۔ ایک روز روضے پر قوالی ہو رہی تھی۔ لوگوں نے مولانا کو بھی مجلس سماع میں تشریف لانے کی دعوت دی۔ آپ نہ گئے اور فرمایا...... میرے عشق کا جوش تم لوگ برداشت نہ کر سکو گے۔ لوگوں نے ہم سے کہا تم مولانا سے عرض کرو، تمہارے کہنے سے چلے آئیں گے۔ ہم نے جاکر درخواست کی...... فرمایا...... بیٹا، میں چلا تو جاؤں گا، لیکن ایسا نہ ہو کہ معاملہ الٹا ہی ہو جائے۔ غرض تشریف لے گئے۔ قوالی شروع ہوئی۔ آپ کو جوش آگیا اور کھڑے ہو کر ایک نعرہ الا اللہ کا مارا۔ تمام اہلِ مجلس اور قوال بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ بعدازاں آپ حجرے میں واپس چلے گئے۔ جب میں حاضر ہوا، تو فرمایا...... ہم نہ کہتے تھے کہ ہمارے عشق کا جوش وہ سنبھال نہ سکیں گے۔ مولانا کی عادت تھی کہ کسی کو بیعت نہ فرماتے تھے۔ کچھ عرصے بعد آپ نے ہمیں کلمہ شریف کی ترکیب سکھائی، عجیب لذت و کیفیت اس میں آتی رہی۔ ہماری یہ حالت ہو گئی کہ جب وہ وقت آتا، تو خود بخود موئے بدن اور زبان سے کلمہ شریف جاری ہو جاتا۔ ان کا فیض چشتیہ طریق کا تھا۔ پھر مولانا کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی قدس سرہٗ کی روح مبارک سے حکم ہوا کہ تم بھرے چلے جاؤ، چنانچہ وہ بھرے تشریف لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہماری طبیعت بھی وہاں نہ لگی، پھر خواجہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی روح پُر فتوح سے ہم کو خواب میں ارشاد ہوا کہ تم خاندان نقشبندیہ کے صاحبِ طریقت وہدایت ہو گے۔ نقشبندی سلسلے سے فیض حاصل کرو، ہم وہاں سے چلے اور تلاش میں تھے کہ کہاں جائیں، کس سے بیعت ہوں۔ ایک روز ہمیں کوئی مجذوب فقیر ملا، اس نے کہا...... جہان خیلاں جاؤ۔ چنانچہ اس طرف چل دیئے۔ جہان خیلاں کے قریب ایک عورت مجذوبہ دکھائی دی۔ اس نے کہا...... "خوب آئے۔ جاؤ آفتابِ ہدایت کے ڈوبنے کا وقت قریب آگیا، جلدی اپنا حصہ لے لو۔ ابھی ہماری عمر گیارہ بارہ سال کی تھی۔ ڈاڑھی مونچھ کچھ نہ آئی تھی۔

"ہم شمس عرفانی حضرت قادر بخش علیہ الرحمتہ کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے۔ حضور نے ہمیں پیار کیا اور بیعت سے سرفراز فرمایا۔ کچھ عرصہ ہم حضرت خواجہ کی خدمت میں رہے، پھر انبالہ جانے کا حکم ہوا۔ ہم انبالہ چلے آئے۔ کبھی کسی مسجد میں پڑے رہتے، کبھی نند سنگھ کے باغ میں۔ اکثر قبرستان میں رہا کرتے جب طبیعت چاہتی حضرت خواجہ کی خدمت میں جہان خیلاں چلے جاتے۔ آخر کچھ مدت بعد حضرت نے ہم کو بیعت کر لینے کی اجازت بھی عطا فرما دی۔ ایک روز خواب دیکھا کہ حضرت کا وصال ہو گیا۔ وہاں پہنچے، تو پتہ چلا کہ ہمارا خواب سچا نکلا۔ حضرت علیہ الرحمتہ کے چہلم پر تمام خلفاء کی دستار بندی ہوئی، مگر مجھ کو کم سن سمجھ کر کسی نے دستار کے قابل نہ جانا۔ مجھے بڑا رنج ہوا اور روتا ہوا جنگل میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد حالت طاری ہوئی۔ دیکھا ایک لمبی سی دستار کا پلہ آسمان سے اترا اور میرے پاس آیا، پھر ندا آئی اسے باندھ لو...... ہم جہان خیلاں میں جب تک رہے حضرت خواجہ رحمتہ اللہ علیہ کے صاحب زادوں کی چاکری کرتے رہے، لیکن ان کے لنگر میں روٹی نہ کھاتے۔ مزدوری کے لئے جنگل میں جاتے۔ گھاس

Marfat.com

کھودتے اور تین چار آنے کا بیچ کر ان پیسوں سے اپنے لئے روٹی خریدتے۔ کبھی کبھی فاقے بھی گزر جاتے، مگر ہم کسی سے نہ کہتے نہ دستِ سوال دراز کرتے۔ ایک مرتبہ فاقے کے باعث اتنا ضعف ہوا کہ بے ہوش ہو گئے۔ اس کے بعد تو دنیا نے ہمیں خوب گھیرنا چاہا، مگر ہم نے موقع ہی نہ دیا۔ ہمارے دادا پیر حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ کی خدمت میں ایک شخص آیا جو بہت شکستہ حال اور تنگ دست تھا۔ لوگوں نے کہا...... حضور اس شخص نے دنیا چھوڑ دی۔ آپ نے فرمایا...... اس نے تو دنیا نہیں چھوڑی...... البتہ دنیا نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ شام ہوئی اور اسی شخص نے حضرت حاجی صاحب سے تنگیٔ رزق دور ہونے کا عمل دریافت کیا، تو سب کچھ پتہ چل گیا کہ واقعی دنیا نے اسے چھوڑ رکھا ہے۔ فقیر وہ جو دنیا کو آپ ترک کرے۔ یہ غریبی اور مسکینی بندے پر اللہ تعالیٰ کی بڑی بھاری نعمت ہے۔ اس کا رنج نہ کرنا چاہئے۔ یہ غربت ہی بندے کو اپنے رب تک پہنچانے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا...... الٰہی مجھے مسکین ہی زندہ رکھ اور مسکین ہی اٹھا اور مسکینوں ہی میں میرا حشر کر۔ حضرت سلطان ابراہیم بن ادہم رحمتہ اللہ علیہ جب سلطنت پر لات مار کر چلے، تو راستے میں ایک شخص نے کہا...... حضرت! میرے لئے دعا فرمائیں، میری غریبی دور ہو۔ آپ نے فرمایا...... اے عزیز! میں نے اپنی سلطنت دے کر یہ غریبی مول لی ہے، کیونکہ میں نے سنا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے روز مسکینوں اور غریبوں کی جماعت میں ہوں گے۔ پھر میں تیرے لئے کس طرح دعا کروں کہ ایسی بھاری نعمت جاتی رہے۔

توکل شاہ صاحب کا ایک مرید تھا۔ وہیں آپ کے پاس خانقاہ میں رہتا، لنگر سے دونوں وقت روٹی کھاتا اور اللہ اللہ کیا کرتا۔ ایک دن نہ جانے کیا جی میں آئی، شاہ صاحب سے عرض کرنے لگا کہ حضور! دعا فرمائیں، مجھے کہیں نوکری مل جائے۔ شاہ صاحب نے دعا فرما دی۔ کچھ عرصے بعد وہ سو روپے ماہانہ پر کہیں نوکر ہو کر رخصت ہوا۔ شاہ صاحب افسوس کرنے لگے کہ اچھا آدمی تھا، سو روپے میں ایسی بھاری نعمت سے محروم ہو گیا۔ بعض دنیادار حاضرینِ خانقاہ نے یہ جملے سنے تو ایک دوسرے سے کہنے لگے...... شاہ صاحب کو تو خوش ہونا چاہئے تھا کہ خدا نے ان کی دعا سے اس شخص کو سو روپے مہینے کا نوکر کرا دیا۔ الٹا افسوس کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی یہ گفتگو خانقاہ میں مقیم ایک مردِ درویش نے سنی، تو آہ بھر کر بولا...... ارے بے وقوفو! کیا بات کرتے ہو؟ سائیں توکل شاہ مردِ کامل ہیں۔ ان کے سامنے سو، ہزار، لاکھ یا کروڑ روپے کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ ان کو دنیا بھر کی سلطنت سے زیادہ اللہ اللہ ہی اچھا لگتا ہے۔

شاہ جی تک یہ باتیں پہنچیں، تو ہنس پڑے۔ فرمایا...... میاں خوش نصیب ہے وہ شخص جسے دنیا کا کام کم سے کم کرنا پڑے اور روٹی بافراغت اسے ملتی رہے۔ باقی تمام اوقات اللہ کی یاد میں صرف کرے۔ تھوڑے پر قناعت کرے۔ رزق اگر تھوڑا ہے، تو کیا غم، دینے والا تو بہت بڑا ہے۔ بڑی مبارک اور بابرکت ہے وہ غریبی جس کے ساتھ خدا کی یاد ہو اور جس غریبی یا تنگی کے ساتھ فسق و فجور مل جائے، خود خدا

Marfat.com

کے غضب کی نشانی ہے' کیونکہ دنیا تو گئی ہی تھی' دین بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ اتنے میں ایک شخص نے آن کر کہا...... حضور' مجھے روٹی کا وظیفہ بتادیں۔ فرمایا...... ہمارے پاس روٹی دینے والے سے ملانے کے وظیفے تو بہت ہیں' مگر روٹی کا کوئی وظیفہ نہیں۔ اس نے بہت اصرار کیا' تو مسکرا کر کہا...... "تجھے ایسا ہی شوق ہے' تو یا روٹی یا روٹی کہا کر"۔ اس کے بعد فرمایا...... یادِ الٰہی کی مثال ایسی ہے جیسے کسان غلہ بیجتا ہے۔ اس کا اصل مقصود تو اناج ہی ہوتا ہے۔ بھوسا پرالی وغیرہ اس کا مقصودِ اصل نہیں ہوتا' حالانکہ جب کھیتی اُگتی ہے' تو دانوں سے پہلے بھوسا اور پرالی وغیرہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور دانوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح یادِ الٰہی اور اس ذات کا وصل دانوں کی مانند ہے اور دنیا کا یہ مال و اسباب بھوسا پرالی وغیرہ کے مشابہ۔ پس جس شخص کا مقصود ذات کے ساتھ دوستی کرنا ہو' اس کی نظر ہمیشہ ذات کی طرف رہتی ہے اور جب ذاتِ الٰہی کے ذکر میں مشغول ہو گیا اور وصل شروع ہوا' تو اسے دنیا کا یہ مال و اسباب خود بخود ایسے ہی مل جاتا ہے جیسے بھوسا اور پرالی' کسان کو بغیر طلب ملتا ہے' لیکن جو شخص محض بھوسے ہی کا خواہشمند ہو' وہ دانوں سے بھی محروم رہتا ہے اور بھوسے وغیرہ سے بھی یعنی جو محض دنیا کا طالب ہو' وہ مال و اسباب دنیا سے بھی محروم رہتا ہے اور آخرت میں بھی خسارہ ہاتھ آتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی عادت مبارک یہ تھی کہ امیر' غریب' مالدار' نادار جو کوئی آپ کے پاس آتا' سب سے ایک ہی برتاؤ فرماتے۔ امیر روپے وغیرہ نذر لے کر آتا' تو اس کی کچھ زیادہ تعظیم و توقیر نہ فرماتے۔ اس کے برعکس کوئی مسکین خالی ہاتھ آتا' تو خوش ہوتے۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا۔ ابتداء میں ایک دولت مند شخص ہم سے بیعت ہوا۔ ہمیں خیال آیا۔ امید ہے اس کے ذریعے ہمارے لنگر اور درویشوں کو بہت مدد ملے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ہم پر ایسا فضل کیا کہ وہ امیر دوبارہ ہمارے پاس آیا ہی نہیں' البتہ اگلے روز ایک غریب آدمی آیا جس کے کپڑے بھی پھٹے پرانے تھے۔ بظاہر نہایت مسکین نظر آتا تھا۔ اس نے خانقاہ کے درویشوں کی بہت خدمت کی اور اسے بھی خدا کا نام حاصل ہو گیا۔ اس وقت ہم سمجھے کہ یہ نفس کا خطرہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھا دیا کہ میری ذات پر بھروسا رکھنا چاہیئے۔ میں جس سے چاہوں' خدمت کرا دوں! چنانچہ اب ہمارا یہ حال ہے کہ یہ لوگ جو ہمارے پاس آتے ہیں' اگر چلے جائیں' تو غم نہیں اور آجائیں تو خوشی نہیں۔

ایک دفعہ مہاراجہ جموں' ہندوستان کی سیر کرتا ہوا انبالے آیا اور راجہ ناہن کی کوٹھی میں اترا۔ ایک بہروپیا حضرت توکل شاہ کا بہروپ بنا کر' تسبیح ہاتھ میں لئے' مستانہ انداز و ادا سے راجہ جموں کے پاس پہنچا۔ آپ کی عادت تھی کہ بعض اوقات یا رحیم یا کریم یا اللہ ایک خاص ادا کے ساتھ فرمایا کرتے تھے اور کبھی کبھی اللہ اللہ حق حق حق۔ اتنا فرما کر آپ اپنے فکر و مراقبے میں مشغول ہو گئے۔ ادھر وہاں بہروپئے کے منہ سے بے اختیار اللہ اللہ حق حق حق کے کلمات ادا ہوئے۔ ان کلمات میں راجہ جموں کو وہ لذت ملی کہ وہ رہ نہ سکا اور بہروپئے سے کہا...... سُن' جو لینا ہو ہم سے لے لے' مگر یہ بتا دے کہ جس بزرگ

Marfat.com

کی نقل تو نے اتاری ہے وہ فوت ہو چکے یا زندہ ہیں۔ اگر زندہ ہیں' تو کہاں ہیں؟ بہروپیے نے جواب دیا...... وہ زندہ ہیں اور یہیں انبالے میں موجود ہیں۔ راجہ نے کہا...... جن بزرگ کی نقل سے اتنا اثر ہوا ہے اصل میں تو خدا جانے کیا ہوں گے۔ چنانچہ راجہ پانچ سو بیگھے زمین کا قبالہ اور پانچ سو روپے کا نوٹ اور کسی قدر اشرفیاں ایک تھال میں رکھ کر' بہروپیے کو ساتھ لئے ہوئے حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچا۔ آپ نے بہروپیے کو دیکھتے ہی فرمایا...... کیوں بندے اللہ دے! نقل تو ٹھیک کی تھی؟ اس نے شرم سے گردن جھکا کر دست بستہ عرض کیا...... حضور! مجھ سے غلطی ہوئی' معاف فرمائیے۔ فرمایا...... غلطی تو تب ہوتی اگر تو سچ سچ نقل نہ کرتا۔ آخر راجہ جموں نے وہ تھال پیش کیا۔ آپ نے پوچھا...... یہ کیا ہے؟ راجہ نے عرض کیا...... حضور! ایک تو پانچ سو بیگھے زمین کا قبالہ ہے' ایک پانچ سو روپے کا نوٹ اور چند اشرفیاں...... فرمایا...... یہ زمین ہمارے کس کام کی ہے؟ نری فساد کی جڑ۔ باقی تیرے ان روپوں پیسوں کی بھی ہمیں ضرورت نہیں۔ پھر آسمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا...... وہ دیکھو...... وہ ہمارا لنگر ہے وہیں سے دبادب روپے پیسے اناج وغیرہ ہمارے درویشوں کے لئے چلا آرہا ہے۔ اس کے بعد حضرت نے بہروپیے کی طرف اشارہ کر کے کہا...... اس نے بڑی محنت کی ہے' اس کو دے دو۔ راجہ نے ہرچند اصرار کیا' مگر آپ نے قبول نہ فرمایا۔ بعدازاں راجہ نے کسی تکلیف کے واسطے دعا کرائی۔ آپ نے دعا فرمائی' اس کی وہ تکلیف دور ہو گئی۔

اس طرح ایک روز مالیر کوٹلے کا والی' نواب ابراہیم علی خان' حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور تین سو روپے بڑے ادب سے نذر میں پیش کئے۔ آپ نے فرمایا...... اسے سامنے سے ہٹالو' ہم نہیں لے سکتے۔ نواب نے اصرار کیا' آپ نے انکار' دو تین مرتبہ ایسا ہی ہوا' تو آپ کو جوش آیا۔ روپوں کا تھال اٹھا کر پرے پھینک دیا اور آپ جنگل کو تشریف لے گئے۔ آخر نواب نے معافی مانگی۔

مہاراجہ پٹیالہ کا خط ایک مرتبہ اس مضمون کا آیا کہ ہمارے ہاں لڑکے کی پیدائش کی خوشی میں جلسہ ہے۔ کیا خوب ہو جو آپ جیسے بزرگ بھی اس جلسے میں تشریف لائیں اور دعا کی برکت سے مالا مال کریں۔ حضور کی خاطر مدارات کی پوری پوری کوشش کی جائے گی۔ حضرت نے جواب میں لکھوایا...... ہم ایسے غنی کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں جس کے دربار کے گداگر بھی تجھ سے زیادہ بہتر ہیں۔ ہم کو تیری خاطر مدارات کی کچھ پروا نہیں اور ہم اپنے آقا کے دروازے سے اٹھ کر کہیں نہیں جاتے۔ ہماری اصل وراثت توکل ہے اور وہ اللہ نے ہمیں کامل عطا فرمائی ہے۔ ہم اس میں کمی نہیں کرنا چاہتے۔

پھر توکل کا ذکر ہونے لگا کہ یہ کیا چیز ہے۔ پانی پت کے ایک صاحب حضرت کی خانقاہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ ان دنوں روزے رکھ رہے تھے۔ انہوں نے کسی شخص کے بارے میں فرمایا...... حضرت! فلاں صاحب اگرچہ روزے نہیں رکھتے؟ تاہم یہاں رہ کر روٹی نہیں کھاتے' کیونکہ انہوں نے توکل کو اپنا شعار بنالیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا...... ہمارے ہاں رہ کر انہیں توکل نہیں کرنا چاہئے تھا جبکہ لنگر

Marfat.com

میں سب کچھ موجود ہے اور اس کا نام توکّل نہیں۔ توکّل کی کئی صورتیں ہیں۔ ایک تو عام دنیاداروں کا توکّل ہے۔ مثلاً کسان نے زمین میں ہل چلایا' بیج بویا' فصل کی رکھوالی کی اور اپنی طرف سے تمام ضروری باتیں کھیتی کے بارے میں کر چکا۔ پھر اس نے اللہ تعالیٰ پر بھروسا کیا۔ یہ عام دنیاداروں کا توکّل ہے۔ دوسرا توکّل سیاحوں کا ہے کہ انہوں نے اپنی ضروریات سفر کپڑے' کچھ روپے' کھانے پینے کی چیزیں' برتن وغیرہ ساتھ لے لئے ہیں۔ یہ بھی توکّل کے خلاف نہیں۔ تیسرا توکّل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا کہ وہ حضرات جہاد کے واسطے گھوڑے بھی مہیا کرتے اور تلواریں' نیزے اور دوسرے آلاتِ حرب بھی جمع فرماتے۔ بعض اوقات جوشِ توکّل میں آ کر جہاد کے وقت اپنی زرہیں بھی اتار دیا کرتے اور حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تو یہ حال تھا کہ اگر کوئی ایک زرہ پہنتا' تو آپ دو پہنتے تھے۔ یہ عین توکّل تھا' مگر عامۂ اُمت کی تعلیم کیلئے...... پھر ایک توکّل ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اسباب بالکل قطع کر دیئے ہیں۔ ہر بات ہر کام میں ان کا بھروسا صرف ذاتِ الٰہی پر ہوتا ہے اور ایک توکّل وہ ہے جو اصحابِ صفہ کو عطا ہوا تھا' لیکن سب میں توکّلِ کامل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جس میں سبھی صورتیں توکّل کی جمع ہو گئی تھیں۔ آپؐ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا فرماتے۔ کنگھی مسواک وغیرہ بھی اپنے پاس رکھتے' بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ پر بھروسا فرماتے۔ پس اسباب کو کام میں لانا اور مسبب اور مؤثرِ حقیقی اللہ کو جاننا۔ یہ بھی توکّل ہی ہے۔

"ایک توکّل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ تھا کہ آپ درخت کے نیچے آرام فرما رہے ہیں اور آپ کے پاس کوئی ہتھیار نہیں۔ ایک کافر آیا اور اپنی تلوار نکال کر بولا...... اے محمد! اب تمہیں میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ آپؐ نے اطمینان سے فرمایا...... اللہ۔ اس کلمہ مبارک پر وہ کافر تھرایا اور تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار اٹھالی اور فرمایا۔ اب تو بتا' تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ اس نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا...... حضور ہی کی مہربانی ہو' تو جان بچ سکتی ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا...... تجھے بھی اللہ ہی بچائے گا۔ اس پر اتنا اثر ہوا کہ اسی وقت کلمہ پڑھ کر اسلام لے آیا۔ غرض توکّل بڑی ہی اعلیٰ درجے کی صفت ہے۔ توکّل ہی پر ایمان کا دارومدار ہے۔ اسی سے مراتب ملتے ہیں۔ اسی سے علمِ توحید میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ اسی سے معرفتِ الٰہی ہوتی ہے اور اسی سے مومن خدا کی راہ میں ثابت قدم رہتا ہے۔ اسی سے عبودیت کامل ہوتی ہے اور اسی سے الوہیت کا اظہار عبدیت پر ہوتا ہے۔ اسی سے انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کا محکوم بنتا ہے۔ قرآن حکیم میں جابجا اسی لئے حق تعالیٰ نے توکّل کی شان بیان فرمائی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت شاہ صاحب نے بڑے جوش سے فرمایا...... عشق حق تعالیٰ تک پہنچا تو دیتا ہے' مگر توکّل کے بغیر درویش خام ہی رہتا ہے' اس میں پختگی نہیں آتی۔ ایک روز توکّل کا امتحان ہمارا بھی ہوا تھا کہ کھانے کو ہم سے کسی نے نہ پوچھا جب بہت بھوک لگی' تو ہم اپنے ایک محبت والے کے گھر گئے کہ وہاں روٹی کھائیں گے' لیکن اس نے بھی کچھ خیال نہ کیا اور کہنے لگا...... شاہ جی' آپ

Marfat.com

مسجد میں بیٹھ جائیں، میں تو کسی کام سے جاتا ہوں۔ ہم وہاں سے چلے آئے اور اس وقت خیال آیا کہ یہ تو خدا کی طرف سے توکّل کا امتحان تھا۔ چنانچہ ہم جنگل میں چلے گئے، توبہ کی اور آئندہ عہد کیا اے اللہ تیرا در چھوڑ کر اب کہیں نہ جاؤں گا۔ اس کے بعد قلب پر تسلی اور تسکین کا نزول ہوا۔ پھر شام کو وہی ہمارا ملنے والا پچیس روپے نذر لے کر حاضر ہوا اور معذرت کی کہ مجھ سے بڑی خطا ہوئی۔ ہم نے کہا تجھ سے کوئی خطا نہ ہوئی، خطا تو ہم نے کی تھی کہ اپنے رب کا دروازہ چھوڑ کر تیرے دروازے پر گئے۔ اس واقعے کے بعد ایسا فضل اللہ تعالیٰ کا ہوا اور ایسی استقامت ہم کو توکّل میں عطا ہوئی کہ پھر ایک ہی جگہ ہم نے ٹھکانا کر لیا"۔

حضرت شاہ صاحب کی سیرت میں بے شمار واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ مخلوقِ خدا پر بڑی شفقت فرماتے تھے اور اس میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کسی کی تخصیص نہ تھی۔ اس شفقت کا ایک جزہدایت بھی تھی جو کوئی ملاقات کے لئے آتا، خندہ پیشانی سے ملتے اور آپ کا تکیہ کلام تھا، بندے اللہ دے...... اس کلمے سے دو پہرے کو خطاب کرتے۔ ایک روز ریاست نابھ کا رہنے والا ایک گرنتھی سکھ حاضر ہوا۔ سکھ اسے بھائی جی کہا کرتے اور بے حد احترام سے پیش آتے۔ اس نے حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضور، مجھے بھی خدا کا نام لینا بتلا دیں، لیکن کلمہ نہ سکھائیں۔ آپ یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا...... بندے اللہ دے، ہم کو تو یہی کلمہ آتا ہے اور اس کو تو سیکھنا چاہتا نہیں۔ یہ فرما کر اپنا دستِ مبارک اس کے شانے پر رکھ دیا اور کہا...... کہہ، میں نہیں۔ سکھ نے کہا...... میں نہیں۔ اتنا کہتے ہی اس پر استغراق کی حالت طاری ہو گئی۔ شاہ صاحب نے پھر اس کا کندھا ہلا کر فرمایا...... او بندے اللہ دے، جلدی نہ کر، آگے بھی کہہ لے۔ کہہ، رب ہے۔ اس نے کہا رب ہے۔ یہ کہتے ہی بالکل بے ہوش ہو گیا اور تقریباً گھنٹہ بھر اسی حالت میں رہا۔ کچھ ہوش آیا تو کہنے لگا...... حضور، آپ نے تو مجھے وہی کلمہ سکھا دیا جس کا میں انکار کرتا تھا۔ یہ دیکھئے، میرے تمام بدن سے کلمہ جاری ہے۔ آپ نے فرمایا...... ہاں خوب موج کیا کر۔ پھر وہ سکھ گرنتھی باقاعدہ کلمہ شریف پڑھنے لگا، نابھ واپس آ گیا، تو وہاں بھی یہی کہا کرتا کہ گرنتھ میں کچھ نہیں، جو کچھ ہے اسی کلمے میں ہے۔ آخر اس استغراقی حالت میں مر گیا۔

ایک بنگالی حافظِ قرآن، رمضان کے مہینے میں حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا...... حضور، میرے لئے دعا فرمائیں کہ لوگ میرا قرآن مجید سنیں۔ تمام مسجدیں حافظوں سے رکی ہوئی ہیں اور میرا قرآن شریف کوئی نہیں سنتا۔ آپ نے فرمایا...... بندے اللہ دے، تو لوگوں کو کیوں سناتا ہے۔ عرض کیا...... حضرت! مدعا یہ ہے کہ لوگ تراویح میں میرا قرآن سنیں، میں آج کل تنگ دست ہوں۔ شاید مجھے خرچ کے لئے کچھ روپے مل جائیں۔ فرمایا...... بندے اللہ دے، تو لوگوں کو کیوں سناتا ہے؟ قرآن پاک جس کا کلام ہے اسی کو سنا۔ اپنا کلام اسے سب سے پیارا ہے اور وہی اس کی قدر کرے گا۔ حافظ صاحب نے عرض کیا...... حضرت، اسے کس طرح سناؤں؟ فرمایا...... بس جس طرح نماز میں تو اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ تصوّر ہوتا ہے کہ وہ میرا کلام سن رہا ہے۔ اسی طرح قرآن شریف بھی اس کو

Marfat.com

سنا۔ چنانچہ حافظ صاحب نے یہ معمول کر لیا کہ دریائے گھگر پر جا کر قرآن مجید تراویح کی نیت سے پڑھا کرتا اور خانقاہ کے لنگر میں آ کر کھانا کھا لیتا۔ ایک دن اس نے عرض کیا...... حضرت 'اب تو بہت لطف آنے لگا ہے اور تلاوت میں خوب دل لگتا ہے۔ قرآن خوانی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سچ مچ اللہ تعالیٰ خود ہی سن رہا ہے۔ فرمایا...... بس تو اللہ نے تیرا قرآن منظور فرما ہی لیا ہے۔ غرض حافظ صاحب نے تمام قرآن مجید اسی طرح ختم کیا۔ آخری روز قرآن پڑھتے ہوئے کچھ غنودگی سی آ گئی۔ جب آنکھ کھلی' دیکھا کُرتے کے دامن میں ساٹھ ستر چاندی کے روپے بندھے ہوئے ہیں۔ حافظ جی خوش خوش حضرت کی خدمت میں آئے اور سارا قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا...... تو نے ادنیٰ چیز کی نیت کی تھی' سو وہ تجھے مل گئی۔ اگر تُو ذاتِ باری کے وصل کی نیت کر لیتا' تو وصل ہی ہو جاتا۔ جا خیر ہو گئی۔ یہ بالکل حلال روزی ہے اور خود اللہ کی دی ہوئی ہے۔

ایک دفعہ انبالے کا ڈپٹی کلکٹر حاضر ہوا۔ حضرت توکل شاہ اس وقت بیت الخلاء میں تھے۔ آپ کے خادموں نے اسے حجرے میں بٹھا دیا۔ حضرت جب فارغ ہو کر تشریف لائے' تو فرمایا...... اندر کون ہے؟ اسے باہر لے آؤ۔ ڈپٹی باہر آیا۔ آپ نے پوچھا...... کہہ کیا کہتا ہے؟ عرض کیا...... حضرت! مجھے بیعت فرما لیں فرمایا...... اچھا تو درود شریف پڑھا کر۔ ہم تجھے بیعت نہیں کرتے' کیونکہ تو یہاں ڈپٹی ہے لوگ ہمیں تنگ کریں گے کہ اس کے پاس ہماری سفارش کر دو۔ اب ہمیں کیا خبر کون حق پر ہے کون ناحق پر۔ بے فائدہ بار ہم پر ہو گا۔ ہاں' جب تو پنشن لے لے گا' اس وقت تجھے بیعت کر لیں گے۔ یہ فرما کر اسے کچھ نصیحتیں کیں اور رخصت کر دیا۔

آپ کو شریعت اور سُنّتِ رسول اللہؐ کی پاسداری اور اس پر عمل کرنے کا بڑا خیال رہتا۔ شریعت اور سنت کے خلاف کسی کا عمل دیکھتے' تو سختی سے ٹوکتے' بلکہ زیادہ جوش آتا' تو مارتے۔ ایک مرتبہ ایک شہ زور پہلوان سے کہا کہ اوپر چھت پر نہ چڑھا کرو۔ ہمسایوں کی بے پردگی ہوتی ہے۔ اس نے بات نہ مانی۔ آپ نے بار بار اسے نرمی سے سمجھایا' وہ اکڑتا ہی رہا۔ جب دیکھا کسی طرح نہیں مانتا' تو لکڑی اٹھا کر اسے خوب مارا اور فرمایا...... بدبخت ہم تجھے شریعت کی بات بتاتے ہیں اور تو مانتا نہیں۔ پٹنے کے بعد اس پہلوان میں تبدیلی واقع ہوئی۔ آپ کے قدموں میں گر کر معافی مانگی' پھر بُری حرکتوں سے توبہ کی اور پکا مومن بن گیا۔
اسی طرح آپ کو حلال' حرام کی بڑی فکر رہتی۔ بعض لوگ اپنی ناجائز آمدنیوں میں سے نذر پیش کرنا چاہتے' تو آپ نورِ باطن سے معلوم کر لیتے اور سختی سے انکار کر کے ایسے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دیتے۔ یہ صفت خداداد تھی کہ صرف حلال مال قبول فرماتے' حرام نہ لیتے۔ اگر کوئی عرض کرتا کہ حضور ایسا روپیہ کسی دوسرے ہی کو دے دیا کریں' تو فرماتے کہ پھر بھی مِلک تو ہماری ہوا اور ہم ایسے مال کو اپنی مِلک ہی کرنا نہیں چاہتے۔ بعض لوگ اصرار کر کے شادی بیاہ کی تقریبوں میں آپ کو برکت کے خیال سے لے جاتے۔ آپ ان سے پہلے وعدہ لیتے کہ شریعت کے خلاف کوئی رسم نہ کرو گے اور نہ طوائفوں یا ڈوموں کا

Marfat.com

ناچ گانا ہو گا تب چلوں گا۔ اس طرح آپ نے سینکڑوں‘ ہزاروں فضول اور بے ہودہ رسموں کا خاتمہ کر دیا جن میں شرک کی آمیزش تھی۔

ایک مرتبہ جالندھر کے کسی گاؤں میں تشریف لے گئے۔ پورا گاؤں آپ کا مرید تھا اور آپ نے انبالہ سے چلتے ہوئے ان سے وعدہ لے لیا تھا کہ اس شادی میں خلافِ شریعت کوئی رسم نہ کرو‘ تو ہم چلتے ہیں لیکن ان میں سے چند لوگوں نے اپنے وعدے کا پاس نہ کیا اور ایک طوائف کو ناچ گانے کے لئے بلوالیا۔ اس کی آواز جب آپ کے کانوں تک پہنچی اور آپ کو پتہ چلا کہ یہ طوائف کا گانا ہے‘ تو بے حد رنجیدہ ہوئے اور حالتِ جذب میں یکایک اٹھ کر انبالے کی طرف چل دیئے۔ ریلوے اسٹیشن اس گاؤں سے کوئی دو تین میل دور تھا اور ریل اسٹیشن پر آچکی تھی۔ گاؤں سے باہر نکلے‘ تو خدام نے عرض کیا...... حضور! ریل تو آچکی۔ آپ نے فرمایا...... ہمارے قدم کے ساتھ قدم رکھتے ہوئے چلے آؤ۔ دائیں قدم پر یا حیّ اور بائیں پر یا قیوم پڑھتے رہو راستہ جلدی طے ہو جائے گا۔ خدام نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ چند لمحے بعد وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ گاڑی ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔

مہمانوں کا ہر طرح اعزاز و اکرام فرماتے۔ کوئی حاجت مند ہوتا تو اسے روپے پیسے بھی عطا کرتے۔ کھانا کھلاتے‘ ان کے کپڑے دھلواتے‘ جو لوگ پیدل سفر کر کے دور دراز سے آتے‘ انہیں تین چار روز تک مہمان رکھتے اور ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے۔ آپ کا عام قاعدہ تھا کہ عورتوں کو ہمیشہ پردے میں بٹھا کر اور دستار مبارک کا ایک پلہ پکڑا کر بیعت فرمایا کرتے۔ ایک بار بہت بوڑھی عورت بیعت کے لئے حاضر ہوئی۔ اس پر پردہ شرعی فرض نہیں رہا تھا۔ وہ بلا پردہ بیعت ہونے لگی۔ آپ نے فرمایا...... ہم پردے کے اندر دستور کے مطابق بیعت کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ کے محبوب مرید اور خلیفۂ اعظم حضرت خواجہ عالم شاہ صاحب نے عرض کیا...... حضور! اس پر تو پردہ فرض نہ تھا۔ فرمایا...... بے شک اس پر پردہ فرض نہ تھا لیکن ہم نے اس خیال سے کہ ہمارے ملنے والے اس کی سند پکڑیں اور بلا پردہ عورتوں کو بیعت کرنے لگیں‘ اسے پردے میں بیعت کیا۔ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی کا آپ کو ایسا خیال تھا کہ ایک بار ہمسائے میں کوئی چمار مر گیا۔ آپ نے اس وقت تک کھانا نہ کھایا جب تک اسے باہر جلانے کے واسطے نہ لے گئے۔ فرمایا...... پڑوسی ہے جب ان پر غم ہے تو ان سے الگ ہو کر کھانا کھانا چاہئے۔ چنانچہ مسجد میں تشریف لے گئے اور وہیں کھانا منگا کر تھوڑا سا تناول فرمایا۔

آپ کو حفاظتِ حقوق اور حفاظتِ لسان کا بھی بڑا خیال رہتا۔ خدام سے بار بار دریافت فرمایا کرتے کہ آج ہماری کوئی بات آدابِ شرع کے خلاف یا فضول تو نہیں ہوئی۔ خدام عرض کرتے‘ حضرت! یہ کیا فرماتے ہیں‘ ہم تو سوائے یادِ خدا کے کچھ اور نہیں دیکھتے۔ اس پر آپ مسکرا کر چپ ہو جاتے۔ اگر کوئی اہلِ علم آپ کی خدمت میں بیٹھا ہوتا‘ تو فرماتے...... ہماری باتوں کو اچھی طرح یاد رکھا کرو۔ یہ قرآن مجید اور حدیث شریف کے مطابق ہوں گی اور ان کو قرآن اور حدیث سے ملا لیا کرو۔ حضرت کے خلیفہ مولانا

Marfat.com

محبوب عالم جو قرآن اور حدیث کے بہت بڑے عالم تھے۔ فرماتے ہیں' میں نے بارہا حضرتِ اقدس کے ارشادات کو قرآن و حدیث سے ملایا ہے اور کبھی تفاوت نہ پایا۔

حضرت شاہ صاحب کے ایک خلیفہ امیر اللہ شاہ تھے جنہیں حروفِ ابجد کی بھی شُدبُد نہ تھی' بایں ہمہ نہایت کامل' عارف اور علمِ لدنی کی دولت سے مالا مال۔ قصبہ بوڑیہ کے رہنے والے تھے۔ ایک مرتبہ اپنے وطن میں' رمضان شریف کے مہینے میں تراویح کے اندر کسی حافظ سے قرآن سن رہے تھے۔ حافظ نے بھول کر ایک آیت چھوڑ دی۔ خلیفہ امیر اللہ شاہ نے وہ آیت اسے بتادی۔ وہ صحیح کر کے آگے پڑھنے لگا۔ ایک مقام پر اسے پھر متشابہ لگا۔ خلیفہ صاحب نے وہ آیت بھی بتائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے' تو لوگوں نے از حد تعجب سے پوچھا حضرت! آپ قرآن مجید تو پڑھے ہوئے نہیں' پھر یہ آیتیں کیسے بتادیں؟ انہوں نے سکوت فرمایا اور اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ لوگوں میں اس کرامت کا بڑا چرچا رہا۔ کسی نے حضرت توکّل شاہ صاحب سے بھی عرض کر دیا۔ آپ نے خلیفہ صاحب کو طلب کر کے پوچھا...... امیر اللہ! وہ حافظ والی بات کیا تھی؟ انہوں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا...... "حضور' میں حسبِ عادت نماز میں حقیقتِ قرآن کا وہ فیض' جو لوحِ محفوظ پر پڑ رہا تھا' اپنے قلب پر لینے لگا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آیتوں کے الگ الگ ٹکڑے مجھ پر اور حافظ پر برابر وارد ہو رہے ہیں۔ حافظ نے ایک آیت نہیں پڑھی۔ اس کا ٹکڑا میرے سامنے تو آیا' مگر حافظ کی طرف نہ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ حافظ یہ آیت بھول گیا ہے۔ چنانچہ میں نے اس ٹکڑے کو دیکھ کر بتادیا"۔

حضرت شاہ صاحب نے یہ بات سنی اور فرمایا...... "ٹھیک ہے تم نے حقیقتِ قرآن کا مراقبہ کیا' تب یہ بات نصیب ہوئی اور ہمارا ڈیرہ ہر وقت وہیں رہتا ہے اور ہم نے آج تک یہ بھید ظاہر ہونے نہ دیا' لیکن تو نے اتنی سی بات کا شور مچا دیا۔ فقیر کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اس سے فقیر فتنہء خلق بن جاتا ہے۔ بس اعمال نیک کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا میں لگا رہے۔ ایسی باتوں کو چھپائے رکھے۔ خبر نہیں قیامت کے دن کیا معاملہ پیش آئے۔ بندے کو ہمیشہ خوف و رجا کے درمیان رہنا چاہئے۔ نفس و شیطان دو دشمن ساتھ ہیں۔ اللہ کا خوف دل میں رکھے اور مغفرت کی دعا کرتا رہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں شیطان کا داؤ نہ چل جائے' اگر ایسی باتوں میں فخر آجائے' تو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے"۔

حضرت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے عشق تھا۔ فرماتے تھے میری پرورش ہی روحِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے چند علمائے دین کی دعوت کی اور ان کے لئے نہایت نفیس کھانے پکوائے۔ اس دعوت میں آپ نے درویشوں کو شریک نہ فرمایا۔ چند روز بعد آپ سے دریافت کیا گیا کہ حضور! اس میں کیا مصلحت تھی کہ دعوت میں آپ نے درویشوں کو شریک نہ کیا۔ ارشاد ہوا...... "ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ دیکھا آپ ارشاد فرماتے ہیں...... کبھی ہمیں بھی تو کھانا کھلا دیا کرو۔ ہم سوچنے لگے اس ارشاد مبارک کی تعمیل کیونکر کی جائے۔ آخر

Marfat.com

خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین آپ کے دین کا کام سرانجام دینے والے علماء ہیں۔ اس لئے ہم نے علماء کی دعوت کی"۔

حضرت کے خلیفۂ اعظم مولانا محبوب عالم کا بیان ہے کہ ایک روز کوئی شخص آپ کے لئے پانوں کا ہدیہ لے کر آیا۔ آپ نے اس سے فرمایا...... یہ پان فلاں شخص کو دے دو۔ وہ پان اسے دے دیئے گئے۔ مولانا نے حضرت سے پوچھا' حضور! آپ پان نہیں کھاتے؟ فرمایا...... پہلے ہم کثرت سے پان اور تمباکو کھایا کرتے تھے۔ ایک روز ہم نے درود شریف بہت پڑھا۔ شب کو خواب میں دیکھا کہ ایک عجیب پُرفضا اور خوشنما باغ ہے۔ اس میں ایک پختہ اور نہایت عمدہ چبوترے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ میں نے قدم بوسی کا شرف حاصل کیا اور مجھے حضورِ انور نے سینہ مبارک سے لگالیا مگر چہرۂ اقدس میری جانب سے موڑ کر دوسری طرف کر لیا۔ میں ڈر گیا اور بڑی عاجزی سے عرض کیا...... حضور! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں' کیا قصور مجھ سے ہوا؟ فرمایا...... "قصور تو کچھ نہیں ہوا صرف تمہارے منہ سے تمباکو کی بو آتی ہے"...... چنانچہ اسی روز سے ہم نے پان تمباکو سب چھوڑ دیا اور ان چیزوں سے نفرت ہو گئی۔

حضرت کو جاہ اور مال دونوں چیزوں سے نفرت تھی۔ فرماتے یہ دنیا فانی اور نکمی شے ہے اس کے لئے بہت سرگرداں ہونا اچھا نہیں۔ طبیعت میں سادگی اور تواضع اوجِ کمال پر تھی۔ اپنے رہنے کے حجرے میں معمولی بستر اور کھجور کی بنی ہوئی چٹائیاں بچھایا کرتے۔ کسی قسم کا تکلّف یا آرائش آپ کو پسند نہ تھا۔ اکثر باہر برآمدے میں تشریف رکھتے' کبھی کبھی حجرے کے اندر بھی چلے جایا کرتے۔ برآمدے پر چھپر تھا اور حجرہ کچا۔ ہر چند خدّام نے عرض کیا حضرت! اسے پختہ بنوا دیں' آپ نے منظور نہ فرمایا۔ مزاج میں ایثار و استغنا بہت تھا۔ عادت مبارک یہ تھی کہ جو شئے آپ کے لباس میں سے یا دوسرے سامان میں سے کسی نے پسند کی' فوراً عطا فرما دیا کرتے۔ کبھی تنہا کھانا نہ کھاتے۔ ہمیشہ اپنے ساتھ دوسروں کو شریک فرما لیا کرتے۔ کھانے کی مقدار بہت قلیل ہوتی۔ تین یا چار لقمے کھا کر پوچھتے...... ہم نے کس قدر کھانا کھایا۔ حاضرین کہتے آپ نے تین لقمے کھائے ہیں۔ فرماتے...... بس یہی کافی ہیں۔ بعض اوقات لنگر میں کھیر یا اس قسم کی کوئی چیز پکتی تو بیواؤں اور یتیموں کو ان کے گھر حصہ بھجواتے۔ اگر کوئی نہ ملتا' تو اس کا حصہ امانتاً رکھوا دیتے۔ حکم ہوتا جب وہ آئے' تو دے دینا۔ اگر خانقاہ کے کسی درویش پر آپ ناراض ہوتے اور اسے مکان سے نکلوا دیتے تب بھی اس کا کھانا لنگر سے موقوف نہ ہوتا۔ شہر میں جہاں وہ ہوتا' اس کا کھانا وہیں بھجواتے اور فرماتے...... فقیر خدا کی صفات سے موصوف ہوتا ہے۔ رزّاقیت کی یہی صفت ہے کہ گنہگاری اور سرکشی کے باوجود وہ رزّاق کسی کی روزی قطع نہیں فرماتا۔ ایسا ہی فقیر کو بھی ہونا چاہئے۔ آپ کے لنگر کا فیض دن رات چوبیس گھنٹے جاری رہتا۔ جب کوئی مسافر یا مہمان آیا' اسی وقت اسے کھانا کھلایا جاتا۔ ایام قحط سالی میں مخلوقِ خدا کثرت سے آتی اور کوئی شخص بھوکا نہ رہتا۔

آپ داد و دہش اور ایثار کے لئے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈا کرتے۔ ایک مرتبہ کوئی عالمِ دین

Marfat.com

آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کا شغل دن میں طلباء کو حدیثِ رسولؐ پڑھانا اور شب کو درود شریف پڑھنا تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے دیکھا مولانا کا کرتا پھٹا ہوا ہے۔ آپ نے فوراً اپنے خادمِ خاص سائیں مغلی شاہ کو حکم دیا کہ دو روپے مولانا کی خدمت میں ہدیہ کرو تاکہ یہ کرتا بنوالیں۔ سائیں جی نے حکم کی تعمیل کی۔ اسی وقت ایک شخص بیس گز کا تھان اور گیارہ روپے نقد حضرت کی خدمت میں بطور نذر لایا۔ آپ نے انہی مولانا کی طرف اشارہ کر کے فرمایا...... یہ بھی آپ لے لیجئے۔

حضرت یتیموں اور بیواؤں کی بہت خبر گیری رکھتے۔ انکی روٹی لنگر سے مقرر تھی اور دونوں وقت باقاعدگی سے ملتی۔ جب کوئی یتیم بچہ آپ کے سامنے آتا اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے اور ہر طرح اسے خوش کرنے کی کوشش کرتے۔ پردے دار بیواؤں کے وظیفے مقرر تھے۔ اگر کبھی کسی جگہ سے زکوٰۃ کی رقم مستحقین میں تقسیم کے لئے آتی' تو وہ سب کی سب مسکینوں' یتیموں اور بیواؤں میں بانٹ دیتے۔ اس میں سے اپنے خاص درویشوں کو بھی لینے کی اجازت نہ تھی۔ ایک دن میں جس قدر سامان یا نقد رقم لوگ بطور نذر پیش کرتے' آپ اسی دن صرف فرمادیتے اور اپنے پاس کچھ باقی نہ رکھتے۔ اس سبب سے ابتدا میں کئی کئی وقت کا فاقہ بھی ہوتا۔ یہ سلسلہ کئی کئی روز تک چلتا۔ جب آپ کا دوسرا نکاح ہوا' تو چھوٹی بیوی نے لنگر اور خانقاہ کا انتظام نہایت عمدہ فرمادیا' پھر کبھی فاقہ نہ ہوا۔ آپ کے مجاہدے کا یہ حال تھا کہ کوئی لمحہ اور کوئی ساعت ایسی نہ تھی جو یادِ الٰہی سے خالی ہو۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ذکر یا درود شریف زبانِ فیض ترجمان سے جاری رہتا۔ ایک روز ارشاد فرمایا...... مومن اس وقت پختہ ہوتا ہے جب اپنے عیوب خود دیکھے اور خود اس پر سزا مقرر کرے اور ان کے نکالنے کے در پے رہے تب وہ پکا مومن ہے اور اپنے نفس کا پورا حاکم۔ پھر ہر طرح سے امن میں رہتا ہے۔ جوں جوں ان عیوب کو نکالتا رہے گا' برابر امن بڑھتا چلا جائے گا۔ اسی وقت ایک عورت چھاج کے ساتھ اناج پھٹکنے لگی۔ آپ نے دیکھا اور فرمایا...... چھلنی کی نسبت یہ چھاج بڑی اچھی چیز ہے۔ چھاج اپنے میں سے خراب اور بری چیز کو نکالتا اور اچھی کو رکھتا ہے۔ چھلنی اچھی اور نفیس چیز کو اپنے میں سے نکال دیتی ہے اور بُری کو اپنے اندر رکھتی ہے۔ فقیر کو ایسا ہونا چاہئے جیسا یہ چھاج ہے۔

حضرت شاہ صاحب نماز پنجگانہ اور تہجد باقاعدگی سے ادا فرماتے اور نماز کا اتنا اشتیاق تھا کہ بار بار خدام سے دریافت فرماتے کہ وقت ہوا یا نہیں۔ نماز میں اس طرح عاجزی و انکساری سے کھڑے ہوتے جیسے بندہ اپنے رب کے سامنے کھڑا ہوتا ہے۔ حضرت کی نماز بعینہٖ متقدمین اولیاء اللہ کی نماز کا نمونہ تھی۔ آپ بچپن ہی سے نماز کے عاشق تھے۔ ایک دفعہ آپ کے وطن یا آس پاس کے کسی اور گاؤں کا ایک معزز زمیندار ازنابالے آیا۔ وہ خاصا معمر آدمی تھا۔ کہنے لگا...... جب حضرت توکل شاہ صاحب کم سن تھے تو میں نے آپ کو دیکھا کہ مسجد میں یا اور جگہ جہاں اچھے آدمی جمع ہوتے یا ذکر الٰہی جس مقام پر ہوتا وہاں بڑے شوق سے بیٹھا کرتے اور نماز کے وقت نماز پڑھا کرتے' جو نہ پڑھتا اس سے فرماتے کہ نماز نہ چھوڑا کرو۔ یہ بڑی اچھی نعمت ہے۔ تمام لوگوں کو آپ کی باتیں پیاری لگتی تھیں اور فرطِ محبت سے ہم آپ

Marfat.com

کو گود میں اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے۔ میں نے سات برس کی عمر میں آپ کو نماز پڑھتے دیکھا ہے کبھی کسی وقت کی قضا نہ ہونے دیتے تھے۔

ایک روز ارشاد فرمایا..... "اور تمام عبادتیں کسی قصور کے سبب رد ہو سکتی ہیں، مگر درود شریف ایسی عبادت ہے کہ کسی حالت میں بھی رد نہیں ہو سکتا۔ درود شریف کا بڑا عمدہ خاصہ یہ ہے کہ اس کا ورد رکھنے والے پر کوئی فتنہ اور ابتلا نہیں آتا۔ حفاظتِ الٰہی شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ اگر کسی کو مرشد کامل نہ ملے یا کسی پر اس کا عقیدہ نہ ٹھہرتا ہو، تو اس کو چاہئے کہ درود شریف محبت کے ساتھ پڑھے۔ اس کے پڑھنے سے اسے پرورش، روحِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو جائے گی اور جس بزرگ سے اسے فیض دلانا منظور ہو گا، اس کی طرف خود بخود اس کی طبیعت متوجہ ہو جائے گی۔ اگر کسی بزرگ سے فیض نہ دلانا ہو گا، تو خاص روحِ پاک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت حاصل ہو جائے گی۔ پھر کچھ رک کر فرمایا..... ہم کو بھی درود شریف کی برکت سے روحِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پرورش ہے۔ اوّل اوّل جب ہم نے درود شریف بہت پڑھا تو ہم کو ایک صورت دکھائی دینے لگی جس کا نہایت موزوں سرخ و سفید چہرہ، آنکھیں بے حد حسین اور ان میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے عمامے میں ایک شملہ پیشانی پر تھا۔ وہ صورت ہر وقت ہمارے ساتھ رہنے لگی۔ جاگتے بھی، سوتے بھی ہم حیران تھے کہ یہ کون ہیں؟ کبھی کسی سے ذکر نہ کیا کہ یہ حالت ہے اور اثر اس کا یہ تھا کہ طبیعت میں ہمیشہ جوش و خروش اور سوز و درد رہتا۔ پھر کچھ عرصے بعد دو صورتیں ہو گئیں۔ دوسری صورت کے عمامے میں دو شملے نظر آئے۔ ایک پیشانی پر دوسرا بائیں جانب۔ مدت تک یہ دونوں صورتیں نظر آتی رہیں۔ پھر ہمیں معلوم ہوا کہ وہ پہلی صورت حضرت غوث الاعظمؒ کی تھی اور دوسری حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ پھر وہ صورتیں گم ہو گئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بالمشافہ ہونے لگی۔ مدینہ شریف سے جلدی جلدی فیض آنے لگا، بڑی موج ہو گئی۔"

ایک روز حضرت وضو فرما رہے تھے اور آپ کی ہمیشہ سے عادت تھی کہ وضو کرتے ہوئے کبھی کسی سے کلام نہ فرماتے۔ دو تین مولوی صاحبان وہاں موجود تھے اور ان میں تصوّف پر بحث ہو رہی تھی۔ کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ۔ اس دوران میں حضرت شاہ صاحب وضو سے فارغ ہوئے۔ مولوی صاحبان نے عرض کیا..... "حضرت! فرمائیں تصوّف کے کیا معنی ہیں"؟ آپ نے کہا.....

"شب و روز اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ گزر جائیں، تو سمجھو کہ فقیر پورا ہو گیا ورنہ اس سے پہلے تو کوئی بات اور کوئی کرامت قابلِ اعتبار نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ خدا کی رضا ڈھونڈے اس کی رضا کے خلاف قدم نہ رکھے اور اپنی روح کے گرد ان پانچ اشیاء سے مکان بنا لے۔"

1۔ اپنی مقدور روزی پر خوش رہے، زیادہ کی خواہش دل سے نکال دے۔

2۔ موت کو سمجھ لے کہ ضرور آنے والی ہے، ہرگز نہ چھوڑے گی۔

Marfat.com

3- یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر ایک حق ہے یعنی اس کی یاد کرنا۔ یہ حق میں دوسرے سے ادا کرا کے چھوٹ نہیں سکتا، نہ کوئی نوکر اس حق کو ادا کرنے کے واسطے رکھ سکتا ہوں۔ یہ حق خاص مجھ پر ہے اور میں ہی اسے ادا کروں تو ادا ہو سکتا ہے' دوسرا میرے عوض کوئی نہیں کر سکتا۔

4- یہ کہ اللہ مجھے ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ میرا کوئی فعل اس سے پوشیدہ نہیں۔

5- یہ سمجھ لے کہ میرا ہر سانس گھٹ رہا ہے۔ ہر وقت اس میں کمی ہو رہی ہے۔ کوئی صورت اس کے بچاؤ کی نہیں۔

حضرت کے ہاں کشف و کرامات کی کمی نہ تھی لیکن آپ ہر ممکن کوشش ان کو چھپانے کی کرتے تھے۔ فرمایا...... "کشف و کرامات فقیری کی علامت ہر گز نہیں۔ اس قسم کی باتیں تو ہر نوع کے لوگوں سے سرزد ہو جاتی ہیں اس لئے ان پر زیادہ زور نہ دینا چاہئے"۔ حضرت کے خلیفۂ اعظم مولانا محبوب عالم نے چند بالتواتر واقعات اپنے تذکرے میں قلم بند فرمائے ہیں۔

ایک روز حضرت' شاہ عبدالرسول صاحب کی مسجد میں مراقب تھے۔ کئی درویش بھی آپ کے ساتھ مراقبے میں تھے۔ اس اثناء میں جبکہ آپ گردن جھکائے ہوئے تھے۔ آپ کے سامنے سینے کے برابر مٹھائی کا ایک بھرا ہوا تھال آیا۔ لانے والا نظر نہ آتا تھا۔ آپ نے ہوں ہوں کر کے زور سے ہاتھ کا اشارہ فرمایا جس سے تھال دور جا پڑا' مٹھائی گر گئی۔ مراقبے سے فراغت پانے کے بعد فرمایا...... "یہ مٹھائی کھالو" سب نے اکٹھی کر کے کھالی۔ پھر فرمایا...... "وہ مٹھائی لانے والا کہاں گیا؟" درویشوں نے عرض کیا حضرت! یہاں تو صرف تھال ہی تھال دکھائی دیتا ہے' لانے والے کو تو کسی نے نہیں دیکھا۔ فرمایا...... "ہم پھر دریافت کر لیں گے"۔

کئی روز بعد آپ اس باغ میں تشریف لے گئے جو اس سڑک کے مغربی رخ پر ہے' جہاں آپ کے روضۂ مبارک سے مغرب کی جانب شہر سے آکر شمال کی طرف گئی ہے۔ وہاں ایک کچا مکان تھا' آپ اس میں بیٹھ گئے۔ درویش بھی ساتھ تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک ضعیف العمر بڑھیا' رومی ریوڑیاں برتن میں لئے حاضر ہوئی اور کہنے لگی...... حضور! میں ابھی ابھی روم سے یہ ریوڑیاں لے کر حاضر ہوئی ہوں اور اپنی مزدوری کی حلال کمائی سے خرید کر لائی ہوں' پھر اس نے بیعت کے لئے درخواست کی۔ حضرت کا معمول تھا عورتوں کو پردے میں بٹھا کر بیعت فرمایا کرتے تھے' لیکن اس مرتبہ آپ نے بلا تکلف اس کا ہاتھ پکڑ کر بیعت کیا۔ حلقے میں سے ایک درویش کو خیال آیا کہ آپ نے خلافِ معمول ایک نامحرم عورت کا ہاتھ کیوں پکڑا۔ آپ نے اس کے خطرے پر مطلع ہو کر فرمایا......

"بندے اللہ دے' یہ عورت نہیں' جن ہے"۔ پھر فرمایا...... "خوب یاد آیا۔ وہ ایک مرتبہ مٹھائی کا تھال لے کر ہمارے پاس تو ہی آیا تھا؟"

اس نے عرض کیا...... "ہاں حضور' میں ہی آیا تھا۔ آپ نے غصے سے ہاتھ کا جھٹکا بھی دیا تھا"۔

Marfat.com

فرمایا...... "ہاں، ہم اس وقت ایسی ہی حالت میں تھے۔ ایسی حالت میں ہم سے باتیں نہ کیا کرو۔ اس نے وعدہ کیا آئندہ ایسا نہ ہو گا" پھر کہا...... "اگر حضور کو یہ مکان پسند ہو، تو میں اسے چھوڑ دوں؟ آپ یہیں تشریف رکھیں"۔ فرمایا...... "نہیں، تو یہیں رہا کر اللہ الصمد خوب پڑھا کر"۔ وہ اسی وقت غائب ہو گیا۔ ہر چند اِدھر اُدھر خوب دیکھا بھالا، پھر نظر نہ آیا۔ آپ نے فرمایا...... "یہ جن بہت نیک بخت اور پرہیز گار ہے۔ اپنے ہاتھ سے مزدوری کر کے کھاتا ہے"۔

ایک روز حضرت انبالہ چھاؤنی تشریف لے گئے۔ وہاں ایک رسالدار تھا جس کی لڑکی کو جن اکثر ستاتا۔ اس نے سینکڑوں علاج معالجے اور گنڈے تعویز کروائے مگر اس جن نے لڑکی کو ستانا نہ چھوڑا۔ آخر رسالدار حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور رو رو کر سارا قصہ سنایا۔ آپ نے کہا...... "بندے اللہ دے، میں عامل نہیں، عالم فاضل نہیں، تعویز گنڈے مجھے نہیں آتے۔ بتائیں کیا کر سکتا ہوں"؟ اس نے عرض کیا...... "حضرت! آپ صحیح فرماتے ہیں، میں چاہتا ہوں آپ دعا فرمائیں۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کی دعا سے میری لڑکی کو نجات دے"۔ یہ سن کر ارشاد ہوا...... "بہت اچھا، مریضہ کو سامنے لاؤ"۔ وہ لڑکی کو چارپائی سمیت اٹھا لایا۔ چادر لڑکی کے اوپر پڑی ہوئی تھی۔ آپ نے بلند آواز سے فرمایا......

"جا اوئے چلا جا۔ کسی کو تکلیف نہیں دینی چاہئے" ۔ اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ آپ نے تسبیح پڑھنا شروع کی۔

"اللہ الصمد، اللہ الصمد، اللہ الصمد" ...... ابھی ایک تسبیح پوری ہونے نہ پائی تھی کہ وہ جنّ چلاّ اٹھا...... حضور اب نہ پڑھیں میرے بدن میں آگ لگ گئی...... میرے پر جل گئے...... مجھے سخت تکلیف ہے...... اب ہر گز میں کسی کو نہ ستاؤں گا۔

آپ نے غصے سے فرمایا...... "تجھے معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں نامحرم عورتوں کو دیکھنا حرام ہے"؟ جنّ نے بڑی منت و عاجزی سے توبہ کی، چنانچہ آپ نے اسے معاف کر دیا۔ اس کے بعد لڑکی کو ہوش آ گیا اور کبھی اس کی حالت خراب نہ ہوئی۔

مولانا محبوب عالم کی روایت ہے کہ ایک دفعہ میں عشاء کی نماز کے بعد مراقبے میں بیٹھا تھا اور حضرت توکّل شاہ بھی حلقے میں تشریف رکھتے تھے اور حسبِ مراتب سب کو توجہ دے رہے تھے۔ میں نے بالمشافہ دیکھا کہ میرے دائیں ہاتھ دو آدمی بیٹھے ہیں جن کا جسم اور شکل و شباہت آدمیوں کی سی لیکن سروں پر دو دو سینگ ہیں۔ بعد فراغت میں نے عرض کیا...... "حضور، آج میں نے ایسے ایسے آدمی دیکھے"۔ فرمایا...... 'ہاں، وہ جن تھے اور بیعت کے لئے آئے تھے انہیں تعلیم و تلقین کر دی ہے۔"

اسی طرح ایک اور واقعہ پیش آیا۔ حضرت کے زمانۂ حیات میں میری عادت تھی کہ عصر کی نماز کے بعد باہر سے آئے ہوئے استفسارات کے جواب لکھتا اور فتووں وغیرہ پر مہر لگا کر روانہ کر دیتا۔ ایک روز دو آدمی دو فتوے لے کر میرے پاس آئے اور کہا ہم حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے،

Marfat.com

انہوں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ فتوؤں پر دو روپے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے فتوؤں پر مہر لگائی۔ ابھی مہر اچھی طرح اٹھانے بھی نہ پایا تھا کہ وہ دونوں آدمی بھی غائب اور فتوے بھی ندارد...... مجھے سخت تعجب اور کسی قدر خوف محسوس ہوا۔ میں نے جا کر حضرت کی خدمت میں عرض کیا' فرمایا...... "ہاں' وہ کشمیر کی طرف کے رہنے والے جن تھے اور ہم ہی نے انہیں تمہارے پاس بھیجا تھا۔"

ایک روز ابدالوں کا ذکر آیا۔ لوگوں نے کہا ہم نے سنا ہے ابدال فضا میں اڑا کرتے ہیں۔ جب ان کے پر نہیں' تو وہ اڑتے کیسے ہیں؟ حضرت نے فرمایا...... ہاں ہم نے بھی دیکھا ہے۔ ایک دفعہ دہرہ دون کے پہاڑ سے ابدال ہمارے پاس آیا۔ وہ ہوا میں ہاتھ ہلاتا ہوا اڑتا چلا آتا تھا جس طرح لوگ دریا میں تیرا کرتے ہیں۔ ابدالوں کا اڑنا سچ ہے اور بعض کو اللہ تعالیٰ نے طے الارض عطا کر دیا ہے۔ ایک روز حضرت حجرے میں تھے۔ یکایک باہر نکلے۔ دیکھا ایک ہندو ہے' جیسے ہندو کانور اٹھائے ہوئے گنگا جل لے کر وطن جاتے ہیں' اسی طرح کانور مونڈھے پر رکھے ہوئے تھا۔ حضرت اپنے مکان سے بیس قدم کے فاصلے پر جا کر اس سے ملے اور سلام علیک کی۔ اس نے جواب میں وعلیکم السلام کہا اور مصافحہ کیا۔ کچھ دیر تک دونوں ہم راز و نیاز کرتے رہے' پھر حضرت نے فرمایا...... چلو مکان پر چلیں۔ اس نے کہا...... مجھے جلدی جانا ہے۔ رخصت ہی دے دیں۔ آپ اسے رخصت کر کے تشریف لائے۔ لوگوں نے عرض کیا...... حضور! بظاہر تو یہ ہندو دکھائی دیتے تھے۔ پھر یہ اسلام علیک کی کیا وجہ تھی؟ فرمایا...... یہ ہندو نہیں' ابدال تھے۔ ملاقات کے لئے آئے تھے۔ کسی نے عرض کیا حضرت! پر آپ کے باہر تشریف لے جانے کی کیا وجہ تھی؟ فرمایا...... اگر ہم نہ جاتے' تو حجرہ ہل کر آپ چلا جاتا۔ لوگوں سے چھپنے کی وجہ سے انہوں نے یہ وضع اختیار کر رکھی تھی۔ یہ سنتے ہی سب خدام اور درویش ان ابدال کی ملاقات کے لئے دوڑ پڑے۔ حضرت نے ہنس کر فرمایا...... بندے اللہ دے' وہ اب نہ ملیں گے۔ یہاں سے ان کا ایک قدم سرہند شریف پڑا ہے۔ وہاں سے بیت اللہ شریف جائیں گے۔ یہی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ طے الارض عطا کرتا ہے۔ یہ لوگ ذرا سی دیر میں ہزاروں میل چلے جاتے ہیں۔

حضرت کے مکاشفات ہر آن جاری رہتے اور دیکھنے والے دیکھتے۔ ایک مرتبہ کوئی مسافر آپ کے پاس آیا۔ آپ نے اسے روٹی کھلائی اور فرمایا...... اسے جلد رخصت کر دو۔ سفر خرچ کے لئے اسے کچھ رقم بھی دی' چنانچہ وہ چلا گیا۔ ایک درویش نے عرض کیا...... حضرت! یہ تو مسافر تھا' خلافِ دستور اسے اتنی جلد کیوں رخصت کر دیا؟ فرمایا...... بندے اللہ دے' ہم نے دیکھا اس کی روح کا دایاں ہاتھ کہنی سے کٹا ہوا ہے۔ معلوم ہوا وہ شخص کہیں سے چوری کر کے آیا ہے۔ اس کا رخصت کر دینا ہی ٹھیک تھا۔ آخر کار وہ شخص انبالے سے بمبئی پہنچا۔ دو تین روز بعد چند آدمی اسے تلاش کرتے ہوئے آئے کہ حضرت یہاں اس حلیئے کا ایک شخص چوری کر کے آیا تھا' پھر وہ بمبئی میں پکڑا گیا۔

ایک دفعہ خانقاہ میں درویش جمع تھے۔ مہر علی شاہ بھی موجود تھا۔ حضرت نے ایک دم فرمایا...... مہر

Marfat.com

علی شاہ! تو بھی اپنے گھر چلا جا۔ مہر علی شاہ رونے لگا کہ خدا جانے کیا خطا ہوئی۔ آپ نے فرمایا...... تجھ سے خطا کچھ نہیں ہوئی جاؤ اپنے گھر چلے جاؤ اور بال بچوں میں رہو' وہیں خیر ہو جائے گی۔ یاد رکھنا سات دن سے پہلے یہاں نہ آنا۔ اگر جی چاہے' تو سات دن بعد آجانا...... چنانچہ مہر علی شاہ اپنے گھر گیا۔ وہاں پہنچ کر چوتھے روز بخار ہوا۔ ساتویں روز مر گیا۔ گھر بھیجنے کا مقصود یہ تھا کہ اپنے بال بچوں سے مل کر کوئی نصیحت یا وصیّت کر لے۔

حضرت نے ایک روز ارشاد فرمایا...... ہم ایک مرتبہ حضرت مخدوم علی احمد صابر کلیری رحمتہ اللہ علیہ کے روضہ شریف پر جا کر مراقب ہوئے۔ آپ کی زیارت ہوئی' بڑی خوشی اور محبت سے ملے۔ پھر ایک مُہر والی انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی۔ یہ آپ کے فیضان کی نشانی تھی۔ ہم بعد ازاں حضرت صابر صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی علیہ الرحمتہ کے مزار شریف پر گئے' وہاں کوئی آدمی نہیں رہتا تھا۔ لوگوں نے ہم کو بھی منع کیا اور کہا آپ یہاں نہ ٹھہریں یہاں کوئی رہنے نہیں پاتا۔ ہم نے کسی کی نہ سنی۔ مراقب ہو کر بیٹھ گئے اور فیض کھینچنے لگے۔ خواجہ صاحبؒ کی زیارت ہوئی۔ دیکھا کہ آپ اس طرح ذکر کرتے ہیں اللہ' اللہ' اللہ۔ خواجہ صاحب کے ساتھ ہی جس قدر روحیں آپ کے مریدوں کی موجود تھیں وہ سب کی سب ذکر کرنے لگیں اور ہماری طرف اشارہ کر کے کہنے لگیں...... اس شخص نے آکر خواجہ صاحب کو چھیڑ دیا اور آپ کا جوش بھڑکا دیا۔ مجھے فیضان کی کثرت سے اس قدر طپش اور جوش ہوا کہ میرا سینہ تپ گیا۔ پھر میں نے مدینہ شریف کی طرف توجہ کر کے روحِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض لینا شروع کیا۔ تب بڑی دیر میں وہ طپش کم ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں خواجہ شمس الدین ترک رحمتہ اللہ ننگی تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے قبر سے باہر نکلے۔ میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا...... ہم آپ سے بہت خوش ہیں۔ جب تک آپ یہاں رہیں' مختار ہیں۔ غیر آدمی کو ہم اپنے پاس رہنے نہیں دیتے۔ اس لئے لوگ آپ کو ڈراتے اور روکتے تھے۔ تم جیسے لوگوں سے مل کر تو ہم خوش ہوتے ہیں۔ امیر اللہ شاہ ہمارے ساتھ تھے' وہ تلوار کی چمک دیکھ کر ڈر گئے۔ ہم نے انہیں سمجھایا یہ حضرت خواجہؒ کے فیضان کی شکل ہے۔

حضرت کی کرامتوں کا کیا ٹھکانا! آپ کا ہر فعل گویا اپنی جگہ ایک کرامت ہے۔ آپ کے خلیفۂ اعظم مولانا محبوب عالم نے چشم دید کرامات کا ایک مستقل باب آپ کے تذکرے میں باندھا ہے۔ اس میں سے چند واقعات درج کئے جاتے ہیں۔

"ایک روز میں حدیث شریف پڑھا رہا تھا۔ شاید ترمذی تھی یا کوئی اور کتاب۔ ذکر تھا کہ جب بہشتی میوے کھانے کا ارادہ کریں گے' تو درخت خود بخود ان کے سامنے آکر جھک جایا کریں گے۔ ایک درویش نے حدیث سنی' تو حیران ہو کر بولا...... حضور! یہ تو عجیب بات ہے۔ فرمایا...... ہاں' لیکن اس میں شک اور شبہے کی گنجائش نہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔ حضرت کے حجرے کے دروازے پر توت کا ایک پھل دار

Marfat.com

درخت تھا۔ آپ نے اس درخت کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا...... مثلاً جس طرح یہ درخت کھڑا ہے۔ اگر اسے کہیں آجا' تو فوراً سامنے آکر جھک جائے گا۔ جونہی آپ کی زبان فیض ترجمان سے یہ الفاظ نکلے' میں نے دیکھا کہ وہ درخت جھکا اور اس کی شاخیں مجھ پر سے ہوتی ہوئی حضور کے عین سامنے زمین سے آلگیں۔ آپ نے ہنس کر فرمایا...... ارے' ہم نے تجھ سے تو نہیں کہا تھا' ہم نے تو صرف بہشت کا ایک مسئلہ بیان کیا تھا' تو سمجھا کہ مجھی کو کہا ہے۔ جا تو اپنی جگہ کھڑا ہو۔ فوراً وہ درخت اپنی جگہ پہنچ گیا۔ سائل نے پوچھا...... حضرت! کس کلام کے پڑھنے سے یہ چیزیں تابع ہو جاتی ہیں۔ آپ نے فرمایا...... یہ وہ تجلّی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وارد ہوئی تھی اور جس کی وجہ سے تمام حجر شجر آپ کے سامنے جھک پڑے تھے۔ یہ حقیقتِ محمدیہ کے فیضان کا اثر ہے اور جو شخص کثرت سے درود شریف پڑھے' خوشنودی اور پرورشِ روحِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شروع ہو جاتی ہے۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا...... حضرت کرامت کے کیا معنی ہیں؟ فرمایا...... بندے اللہ دے' کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور بندہ بیچ میں صرف وسیلہ ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ سے جو کوئی کرامت ظہور میں آتی ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور ارادے سے ظہور میں آتی ہے۔ اولیاء جب تک ارادۂ الٰہی معلوم نہیں کر لیتے' تب تک اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور چونکہ اولیاء اللہ کا ذکر کرتے اور اس کی رضا میں ساعی رہتے ہیں' اس لئے اللہ تعالیٰ ان سے کرامت ظاہر کرا کے مخلوق کی ہدایت کا سبب بنا دیتا ہے' تاکہ لوگوں کو اس سے محبت ہو' اس بندے سے ہدایت جاری ہو اور لوگوں کے لئے بخشش کی صورت نکل آئے۔

"ایک مرتبہ گل شیر خاں نامی ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس کے پاس تین روپے جیب میں تھے۔ سوچا کہ دو روپے تو کرائے وغیرہ کے لئے رکھ لئے جائیں اور ایک روپیہ حضرت کی نذر کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ایک روپیہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا...... بندے اللہ دے' رہنے دے کرائے وغیرہ میں کام آجائے گا۔ اس نے بہت اصرار کیا۔ آخر آپ نے روپیہ لے کر رکھ لیا۔ جب وہ رخصت ہو کر اسٹیشن پر پہنچا اور ٹکٹ خریدنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا' تو تینوں روپے موجود تھے"۔

"ایک دفعہ حضرت ڈیرہ بسی سے پرے رائپور کے قریب کسی گاؤں میں جب جذب و مستی کے عالم میں تھے۔ یہ آپ کا عام حکم تھا کہ کوئی شئے کھانے پینے کی ہمارے پاس کھلی نہ لایا کرو۔ ایک شخص کھلا پانی لے کر چلا آیا۔ آپ کی زبان مبارک سے نکلا...... تو اندھا ہے؟؟ جانتا نہیں کھلا پانی لانا بُری بات ہے۔ یہ کلمہ منہ سے نکلنا تھا کہ فی الفور وہ شخص اندھا ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت کو ہمیشہ اس کا خیال رہا کہ اگر کسی خادم سے آپ کی خلافِ طبع کوئی کام ہو جاتا' تو یہ فرماتے...... بے خبر ہیں۔ بات نہیں سمجھتے۔ اس کے علاوہ کوئی اور کلمہ نہ کہتے۔ ہر وقت زبان کی بہت احتیاط رکھتے کہ کوئی کلمہ نقصان دہ نہ نکلے۔ آپ کی سیف زبانی کا یہی حال تھا کہ ادھر زبان مبارک سے کچھ نکلا' ادھر پورا ہو گیا"۔

"ایک روز نابھہ یا پٹیالہ ریاست کا ایک سکھ آیا۔ بے قراری و گریہ زاری میں مصروف۔ حضرت

Marfat.com

نے پوچھا...... کیوں روتا ہے؟ کہا...... حضور! میری تمام زمین کے اندر نہر گزر گئی اور اس کا مجھے کچھ معاوضہ نہیں دیا گیا۔ میں عیال دار اور غریب ہوں۔ اب میرا کہیں ٹھکانا نہیں۔ نہایت عاجز و مجبور ہو کر بے وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں' کیونکہ نہر کی کھدائی شروع ہو گئی۔ حضرت نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ الٰہی' اگرچہ یہ سکھ ہے اور بے دین ہے' مگر مجھے تیرا سمجھ کر میرے پاس آیا ہے۔ اب تو جان...... تھوڑی دیر مراقبے کے بعد فرمایا...... بندے اللہ دے' جا بہتر ہو گا۔ وہ خوش خوش چلا گیا۔ کچھ عرصے بعد پھر آیا اور عرض کی...... حضور! حکامِ نہر کا ارادہ بدل گیا۔ مجھے درخواست بھی نہ دینی پڑی۔ نہر انہوں نے خود بخود وہاں سے ہٹا کر دوسری طرف کھود دی۔ یہ سب حضور کی دعا کی برکت ہے۔ آج تک وہ نہر اسی طرف کو جاری ہے۔

وفات سے کچھ عرصے پہلے کا ذکر ہے آپ نے مولانا محبوب عالم سے فرمایا...... آج ہم نے دیکھا ایک بہت بڑی بلا ہمارے حجرے کے دروازے کے سامنے کھڑی ہے اور وہ بلا اس قدر بڑی ہے کہ صرف اس کا منہ ہی ہمارے حجرے کے برابر ہے۔ ہمیں خیال ہوا کوئی جنّ ہو گا' کیونکہ جنّ بھی ایسی ایسی ہیبت ناک شکلوں میں سامنے آجایا کرتے ہیں۔ آخر کار وہ ہم سے بولی۔ ہم نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا...... میں موت ہوں۔ ہم نے کہا تو ویسے ہی آئی ہے یا اللہ تعالیٰ کے حکم سے؟ اس نے کہا...... میں اللہ کے حکم سے آئی ہوں۔ ہم نے کہا...... "اگر تو پروردگار کے حکم سے آئی ہے' تو ہمیں کیا عذر؟" ۔

یہ سن کر حضرت کے خدّام رونے لگے۔ آپ نے بڑی تسلی اور اطمینان سے فرمایا...... گھبراتے کیوں ہو؟ آخر موت کو تو ایک روز آنا ہی ہے۔ البتہ ہماری وصیّت یہ ہے کہ شریعت کے موافق ہمیں غسل دینا اور ہماری تجہیز و تکفین بھی بالکل شریعت کے مطابق کرنا۔ چند روز بعد حضرت کو اسہال شروع ہو گئے۔ آپ اکثر حالتِ صحت میں دعا فرمایا کرتے' خداوندا! مجھے شہادت کی موت عطا فرما۔ یہ اسی دعا کی برکت کہ حضرت کو اسہال شروع ہوئے' کیونکہ اسہال کے ذریعے جو موت ہوا سے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں شہادت کی موت کہا گیا ہے۔ اس وقت بھی حضرت کی حالت یہ تھی کہ نماز پنجگانہ با جماعت ادا فرماتے تھے اور تمام اذکار' اشغال اور مراقبات اسی طرح پورے کرتے تھے جیسے کہ صحت کی حالت میں۔ آپ کے جس قدر معمولات تھے' ان میں ایک بھی کم نہ ہوا تھا۔ علاج معالجہ ہوتا رہا۔ آپ دوا پیتے وقت اکثر فرماتے...... ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سمجھ کر دوا کھاتے پیتے ہیں ورنہ ہمیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر دوا کچھ نہیں کر سکتی۔ لوگوں کے ساتھ حسبِ عادت کشادہ پیشانی اور فراخدلی سے ملاقات فرماتے۔ کسی قسم کے رنج' افسوس یا گھبراہٹ کے آثار آپ میں بالکل نہ پائے جاتے تھے۔

حضرت کی علالت کی خبریں چاروں طرف پھیلیں' تو زیارت و عیادت کے لئے لوگوں کا ہجوم ہوا۔ آخری ایام میں باربار فرماتے...... اب ہمارا یہاں رہنے کو دل نہیں چاہتا' یہاں بڑے جھگڑے فساد ہیں۔

Marfat.com

4 ربیع الاوّل 1315 ہجری کو چہار شنبہ کا دن تھا۔ آپ نے فجر کی نماز با جماعت ادا کی، مگر چار پائی پر لیٹے ہوئے اشاروں کے ساتھ۔ اس کے بعد زمین پر ایک چٹائی بچھوائی اور اس پر لیٹ رہے۔ سنت کے مطابق سر آپ کا شمال کی طرف اور پاؤں جنوب کی طرف تھے۔ حضور کے تقریباً سبھی قریبی خدّام اور مرید حاضر تھے۔ دس بجے کے قریب آپ پر جوش و خروش اور طپش و عشق کی حالت طاری ہوئی۔ کبھی اٹھتے، کبھی لیٹتے اور بار بار پانی پیتے۔ سائیں مغلی شاہ آپ کا سر آگے سینے کی طرف سے پکڑے ہوئے تھے اور مولانا محبوب عالم پیچھے کمر کی جانب سے آپ کو سنبھالے ہوئے تھے۔ آپ نے اشارے سے بتایا کہ صاف کپڑے پہناؤ۔ چنانچہ پہنا دیئے گئے۔ پھر تیمم کے لئے اشارہ فرمایا۔ اس حکم کی بھی تعمیل ہوئی۔ پوچھا...... کیا نماز کا وقت ہے؟ عرض کیا گیا کہ حضرت، نماز کا وقت تو نہیں۔ معاً آپ سلطان الاذ کار میں مشغول ہو گئے۔ ایک بار حبسِ دم کیا اور سانس لیا، پھر دوسری دفعہ حبس کر کے سانس لیا۔ تیسری دفعہ حبس کیا تھا کہ روح اس قفسِ عنصری سے نجات حاصل کر کے محبوبِ حقیقی کے ساتھ واصل ہو گئی۔ اِنّا للّٰہ وَاِنّا اِلیہ رَاجِعُوْن۔

حضرت کے جنازے میں ہزار ہا لوگ اشکبار شریک ہوئے۔ آپ کے خلیفہ مظفر علی خان صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ شہر کے ہندو بھی نماز میں ویسے ہی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ لوگوں نے پوچھا تم ہندو ہونے کے باوجود نماز میں کیوں شریک ہوئے۔ انہوں نے جواب دیا...... شاہ صاحب تو اوتار تھے۔ ان کی ہمیں محبت تھی اور وہی محبت کھینچ لائی ہے۔ حضرت کا آخری دیدار کے واسطے روئے مبارک کھولا گیا، تو آپ کا چہرہ یوں چمک رہا تھا جیسے زندہ آدمی کا ہوتا ہے۔ بشرے سے موت کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی تھی۔ دس بجے دن کو آپ کا وصال ہوا اور یہ وہ وقت تھا جب کوئی فرض نماز ادا نہیں کی جاتی۔ نماز فجر آپ با جماعت ادا کر چکے تھے۔ چنانچہ یہ آخری کرامت تھی کہ فرائض میں سے آپ کے ذمے کوئی فرض باقی نہ تھا۔ جس روز حضرت کا وصال ہوا اسی روز رات کو ایک بڑے کامل بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ ایک چوپہیہ گاڑی میں نہایت حسین و جمیل اور باشوکت و ہیبت صاحب سوار ہیں اور حضرت توکّل شاہؒ کو گود میں لئے بیٹھے ہیں۔ گاڑی چلی جا رہی ہے۔ ان بزرگ نے پوچھا...... یہ کون صاحب ہیں؟ کسی نے جواب دیا۔ سیّد المرسلین، خاتم النّبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کی گود میں یہ حضرت توکّل شاہ صاحب ہیں۔

اسی رات ایک بزرگ نے لدھیانہ میں خواب دیکھا کہ حضرت کی قبر مبارک جناب مجدّد الف ثانی سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے برابر میں بنی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت پر مجدّدی سلوک میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا تھا۔ حضرت مجدّد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے حالاتِ وفات کا مطالعہ کرنے سے یہ عجیب انکشاف ہوتا ہے کہ حضرت توکّل شاہؒ کی وفات بعینہٖ اسی طریق سے ظہور میں آئی جیسے حضرت مجدّد علیہ الرحمتہ کی واقع ہوئی تھی۔

Marfat.com

مولانا خلیل الرحمٰن مدنیؒ

آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کا ذکر ہے یوپی کے مشہور و معروف قصبے رڑکی میں ایک بزرگ تشریف لائے اور قصبے کی ایک چھوٹی سی کچی مسجد میں ٹھہر گئے۔ کشیدہ قامت، سرخ و سفید چہرہ اور چہرے پر برستے ہوئے انوار۔ سرتاپا سفید لباس میں ملبوس، سن کچھ زیادہ نہ تھا۔ جوانی کی منزلیں طے کر کے ادھیڑ عمری کی سرحد میں قدم رکھ رہے تھے۔ مختصر سی شرعی ڈاڑھی میں چند ہی بال چاندی ہوئے تھے۔ تاہم شانِ بزرگی ان کی چال ڈھال اور لب و لہجے سے آشکارا تھی۔ گفتگو میں متانت، بشرے سے شرافت اور قول و عمل سے صداقت کا اظہار ہوتا۔ ابتداء میں جب تشریف لائے تو قصبے والوں نے خاص توجہ نہ دی۔ یہی جانا مسافر ہیں مسجد میں چند روز ٹھہر کر چلے جائیں گے۔ مگر جب کئی دن گزر چکے اور مولانا کو لوگوں نے وہیں پایا تب ان کے حالات جاننے کی جستجو ہوئی۔ قصبے میں پڑھے لکھے افراد کی تعداد زیادہ نہ تھی تاہم مسلمانوں میں ذی علم موجود تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو برہمنوں کے کئی معزز خاندان بھی رڑکی میں آباد تھے۔ مولانا نے مسجد کو نئے سرے سے آباد کیا اور پھر دیکھتے دیکھتے طلبہ ان کے پاس جمع ہوئے۔ وہ کسی سے کچھ طلب نہ کرتے۔ بوجہ اللہ درس دیتے۔ لوگوں کو شرعی مسئلے سے آگاہ کرتے۔ خود ہی اذان دیتے اور پانچوں وقت کی امامت کرتے۔ دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ سخت متقی اور پرہیز گار ہیں خود اپنی ذاتی روٹی پکاتے اور صبر شکر سے کھالیتے، بلکہ مسجد میں آنے والے مسافروں کی تواضع بھی خندہ پیشانی سے فرماتے۔ قصبے کے بازار میں نکلتے تو ادنیٰ و اعلیٰ کو سلام کرنے میں پہل کرتے۔ بات چیت میں منہ سے پھول جھڑتے۔

Marfat.com

بہت جلد قصبے کا قصبہ گرویدہ ہو گیا۔ مسلمان تو خیر دیوانہ وار فدا تھے۔ ہندو برہمنوں کی نگاہوں میں بھی ان کا احترام کم نہ تھا اور اکثر ہندو گھرانوں کے بچے ان سے اردو اور فارسی کا درس لینے مسجد میں آنے لگے۔

مولانا کا ارادہ رڑکی میں قیام کا تو نہ تھا' محض سیاحت کے لئے ادھر آ نکلے تھے لیکن اس قصبے کا ماحول اور گردوپیش کی آب وہوا اس قدر پسندِ خاطر ہوئی کہ وہیں رہنے کا عزم کر لیا۔ وہاں سے ذرا دور حضرت مخدوم علی احمد صابر کلیری علیہ الرحمتہ کا مزار مبارک ہے۔ جہاں مسلمانوں کی ہمہ وقت حاضری ہوتی' دوسری جانب ہندوؤں کا مشہور تیرتھ ہردوار بھی قریب ہی تھا۔ رڑکی کو اس اعتبار سے بھی خصوصیت حاصل تھی کہ انگریز حکمرانوں نے خاصی بڑی چھاؤنی قصبے سے باہر بنائی تھی۔ پہاڑوں کے باعث قصبے کی فضا بے حد خوش گوار اور سرد تھی اور اس کا حسن اس نہر نے دوبالا کر دیا تھا جو پہاڑوں کے اندر سے نکلتی اور آبادی کے درمیان میں سے گزرتی تھی۔ اسے نہر گنگ کہتے تھے۔ قصبے کی اکثر عمارتیں پتھر کی بنی ہوئی تھیں اور جا بجا میلوں میں پھیلے ہوئے باغ تھے۔ صبح کے وقت نہر کی جانب جایئے تو صبح بنارس یاد آئے اور شام کا سماں بالکل ایسا ہی ہوتا جیسے شامِ اودھ کا نظارہ کر رہے ہوں۔ مولانا کا نامِ نامی اسمِ گرامی عبدالسمیع تھا اور بیدؔل تخلص کرتے تھے۔ شاعری میں مرزا غالب سے تلمّذ تھا اور اگرچہ شعر کہنے کا ذوق باقی نہ رہا تھا۔ تاہم مبدائے فیض کا کرم تھا کہ جب شعر کہنے کا ذوق غالب ہوتا تو نعت کہتے۔ یہ حالت اس وقت سے شروع ہوئی جب شیخ العرب و العجم حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے دست حق پرست پر بیعت کا شرف نصیب ہوا۔ بعد میں حاجی صاحب نے خلافت عطا فرمائی اور مجاز بیعت بھی ہوئے۔ اس کے بعد یک قلم مولانا کی ظاہری حالت تو بدلی ہی تھی۔ باطنی کیفیت بھی کچھ سے کچھ ہو گئی۔

مولانا کا آبائی قصبہ کرم پور مہنیاراں تھا۔ ان کے والد محمد یوسف اپنے دور کے کاملِ فن طبیب ہوئے ہیں۔ مولانا عبدالسمیع نے والد سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں اور جب علم کا شوق فزوں ہوا تو شہرِ علم دلی تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں بالکل نوجوان تھے ابھی مسیں بھی نہ بھیگی تھیں۔ والد نے حضرت صہبائی کے نام رقعہ لکھ دیا تھا۔ صہبائی کسی تعارف کے محتاج نہ تھے' دلی کا بچہ بچہ انہیں جانتا پہچانتا تھا۔ دلی کالج میں عربی' فارسی پڑھاتے تھے۔ ہزاروں شاگرد تھے' مشاہیرِ دلی سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات اُستوار تھے۔ حکیم مومن خان' ذوق اور مرزا غالب سے بے تکلفی تھی۔ انہوں نے عبدالسمیع کو اپنا فرزند سمجھ کر محبت اور شفقت سے پڑھایا پھر صدر الصدور مولانا مفتی صدرالدین آزردؔہ کے سپرد کر دیا۔ مفتی صاحب نے ہونہار شاگرد کو حدیث اور تفسیر پڑھائی۔ اسی زمانے میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی دلی میں تھے۔ چنانچہ چند اسباق عبدالسمیع نے ان سے بھی پڑھے اور تلمّذ کی نعمت حاصل کی۔ قیاس ہے کہ اسی دوران میں حضرت حاجی امداد اللہؒ کی نگہہِ شفقت بھی مولانا عبدالسمیع پر پڑی اور انہوں نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک مرتبہ حاجی صاحب کے ساتھ سفر میں تھے جب قصبہ جھنجھانہ ، ضلع مظفر نگر

Marfat.com

میں داخل ہوئے تو حاجیؒ صاحب پر معاً عجب کیفیت طاری ہوئی۔ ایک درخت کے نیچے ٹھہرے اور مولانا عبدالسمیع کی طرف دیکھ کر فرمایا: "جانتے ہو یہ درخت کیا ہے" مولانا عبدالسمیع مبہوت ہو کر حاجیؒ صاحب کا روئے انور دیکھتے رہے اور زبان سے کچھ نہ بولے۔ حاجیؒ صاحب نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: "یہ وہ درخت ہے جس کے سائے میں سراج السالکین ' زبدۃ العارفین حضرت میاں جی نور محمد صاحبؒ قدس سرہٗ نے ہمیں بیعت سے نوازا تھا: "پھر حاجی امداد اللہؒ نے وہی کُلاہِ مبارک اپنے سر سے اتار کر مولانا عبدالسمیع کے سر پر رکھ دی جو میاں نور محمد نے حاجیؒ صاحب کے سر پر رکھی تھی۔

1857ء کے ہنگامۂ دار و گیر میں مولانا عبدالسمیع بڑی مشکل سے جان بچا کر دلی سے نکلے اور مختلف شہروں اور قصبوں میں گھومتے رہے مگر کہیں امن چین نہ پایا۔ آخر قدرت کے نادیدہ ہاتھ نے راستہ دکھایا اور مولانا رڑکی میں آن کر ٹھہرے کبھی کبھی حضرت مخدوم علاؤالدین صابر کلیریؒ کے مزار پر حاضر ہوتے اور خاصی دیر تک مراقبے میں رہتے۔ ایک دن اسی عالم میں تھے کہ اپنے پیرو مرشد حضرت امداد اللہؒ کا سراپا دکھائی دیا۔ حاجیؒ صاحب اس زمانے میں ہندوستان سے ہجرت کر کے مکّہ معظمہ میں مستقل قیام کی نیت سے جا چکے تھے۔ مولانا عبدالسمیع نے دیکھا حاجیؒ صاحب کے ساتھ بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا بھی ہے۔ مولانا نے بصد ادب دریافت کیا حضرت! یہ بچہ کون ہے ؟ فرمایا: "ہمارا بیٹا ہے؟؟" اس جواب پر مولانا عبدالسمیع کو بڑی حیرت ہوئی "یہ آپ کیا فرماتے ہیں؟" حاجیؒ صاحب نے جواب دیا: "ہاں ' یہ ہمارا بیٹا ہے۔ عنقریب تم اس سے ملو گے؟ اس کا خیال رکھنا!"

اس مراقبے کے بعد بھی مولانا میں اس لڑکے کی صورت مدتوں قائم رہی۔ اکثر حیران ہو کر غور کیا کرتے کہ اس مراقبے میں حاجیؒ صاحب نے جو کچھ فرمایا۔ اس کا اصل مطلب کیا ہے ' لیکن کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ اس حیص بیص میں حاجیؒ صاحب کو خط بھی بھجوایا ' مگر کوئی جواب نہ ملا۔ خیال کیا کہ شاید حضرت تک خط نہ پہنچا ہو گا۔ تاہم روز بروز روح کی الجھن بڑھتی جاتی تھی۔ ایک روز مسجد میں بیٹھے طلبہ کو درس دے رہے تھے کہ ایک شخص مسجد کے دروازے کے قریب آیا۔ مولانا نے گردن اٹھا کر دیکھا آنے والا رڑکی کا نہایت دولت مند ہندو شخص تھا۔ مستری موتھی سنگھ کے نام سے قصبے کا کون ایسا فرد ہو گا جو واقف نہ تھا! مولانا بھی اسے اچھی طرح پہچانتے تھے۔ وہ اٹھ کر دروازے پر گئے اور اب پہلی بار ان کی نظر مستری موتھی سنگھ کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک بچے پر پڑی۔ مولانا نے اس کی صورت دیکھی اور مبہوت رہ گئے۔ یہ صورت تو انہوں نے کئی برس پہلے اپنے مراقبے میں دیکھی تھی۔ انہوں نے مستری موتھی سنگھ سے پوچھا کیونکر آنا ہوا اور یہ لڑکا کون ہے ؟ مستری نے ادب سے کہا یہ میرا لڑکا ناہر سنگھ ہے۔ اسے پڑھنے لکھنے کا شوق نہیں ہر وقت کھیل کود میں دھیان رہتا ہے۔ کئی پنڈتوں کے سپرد کر چکا ہوں کہ اسے آدمی بنائیں مگر سب اس کی شرارتوں سے نالاں ہو کر ہاتھ جوڑ گئے۔ اب مجبور ہو کر آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ اس پر نظر کیجئے۔ اردو اور فارسی پڑھا دیجئے۔ حسب مقدور نذرانہ پیش کروں گا۔

Marfat.com

مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ”فقیر کو نذرانہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں بچے کو چھوڑ جایئے' خدا نے چاہا تو آپ کو شکایت نہ ہوگی۔“

مستری موتھی سنگھ بچے کو چھوڑ گیا مولانا نے شفقت اور محبت سے اس کا ہاتھ پکڑا اور مسجد کے اندر لے گئے۔ ناہر سنگھ نے ابتداء میں رسیاں تڑانا چاہیں۔ مگر بہت جلد مولانا کے حسنِ سلوک اور محبت نے اسے رام کر لیا۔ ایسی شفقت اور ایسا پیار تو اسے اپنے گھر میں بھی نہ ملا تھا۔ چند روز کے اندر اندر اسے مولانا سے ایسا انس ہوا کہ گھر جانے کو تیار نہ ہوتا۔ مولانا کے سامنے پیر و مرشد حاجی امداد اللہؒ کا فرمان تھا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ اس اعتبار سے ہر وقت ناہر سنگھ کی تعلیم و تربیت کا ایسا خیال رکھتے جیسے انہی کی اولاد ہے۔ دیکھتے دیکھتے ناہر سنگھ نے فارسی کی ابتدائی کتابیں ختم کر لیں اور مولانا نے اسے قرآن مجید پڑھانا شروع کیا۔ تاہم اتنا ضرور سمجھایا کہ ابھی اپنے گھر والوں سے اس کا ذکر نہ کرنا۔ آہستہ آہستہ ناہر سنگھ کے ذہن میں ایک عجیب انقلاب برپا ہونے لگا۔ مولانا اسے سیرتِ رسولؐ اور اصحابِؓ رسول کے واقعات سنایا کرتے۔ خود بہت اچھے قاری تھے۔ جب طلبہ پڑھ کر رخصت ہو جاتے تو ناہر سنگھ کو سامنے بٹھا کر قرآن کی تلاوت کرتے یہاں تک کہ ایک روز ناہر سنگھ نے روتے ہوئے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور اسے کفر کی تاریکیوں سے نکال کر اسلام کے نور سے منور کرنے کی التجا کی۔ ناہر سنگھ جب مولانا کے حلقۂ تلمّذ میں داخل ہوا تھا تو اس کی عمر بارہ برس کی تھی۔ چھ سال کا عرصہ گزر گیا۔ اب وہ اٹھارہ برس کا نوجوان تھا اور مروجہ قانون کی رو سے قطعی بالغ اور عاقل چنانچہ مولانا نے اسے دائرۂ اسلام میں داخل کر لیا اور اس کا ہندوانہ نام بدل کر اسلامی نام خلیل الرحمٰن رکھا۔

ناہر سنگھ نے اپنے اسلام لانے کا واقعہ خود بھی قلم بند کیا' اسے ہم اسی کے الفاظ میں یہاں درج کرتے ہیں:

”ایک دن جب سبق ختم ہوا اور میں نے مولانا سے گھر جانے کی اجازت چاہی تو انہوں نے فرمایا: ”ناہر سنگھ: یہ تو بتاؤ خدا نے ہمیں کس لئے پیدا کیا ہے؟ میں نے جواب دیا اپنی عبادت کیلئے یہ سن کر مولانا متبسم ہوئے اور بولے: عبادت سے تمہاری کیا مراد ہے؟ میں نے عرض کیا حضرت! جو کچھ آپ نے تعلیم فرمایا ہے' اسی کی بنا پر کہتا ہوں کہ میں اپنے دھرم کا سختی سے پابند ہوں اور یہی ہمارے گھر کا دستور ہے۔ میرے والد دھرم کے معاملات میں بہت احتیاط کرتے ہیں اور کسی رُو رعایت کے قائل نہیں۔ میں بغیر نہائے کھانا نہیں کھاتا اور کھانا بھی ہمیشہ زمین لیپ پوت کر چوکے ہی پر کھاتا ہوں۔ دیوی دیوتاؤں کی پوجا بھی پابندی سے کرتا ہوں۔ ہمارے گھر میں بڑے پنڈت جی برابر آتے رہتے ہیں۔ سارا گھر انا انہیں گرو مانتا ہے' وہ جو باتیں بتاتے ہیں۔ انہیں سننا اور ان پر عمل کرنا بھی میرا کام ہے۔ بس اس سے زیادہ میں اپنے دھرم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

”مولانا خاموشی سے میری تقریر سنتے اور مسکراتے رہے۔ آخر انہوں نے دل نشیں لہجے میں فرمایا

Marfat.com

بیٹا! یہ تمہاری پوجا پاٹ اور دیوی دیوتاؤں کی مورتیوں کے آگے سر جھکانا عبث ہے۔ یہ بت تو اپنے ہاتھ سے تم نے خود بنائے ہیں۔ ان پر اگر مکھی اور مچھر بیٹھ جائے تو یہ انہیں اڑانے کی سکت نہیں رکھتے۔ بھلا یہ بت تمہاری کیا حاجت پوری کر سکیں گے؟ اشنان کر کے ننگے بدن کھانا پینا اور گائے کے گوبر اور پیشاب کو پاک سمجھنا دھرم کیسے ہو گیا؟ تم خوب سمجھتے ہو کہ یہ چیزیں نجس اور ناپاک ہیں۔ تم اپنے دھرم پر جتنا غور کرو گے اتنی ہی الجھنیں تمہارے سامنے آجائیں گی۔"

"مولانا کی یہ باتیں میں پہلے بھی سنتا رہا تھا' لیکن اس روز انہوں نے جو کچھ فرمایا وہ اتنا اثر انگیز تھا کہ ایک ایک لفظ دل میں اترتا چلا گیا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ہمارا دھرم اور اس کا سارا سلسلہ کس قدر خلافِ عقل ہے۔ رفتہ رفتہ میں نے دینِ اسلام کا گہرا مطالعہ شروع کیا............ مولانا کی پاک اور سیدھی سادھی اسلامی زندگی میرے سامنے بطورِ نمونہ تھی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ اقدس سے متعلق بہت سے واقعات مختلف کتابوں میں پڑھے اور اپنے محترم استاد کی زبان سے بھی سنے۔ ان سے بھی گہرا اثر قبول کیا اور یوں ذاتی تحقیق و جستجو سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ میں کتنی گمراہی اور تاریکی میں گھرا ہُوا ہوں۔ روز بروز کفر سے مجھے نفرت ہوتی چلی گئی اور دائرۂ ایمان میں داخل ہونے کے لئے اضطراب اور بے قراری میں اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ وہ مبارک ساعت آ گئی جب مولانا نے میری طلب اور درخواست پر مجھے کلمۂ طیبہ پڑھایا اور میں نے باقاعدہ اسلام قبول کر لیا' لیکن مصلحت کے تحت میں نے اپنے اسلام کا اعلان باقاعدہ نہ کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد مولانا کی شفقت' محبت اور ہمدردی بہت بڑھ گئی۔ انہوں نے مجھے قرآنِ کریم ناظرہ پڑھایا' پھر تفسیر بھی پڑھائی' فقہ اور حدیث کی تعلیم بھی دی' صوم و صلوٰۃ کا پابند کیا۔ مگر یہ تمام امور پوشیدہ ہی سرانجام دیا کرتا۔ ان دنوں مولانا ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے تھے' میں وہیں جا کر نمازیں ادا کرتا۔ قرآن کی تلاوت میں اس قدر سرور و حظ ملتا کہ بیان سے باہر ہے' لیکن سب سے زیادہ دشواری رمضان المبارک میں پیش آیا کرتی۔ میں روزے سے ہوتا اور میرے گھر والے مجھے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلانے کی کوشش کرتے اور اس حقیقت سے بچنے کے لئے طرح طرح کی تدبیروں اور حیلے بہانوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

کبھی میں نہانے میں دیر کر دیتا' کبھی کہتا میرے پیٹ میں درد ہے میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ کبھی بہانہ کرتا کہ اس وقت میں چاول اور روٹی نہیں کھاؤں گا' حلوہ پوری کھانے کو جی چاہتا ہے اور میں خود جا کر بازار سے لاؤں گا۔ کبھی یہ تدبیر کرتا کہ اس قدر سردی ہے اگر میں نہایا تو بیمار پڑ جاؤں گا اور نہائے بغیر کھانا ہمارے دھرم میں کھایا نہیں جا سکتا' اس لئے آج فاقہ ہی کر لوں تو بہتر ہے' ویسے بھی طبیعت ٹھیک نہیں۔ جب اس قسم کے بہانے ختم ہو جاتے تو آخر میں یہی حیلہ کام آتا کہ ابھی طبیعت ٹھیک نہیں' میرا کھانا رکھ دیا جائے' جب بھوک لگے گی تب کھا لوں گا۔ ان حیلوں بہانوں کے بعد بھی طوعاً و کرہاً گھر والے جب مجھے کھانے کے لئے بٹھا لیتے تو میرے اضطراب اور بے چینی کی انتہا نہ رہتی۔ معاً کوئی نہ کوئی نیا حیلہ سوجھ ہی جاتا

Marfat.com

اور میں یہ عذر کر کے اٹھ کھڑا ہوتا کہ چھوٹی بہن نے میرے کھانے کی تھالی کو ہاتھ لگا دیا ہے۔ اب میں یہ کھانا نہیں کھا سکتا وغیرہ وغیرہ............ قصہ مختصر، ہزاروں جتن کر کے اپنا روزہ بچاتا، پھر بھی ایسے لمحے نمودار ہو ہی جاتے جب والد مجھے اپنے سامنے بڑی محبت سے بٹھالیتے اور کھانا کھانے کا حکم دیتے۔ اس وقت میرے لئے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ ہوتی کہ جھوٹ موٹ منہ چلاتا رہوں اور چھوٹے چھوٹے لقمے بنا کر نہایت ہوشیاری سے والد کی نگاہ بچا کر اپنے دامن یا قریب رکھی ہوئی پانی کی گڑوی میں ڈالتا جاؤں اور جب والد کھانا کھا کر اٹھیں تو وہ گڑوی کسی جگہ خالی کر آؤں، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ احساس میرے قلب و روح کو چھیدنے لگا کہ اگر میں واقعی مسلمان ہوں تو مجھے اس قسم کے کمزور سہاروں اور حیلے بہانوں سے کام نہ لینا چاہئے، اپنے مسلمان ہونے کا بے خوف و خطر اعلان کر دینا چاہئے، آخر ایک نہ ایک دن تو لوگوں کو پتہ چل ہی جائے گا۔

"ابھی میں اسی حیص بیص میں تھا کہ ایک روز خود بخود یہ راز کھل گیا۔"

"میں مولانا کے مکان پر پہنچا اور ظہر کی نماز کے لئے مصلیٰ بچھایا پھر ان کا لوٹا لے کر وضو کرنے لگا۔ میں نماز قضا ہو جانے کے ڈر سے اتنی عجلت میں تھا کہ معمول کی احتیاطیں بھی بھول گیا اور مجھے قطعاً پتہ نہ چلا یہ سب حرکتیں میرا حقیقی ماموں جواہر سنگھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اِدھر میں نے نماز کی نیت باندھی اُدھر میرا ماموں مولانا کے مکان میں آ گیا اور چُپ چاپ وہیں کھڑا مجھے رکوع و سجود کرتے دیکھتا رہا۔ جب میں نے سلام پھیرا تو اس کی نگاہ پڑی۔ ایک لحظے کے لئے میرے قلب کی حالت دگرگوں ہوئی، مگر فوراً ہی میں نے دل ہی دل میں استغفار شروع کر دی۔ ماموں نے لال پیلی آنکھیں نکال کر کہا: "بدمعاش! کیا تو مسلمان ہو گیا ہے دیکھ تیری کیا درگت بنواتا ہوں! تجھے زندہ چھوڑ دیا تو میرا نام جواہر سنگھ نہیں، کچھ اور ہے۔ یہ کہہ کر وہ غصے میں بڑبڑاتا باہر نکل گیا اور میں دم بخود مصلے پر بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔"

اس کے بعد ناہر سنگھ پر ابتلاء و آزمائش کا وہ دور آیا جو کم و بیش چھ سال جاری رہا۔ اس کے والد اور خاندان کے دوسرے لوگوں نے اس اٹھارہ سالہ نوجوان پر ظلم و ستم اور تشدّد کا ایسا سلسلہ شروع کیا جس کے تصور ہی سے بدن پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ مولانا عبدالسمیع نے ناہر سنگھ سے کہا کہ آزمائش کے اس کٹھن وقت میں اگر عزم و استقلال اور صبر و ثبات سے کام لو گے تو انشاءاللہ دشمنوں کے دل خود ایک روز نرم ہو جائیں گے۔ ناہر سنگھ مولانا کے گھر سے رخصت ہو کر جب اپنے مکان پر پہنچا تو مستری موتھی سنگھ گھر کے دوسرے افراد سمیت اپنے بیٹے کا انتظار کر رہا تھا۔ جواہر سنگھ نے نہ جانے کیا کیا کہا تھا کہ ہر ایک کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔ موتھی سنگھ نے زندگی میں شاید پہلی بار اپنے بیٹے کو انتہائی بے دردی سے پیٹا پہلے ہاتھوں سے اور پھر بید سے۔ ناہر سنگھ کی ماں نے ایک دوبار اسے بچانے کی ہمت کی، مگر موتھی سنگھ غصے میں اندھا ہو رہا تھا۔ اس نے ناہر سنگھ کی ماں کو بھی مارا اور کہا کہ تو نے اسے جنا ہے اور اس نے مسلمان ہو کر پورے خاندان کی عزت آبرو خاک میں ملا دی ہے۔ اس لئے تو بھی اتنی ہی قصور وار ہے جتنا تیرا لڑکا۔ ناہر سنگھ پٹتا

Marfat.com

رہا اور پٹ پٹ کر لہولہان ہو گیا۔ اس نے زبان سے اُف نہ کی۔ اس اذیت کے بارے میں خود ایک جگہ لکھا ہے: "اس روز میرے والد اتنے مشتعل تھے کہ میں نے پہلے انہیں اس عالم میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ تاہم جوں جوں ان کا ہاتھ چلتا گیا' میں دل ہی دل میں درود شریف پڑھتا رہا۔ بالآخر وہ مار مار کر تھک گئے اور غصے میں کانپتے ہوئے دوسرے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گئے۔ کئی دن میرے زخموں پر ہلدی چونا تھوپا جاتا رہا۔ والد نے حکم دے دیا تھا کہ گھر کا کوئی فرد میرے قریب نہ آئے اور بات بھی نہ کرے اور نہ مجھے باہر نکلنے دیا جائے"

آہستہ آہستہ بستی کے تمام ہندوؤں کو علم ہو گیا کہ موتی سنگھ کے بیٹے نے اپنا دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے ایک سرے سے دوسرے سرے تک غُل مچ گیا۔ دھرم کے بڑے بوڑھے جمع ہوئے اور گھنٹوں اس امر پر سوچ بچار ہوا کہ اس فتنے کو کیونکر روکا جائے۔ خدشہ یہ تھا کہ آج ناہر سنگھ مسلمان ہوا ہے' کل کلاں کوئی اور ہندو لڑکا اپنا دھرم چھوڑ دے گا۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ اس فتنے کی اصل جڑ اس مولوی کو قصبے سے نکالا جائے جس نے ناہر سنگھ کو خلیل الرحمٰن بنایا۔ چنانچہ معزز ہندوؤں کا ایک وفد مولانا عبدالسمیع کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ وہ بستی چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں' ورنہ کوئی غضب ناک ہندو نوجوان انہیں قتل کر دے گا' لیکن مولانا ایسی دھمکیوں میں آنے والے نہ تھے' انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ناہر سنگھ اپنی خوشی سے مسلمان ہوا ہے اور خدا نے چاہا تو مسلمان ہی رہے گا۔ اس قضیے کی اطلاع رڑکی کے مسلمانوں تک بھی پہنچی اور جب انہیں پتہ چلا کہ ہندوؤں نے مولانا کو قتل کرنے کی دھمکیاں دی ہیں تو ان میں بھی اشتعال پھیل گیا۔ مولانا نے مسلمانوں کو سمجھایا کہ چند روز کی بات ہے پھر ہندوؤں کا غصہ خود بخود ٹھنڈا پڑ جائے گا' مگر مسلمان نہ مانے اور کہنے لگے کہ ناہر سنگھ اگر مسلمان ہو چکا ہے تو اب وہ ان کا دینی بھائی ہے اور قصبے کے مسلمان یہ ہرگز برداشت نہیں کریں گے کہ ہندو خلیل الرحمٰن پر ظلم و تشدد کریں۔

مولانا عبدالسمیع نے دیکھا کہ اس طرح قصبے میں ہندو مسلم فساد برپا ہو جائے گا اور خواہ مخواہ کئی جانیں ضائع ہوں گی' لہٰذا وہ اگلے ہی روز کسی کو بتائے بغیر رڑکی سے چلے اور میرٹھ پہنچ گئے۔ برہمنوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک مولانا قصبے میں موجود ہیں' اس وقت تک ناہر سنگھ مسلمان رہے گا اور جونہی اسے معلوم ہو گا کہ مولانا یہاں سے جا چکے ہیں' وہ اپنے دھرم پر واپس آ جائے گا۔ ادھر ناہر سنگھ نے جی میں مصمم ارادہ باندھ لیا کہ خواہ جان بھی چلی جائے وہ ایمان سے کفر کی طرف نہ جائے گا۔

مصائب اور مشکلات سے بھرپور اس زمانے کے واقعات اکثر آپ" عمر کے آخر دور میں عقیدت مندوں اور تلامذہ سے بیان فرمایا کرتے تھے۔ ان ملفوظات کی ترتیب سے اس آزمائش اور ابتلا کی جو تصویر سامنے آتی ہے' وہ عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ ان افراد کے لئے بھی باعثِ عبرت و موعظت ہے جو اس

Marfat.com

نوع کی آزمائشوں سے کبھی نہیں گزرے اور انہیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ قلب و روح میں جب ایمان پختہ ہو جائے تو دنیا کی بڑی سے بڑی آفت اور مصیبت بھی اس کے آگے ہیچ ہے۔ حضرت مولانا خلیل الرحمٰن کا ہندو دھرم ترک کر کے اسلام قبول کرنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا اور ایسے قصبے میں جہاں اکثریت متمول با اثر اور بارسوخ برہمنوں کی تھی، برہمن خاندان کے ایک نوجوان کا قبولِ اسلام جس ہنگامے کا باعث بن سکتا تھا، وہ اظہر من الشمس ہے۔ مولانا آب دیدہ ہو کر اکثر ان واقعات کا ذکر کیا کرتے تھے۔ صاحب ۔ انوارِ خلیل' نے یہ ملفوظات یوں ترتیب دیئے ہیں۔

"جب میں مسلمان ہُوا تو قصبے کے عام ہندوؤں کے علاوہ میرے گھر والے بھی جانی دشمن بن گئے۔ ان کا بس نہ چلتا تھا، ورنہ وہ میرا سینہ شق کر کے ایمان کھرچ ڈالتے۔ تاہم بدنی اور روحانی اذیتیں دینے میں انہوں نے کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ خاص طور پر میرے والد موتھی سنگھ کا غیظ و غضب تو انتہا پر پہنچ گیا۔ ان کی ساری محبت اور شفقت، عداوت اور نفرت میں بدل گئی۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں واقعی خون ...نہ مجھے بے دریغ جوتوں اور ڈنڈوں سے پیٹنے لگتے۔ مجھ سے انہوں نے کہا اگر اسلام ترک نہ کرے گا تو مارتے مارتے تجھے مار ہی ڈالوں گا خواہ بعد میں مجھے پھانسی ہی ہو جائے۔"

"ایک رات اپنی کال کوٹھڑی میں پڑا آنسو بہا رہا تھا۔ دن بھر مجھے کھانے کو کچھ نہ ملا تھا۔ حد یہ کہ پانی کی ایک بوند بھی میرے حلق سے نہ اتری۔ اسی حال میں غنودگی سی طاری ہوئی۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک حسین و جمیل نوجوان میرے پاس آیا۔ مجسمۂ وقار اور پیکرِ جمال و جلال۔ اس کی رفتار و گفتار سے شانِ ربی کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ میں نے حیرت سے پوچھا: "آپ کون ہیں؟" نوجوان نے متبسم ہو کر کہا: "میں امداد اللہ ہوں.......... آؤ میرے ساتھ چلو'.......... یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور مغرب کی جانب روانہ ہوا۔ میں حیران و پریشان اس نوجوان کے ساتھ چلا جاتا تھا اور خواب ہی میں مجھے احساس ہوا کہ یہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ ہیں جو نوجوان کی شکل میں تشریف لائے ہیں۔ مجھے ان سے کچھ پوچھنے کی جرأت ہی نہ ہوئی کہ آپ مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں۔ چپ چاپ چلتا گیا اور میرا ہاتھ بدستور وہ اپنے دستِ مبارک میں تھامے رہے۔ یکایک خود کو ایک شہر میں پایا۔ لوگ عربی لباس پہنے ادھر سے ادھر جا رہے تھے اور میری نگاہوں کے سامنے کوچہ و بازار پھیلتے چلے گئے تھے۔ تب میں نے اپنے رہبر سے پوچھا کہ حضرت! جہاں اس وقت آپ مجھے لائے ہیں یہ کونسی جگہ ہے؟ حضرت امداد اللہ نے فرمایا: "خلیل الرحمٰن، ذرا چشمِ دل کھول کر دیکھ.......... اس گھر کا مالک اور مکین زمانے کا شہنشاہ ہے......' اتنا کہنا تھا کہ میری آنکھیں روشن ہو گئیں، حجابات اٹھنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ میرے سامنے تمام جمال آرائیوں اور تابانیوں کے ساتھ کعبۃ اللہ موجود ہے۔ اس کا سیاہ ریشمی پردہ عجیب بہار دکھا رہا ہے اور ہر حیثیت کے انسان اور ملائکہ مصروفِ طواف ہیں۔ خواب میں کعبے کی زیارت سے میرا قلب رب العالمین کی جلوہ گاہ بن گیا اور جب" دفعتاً" میری آنکھ کھلی تو میرا اضطراب انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ دل میں خدا اور

Marfat.com

حبیبِ خدا کی محبت بڑھتی جا رہی تھی اور کسی پہلو قرار نہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مستقبل میں پیش آنے والے شدائد کا تصوّر میرے جذبۂ عشق و محبت کے لئے مہمیز ثابت ہوا اور قلب میں محبت کا ایسا شعلہ بھڑکا کہ جس نے باطل کا ہر رابطہ خاکستر بنا کر رکھ دیا۔

"ایک روز والد نے میری والدہ سے کہا: "اگر یہ لڑکا مجھے صاف صاف بتا دے کہ مسلمان ہو چکا ہے اور دوبارہ اپنے سچے دھرم پر واپس آنے کے لئے تیار نہیں تو میں اسے زہر دے کر بدنامی سے نجات حاصل کر لوں۔ " میری والدہ مجھ سے بڑی محبت کرتی تھیں اور گھر بھر میں یہی ایک ہستی ایسی تھی جس سے مجھے بھلائی کی توقع تھی۔ وہی مجھے چپکے سے آن کر کھانا دے جاتیں اور بار بار اس بات کی تلقین کرتیں کہ اپنے باپ کے سامنے مسلمان ہونے کا اعتراف نہ کرنا' ورنہ وہ تجھے قتل کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ میں خاموش رہتا ہاں یا نہ میں کچھ جواب نہ دیتا۔ جب چند روز گزر گئے تو والدہ نے میرے والد کو مشورہ دیا کہ ناہر سنگھ ابھی بچہ ہے' ناسمجھ ہے' اس پر اتنی سختی ٹھیک نہیں' غلطی تو اپنی ہی ہے کہ اسے کیوں ایسے شخص کے پاس پڑھنے بٹھایا جس نے اس پر جادو ٹونا کر دیا' ورنہ ہمارا بچہ کبھی مسلمان نہ ہوتا............جونہی اس کا اثر ٹوٹے گا' وہ دوبارہ اپنے دھرم میں آ جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ رڑکی سے باہر کسی اور جگہ بھیج دیا جائے تاکہ یہاں کے مسلمانوں سے اسے ربط و ضبط کا موقع ہی نہ ملے۔

"یہ بات والد کے ذہن میں بیٹھ گئی۔ انہوں نے کہا کہ فی الحال ناہر سنگھ کو کہیں اور بھیجنا مناسب نہ ہو گا۔ البتہ اسے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے۔ میں اس کے لئے ایسا بندوبست کئے دیتا ہوں کہ اسے ادھر ادھر کی باتیں سوچنے اور کسی غیر شخص سے ملنے ملانے کا موقع ہی نہ ملے۔ چنانچہ انہوں نے ہندی' انگریزی اور حساب کے کئی ہندو ٹیچر میری تعلیم اور نگرانی پر مقرر کر دیئے۔ صبح دس بجے سے دوپہر ایک بجے تک ایک استاد (انگریزی) پڑھانے گھر پر آتے۔ اس کے بعد میں دوپہر کا کھانا کھاتا۔ فوراً بعد ہندی اور سنسکرت کے استاد آ جاتے' وہ مجھے ہندو دھرم کی خوبیوں سے آگاہ کرتے' رام' لکشمن اور سیتا کے قصے سناتے' میں طوعاً و کرہاً سنتا اور گردن ہلاتا رہتا۔ وہ سمجھتے طالب علم پر ان کی تقریر کا بے حد اثر ہو رہا ہے' لیکن میں دل ہی دل میں لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا ورد کرتا رہتا۔ شام تین چار بجے تک پڑھا کر وہ تشریف لے جاتے تو ایک ماہرِ حساب پنڈت جی آ جاتے۔ یوں یہ اوقات مقرر ہو گئے۔

"ایک دن ہندی اور سنسکرت پڑھانے والے پنڈت جی نے مجھ سے پوچھا کیا واقعی میں مسلمان ہو گیا ہوں؟ میں نے صاف اقرار کرنا مناسب نہ جانا۔ البتہ اتنا کہا کہ میں نے اسلام کے بارے میں کتابیں پڑھی ہیں اور مجھے اس دین میں کوئی بات قابلِ اعتراض نظر نہیں آئی میری باتیں سن کر پنڈت جی کو بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور وقتاً فوقتاً میں نے انہیں اسلام کی خاص خاص باتوں اور خوبیوں سے آگاہ کرنا شروع کیا۔ سیرتِ رسول ﷺ اور اصحابِ رسول کے کارنامے سنائے' بزرگانِ دین کی زندگیوں اور ان کے پاکیزہ معمولات و اشغال سے خبردار کیا۔ میں نے محسوس کیا میری یہ باتیں سن کر پنڈت دھرم پرشاد جی کچھ کھو سے جاتے اور

Marfat.com

ان کا چہرہ متغیر ہونے لگتا۔ مجھے شبہہ ہوتا کہ شاید غیظ و غضب میں آن کر مجھے اُدھیڑنے لگیں گے یا والد سے شکایت کریں گے کہ آپ کا بیٹا تو ہاتھ سے جاتا رہا۔ یہ پکا مسلمان ہو چکا ہے اور اب اس کے ہندو دھرم میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں، لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ ایک روز وہ مجھے اپنے ساتھ گھر سے باہر باغ میں لے گئے اور ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگے: "بیٹا! میں تیرا احسان مند ہوں کہ تو نے مجھے گمراہی اور تاریکی سے نکالا۔ میں جان گیا ہوں کہ اسلام ہی سچا دین اور دھرم ہے۔ اب تو مجھے کلمہ پڑھا کر مسلمان کر لے' میں مبہوت ہو کر ان کا چہرہ تکنے لگا مجھے اپنی سماعت پر یقین ہی نہ آ رہا تھا' لیکن جب میں نے پنڈت جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو یقین آ گیا وہیں باغ میں بنے ہوئے کنویں پر پنڈت جی نے غسل کیا اور میں نے انہیں کلمۂ طیبہ پڑھا کر دائرۂ اسلام میں داخل کر لیا۔ پنڈت جی کے مشرف بہ اسلام ہونے سے میرے قلب کو اس قدر تقویت پہنچی اور ایسی روحانی خوشی نصیب ہوئی جو اس کے بعد زندگی میں پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اب ہم دونوں گھر سے نکل کر باغ میں آ جاتے اور نہایت اطمینان سے نمازیں پڑھتے۔ میں نے پنڈت جی کو ناظرہ قرآن پڑھایا۔ گھر میں والد کے سامنے وہ بدستور پنڈت بنے رہتے' مجھے ہندی اور سنسکرت کی کتابیں پڑھاتے' رامائن اور بھگوت گیتا کا درس دیتے اور گھر سے باہر میں ان کا استاد بن جاتا۔

"ہمارے گھر میں کئی نوکر تھے ان میں بہلی ہانکنے والا ایک بوڑھا دَیا رام بھی شامل تھا۔ دَیا رام نے مجھے بچپن میں کھلایا تھا اور مجھ سے بڑی الفت رکھتا تھا۔ ایک دن جب ہم باغ میں اپنے منتخب گوشۂ تنہائی میں نماز پڑھ رہے تھے' خلاف معمول دَیا رام ادھر آ گیا اور اس نے مجھے اور پنڈت جی کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور جب ہم نے سلام پھیرا تو وہ اٹھ کر پنڈت جی کے قدموں میں گر پڑا معلوم ہوا کہ وہ بھی مسلمان ہونا چاہتا ہے اور مدتوں سے پاکیزہ خواہش دل میں لئے پھر رہا ہے۔ دَیا رام کو بھی ہم نے مسلمان کیا اور اب ہم تین مسلمان ہو گئے۔ نمازوں میں جو لطف آتا' وہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ کبھی پنڈت جی امامت کرتے اور میں اور دَیا رام مقتدی بنتے' کبھی میں امامت کرتا اور وہ دونوں مقتدی ہوتے۔ والد کو بھی گھر بھر کے نوکروں میں دَیا رام پر سب سے زیادہ اعتماد تھا۔ چنانچہ جب مجھے گھر سے باہر کہیں جانا ہوتا تو وہ دَیا رام کو میرے ساتھ بھیجتے اور یوں اللہ کی رحمت سے میرے تمام معمولات حسبِ مرضی پورے ہو جاتے۔

"والد کا دل اگرچہ میری طرف سے صاف نہ ہوا تھا۔ تاہم ان کے غیظ و غضب اور آئے دن کی مار پیٹ میں کمی ضرور آ گئی تھی۔ ایک روز جب میں حساب کے پنڈت جی سے فرصت پا کر مغرب کی نماز کے لئے باغ میں جانے کی تیاری کر رہا تھا' والد نے مجھے آواز دے کر اپنے کمرے میں بلایا۔ میرا دل دھڑکنے لگا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ دل ہی دل میں درود شریف کا ورد کرتا ہوا میں ان کے کمرے میں گیا تو انہوں نے محبت سے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب ہی بٹھا لیا اور نرم آواز میں کہا۔ ناہر سنگھ! تمہارے دل میں جو بات ہو' صاف صاف کہہ دو۔ میں کسی قسم کی سختی نہیں کروں گا۔ مجھے بتاؤ تم کس دھرم کو بہتر اور

Marfat.com

سچا سمجھتے ہو۔ میں نے جواب میں کہا آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہیں اور مجھ پر الزام رکھتے ہیں۔ یقین کیجئے میں اپنے ہی دھرم کو صحیح اور سچا سمجھتا ہوں۔ میرا دھرم سچا ہے اور دوسرے تمام مذاہب غلط ہیں۔ آپ دشمنوں کی باتوں کا اعتبار نہ کریں۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ میرے طور طریقے کس قدر صاف ستھرے ہیں؟ میں ہمیشہ نہا دھو کر کھانا کھاتا ہوں؟ غرض' میں نے اس قسم کی کئی باتیں کہیں جو غلط تھیں نہ جھوٹ.........والد یہ سن کر کچھ مطمئن دکھائی دینے لگے اور انہوں نے مجھ سے کہا بیٹا! تمہارا ہی دھرم سب دھرموں کے مقابلے میں سچّا ہے۔ اسے کبھی نہ چھوڑنا۔ اس پر جمے رہنا!

"وہاں سے تو میں شکر کا کلمہ پڑھتا چلا آیا' لیکن چند ہی روز بعد ایک عجیب سانحہ ہوا جس نے والد کے دل میں پھر میری طرف سے غبار بھر دیا۔ کعبتہ اللہ اور مسجدِ نبوی کے دیدار کی حسرت اور اضطراب روز بروز بڑھتا جاتا تھا اور مجھے ایک لحظہ قرار نہ تھا۔ ایک روز تنہائی کے عالم میں طبیعت اس جذبے سے بے خود ہو گئی اور میں گردوپیش کے ماحول سے بے نیاز بلند آواز میں حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے وہ اشعار پڑھ پڑھ کر زاروقطار رونے لگا جو آپ نے میدانِ کربلا میں پڑھے تھے۔

اِنْ نِلْتَ یَا رِیحُ الصَّبَا یَوْمًا اِلٰی اَرْضِ الْحَرَمْ
بَلِّغْ سَلَامِی رَوْضَۃً فِیھَا النَّبِیُّ الْمُحْتَرَمْ

"مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ میری آواز کب والد کے کانوں تک گئی اور کب انہوں نے لاتوں اور گھونسوں سے میری پٹائی شروع کی۔ مارتے جاتے اور کہتے جاتے: بدمعاش! میرے ہی گھر میں اتنی اونچی آواز سے قرآن پڑھتا ہے:" میں نے لاکھ کہا میں قرآن نہیں پڑھ رہا تھا' لیکن انہوں نے ایک نہ سنی اور میری ہڈی پسلی ایک کر ڈالی۔ نتیجہ یہ کہ ایک بار پھر میرے ساتھ گھر میں اچھوتوں کا سا سلوک ہونے لگا اور والد نے میری نگرانی پہلے سے زیادہ کڑی کر دی۔ اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ مولانا عبدالسمیع میرٹھ تشریف لے جا چکے ہیں۔ ان سے ملنے کو دل تڑپنے لگا' لیکن میرٹھ تک پہنچنے کا کوئی سامان ہی نہ تھا۔ ایک دن بھلی بان نے چپکے سے مجھے بتایا کہ تمہارے استاد' مولانا صاحب رڑکی آئے ہوئے ہیں اور مسجد میں موجود ہیں بس اتنا سننا تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ والد اس وقت گھر میں نہ تھے' میں نے والدہ کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا تھوڑی دیر کے لئے باہر جانے کی اجازت دے دیں اور اس کا ذکر بعد میں والد سے نہ کریں۔ والدہ پہلے تو راضی نہ ہوئیں' مگر میری منت سماجت سے ان کا دل پسیج گیا اور انہوں نے اس شرط پر مجھے جانے کی اجازت دی کہ گھنٹے آدھ گھنٹے کے اندر اندر واپس آ جاؤں گا۔ میں خوشی خوشی گھر سے نکلا اور مسجد کی طرف روانہ ہوا جو ہمارے مکان سے ایک میل دور ہو گی۔ ابھی میں آدھے راستے میں تھا کہ میں نے والد کو نوکروں کے ساتھ آتے دیکھا۔ میں لپک کر ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ احساس ہوا کہ والد اس اثناء میں واپس آ گئے اور اب میری ہی تلاش میں نکلے ہیں۔ اب مسجد جانا مناسب نہ تھا۔ مجھے یاد آیا قریب ہی والد کے ایک پرانے دوست پنڈت نیکی رام رہتے ہیں۔ میں لپک کر پنڈت جی کے گھر میں داخل

Marfat.com

ہو گیا اور انہیں "پرنام" کر کے پاس بیٹھ گیا۔ پنڈت جی مجھے دیکھ کر کچھ خوش ' کچھ حیران ہوئے اور پوچھنے لگے کیسے آئے؟ میں نے بات بنائی کہ بہت دنوں سے آپ کو دیکھا نہ تھا' اس لئے ادھر چلا آیا۔ ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ میرے والد وہاں آن پہنچے اور آتے ہی ڈپٹ کر مجھ سے پوچھا: "گھر سے نکل کر کہاں گیا تھا؟ سچ سچ بتادے ' ورنہ ابھی تیرا گلا گھونٹ دوں گا" میں نے کہا: میں سیدھا یہیں آیا ہوں اور کہیں نہیں گیا۔ پنڈت نیکی رام کے جی میں نہ جانے کیا نیکی آئی کہ انہوں نے میری اس بات کی تصدیق کر دی اور یہ کہہ دیا کہ لڑکا بہت دیر سے یہاں آیا ہوا ہے اور اکثر میری باتیں سننے آجاتا ہے۔ پنڈت جی کی یہ بات سن کر والد مطمئن ہو گئے اور ان سے کہنے لگے: آپ کی بڑی کرپا ہو اگر آپ روزانہ رات کو ہمارے مکان پر آکر کتھا کہا کریں۔ پنڈت جی تیار ہو گئے اور اسی رات وہ اپنا سنکھ بغل میں داب ہمارے ہاں آ گئے۔ مسلسل تین گھنٹے ان کی کتھا ہوئی اور میں ایک گوشے میں بیٹھا دل ہی دل میں درود شریف پڑھتا رہا۔ پنڈت نے رواج کے مطابق کتھا کے دوران کئی بار سنکھ بجانے کی کوشش کی 'لیکن درود شریف کی برکت سے وہ ایک بار بھی سنکھ نہ بجا سکے اور بعد میں حیران پریشان ہو کر چلے گئے۔

"والد نے جب سے مجھے عربی زبان میں اشعار پڑھتے سنا تھا' ان کا شک و شبہ پھر زندہ ہو گیا تھا اور وہ سمجھ چکے تھے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔ انہی دنوں ایک زبردست نجومی رڑکی میں آیا۔ بہت لوگ اس سے اپنا احوال پوچھتے تھے۔ والد نے اسے گھر میں بلایا اور مجھے بھی حاضر ہونے کا حکم دیا۔ نجومی نے میرے چہرے پر نگاہ ڈالی اور اس کا رنگ اڑنے لگا۔ میں نے فوراً دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا اور چپکے سے نجومی پر دم کر دیا۔ دم کرنا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح لرزنے لگے اور اس کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔ چند لمحوں بعد اس نے جانے کی اجازت چاہی اور گھر کے دروازے سے نکلتے ہی ایسا بھاگا کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ نجومی کی اس حرکت پر سب لوگ سخت متعجب ہوئے اور ہر فرد اپنی اپنی بولی بولنے لگا۔ اس واقعے کا والد پر گہرا اثر ہوا اور انہوں نے گھر میں والدہ سے ذکر کیا کہ مجھے لڑکے سے اب خوف آنے لگا ہے۔ اس کے اندر کوئی زبردست شکتی ہے چنانچہ اس روز سے انہوں نے مجھے مارنا پیٹنا کم کر دیا' تاہم نگرانی اسی طرح رہی۔"

"ایک دن اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں اداس بیٹھا تھا اور تصوّر بندھا ہوا تھا اپنے استاد محترم کا کہ دور سے تین پاکیزہ صورتوں والے آدمی مجھے دکھائی دیئے۔ دل بے اختیار ان کی طرف کھنچنے لگا۔ اتفاق سے اس وقت گھر کا کوئی فرد میری جانب متوجہ نہ تھا' میں آہستہ سے باہر نکل گیا۔ وہ تینوں بزرگ آہستہ آہستہ چلتے ایک کھیت کے قریب پہنچے اور چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔ میں نزدیک گیا تو اٹھ کھڑے ہوئے پھر انہوں نے باری باری مجھے سینے سے لگایا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ معلوم ہوا وہ تینوں محض مجھے دیکھنے کے لئے دیوبند سے تشریف لائے ہیں۔ اس سے پہلے میں نے انہیں دیکھا تھا نہ ان کے اسمائے گرامی سے واقف تھا۔ ان میں سے ایک بزرگ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی تھے۔ دوسرے مولانا

Marfat.com

سعادت علی اور تیسرے صاحب مولانا فیض الحسن سہارنپوری تھے۔ انہوں نے مجھے دینِ حق قبول کرنے پر مبارکباد دی اور نصیحت فرمائی کہ اس راہ میں جتنی تکالیف آئیں انہیں خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ایک دن آئے گا جب یہ پریشانیاں جاتی رہیں گی اور اللہ تمہیں صبرو شکر کے عوض دین و دنیا کی بھلائی عطا فرمائے گا۔ ان تینوں بزرگوں کی زیارت سے طبیعت بے حد مسرور و محظوظ ہوئی قلب کی طمانیت اور روح کی سرشاری کا کیا کہنا! احساس ہُوا کہ راہِ حق میں اب تک جتنے مصائب جھیلے، حقیقت میں ان کی حیثیت پر کاہ کے برابر بھی نہ تھی اور اگر اس سے بھی زیادہ آزمائشیں آئیں تو انشاء اللہ ان میں بھی پورا اتروں گا۔"

"یہ تینوں حضرات پورے ہندوستان میں مشہور و معروف تھے اور یہ ممکن ہی نہ تھا کہ رڑکی میں ان کی آمد کی خبر کسی کو نہ ہوئی ہو۔ آناً فاناً سینکڑوں مسلمانوں کا ہجوم ہو گیا۔ ادھر میں سخت محجوب کہ میرے سبب سے ان بزرگوں کو تکلیف ہو گی۔ اسی اثناء میں قصبے کے ہندوؤں نے بھی مجھے ان حضرات سے ملاقات کرتے دیکھ لیا تھا اور یہ خبر والد کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ میں گھر گیا تو وہ میرے منتظر تھے اور ان کی آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔ میں سمجھا آج پھر خیر نہیں۔ بری طرح مرمت ہو گی چنانچہ میں نے زیرِ لب کلمۂ طیبہ کا ورد شروع کیا اور گھر کے اندر چلا گیا۔ والد اپنی جگہ بیٹھے مجھے دیکھتے رہے اور خلافِ معمول انہوں نے اس وقت سرزنش نہ کی۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور چارپائی پر لیٹ رہا۔ تھوڑی دیر بعد آہٹ سی ہوئی میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو والد تھے انہوں نے آتے ہی اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور چٹخنی چڑھا دی۔ میں سمجھا اب آفت ٹوٹے گی، لہٰذا میں پٹنے کے لئے تیار ہو گیا۔ لیکن میں قطعی بھونچکا رہ گیا جب والد صاحب نے سر سے اپنی پگڑی اتاری اور میرے قدموں میں رکھ دی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور میں نے کہا: یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولے بیٹا میری آبرو رکھ لو، مجھے لوگوں میں رُسوا نہ کرو۔ تم اپنے گھر میں جو چاہو کرو، مگر جب تک میں زندہ ہوں کھل کر ایسی حرکتیں نہ کرو جن کے سبب مجھے بدنامی اور شرمندگی سے دوچار ہونا پڑے۔ یہ کہتے ہی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور اس قدر روئے کہ ہچکی بندھ گئی میں دم بخود تھا کچھ عقل میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ محبتِ پدری جو ایک طبعی چیز ہے میرے اندر جوش کرنے لگی اور میں نے ان سے کہا اچھا، آئندہ آپ کی مرضی کے خلاف نہ کروں گا، یہ سن کر وہ خوش ہوئے اور اپنے آنسو پونچھنے لگے۔ میں نے پگڑی دوبارہ ان کے سر پر رکھ دی اگلے ہی روز وہ سورج نکلنے کے وقت میرے پاس آئے اور کہنے لگے ناہر سنگھ! تو نے وعدہ کیا تھا کہ میری مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرے گا اور جو میں حکم دوں گا اس کی تعمیل کرے گا۔ میں نے کہا آپ کی پہلی بات کا اقرار کرتا ہوں کہ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں گا البتہ میں نے اس کا وعدہ نہیں کیا کہ جو حکم آپ دیں گے اس کی بھی تعمیل کروں گا۔ خیر، آپ فرمایئے! انہوں نے کہا میرے ساتھ باہر چلو اور سورج دیوتا کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کرو، تب میں جانوں کہ تمہیں میری خوشی عزیز ہے۔ یہ سنتے ہی میں نے ان سے کہا یہ حرکت مجھ سے نہ ہو گی خواہ آپ جان سے مار ڈالیں اگر میں سورج کو پرنام نہ کروں تو

Marfat.com

اس سے آپ کا کیا بگڑتا ہے اور کونسی بدنامی ہوتی ہے؟ والد چند لمحے چپ چاپ میری صورت تکتے رہے پھر کچھ کہے بغیر واپس چلے گئے۔ ”

والد مکان کے نچلے حصے میں رہتے تھے اور میرا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ میرے کمرے میں لکڑی کا ایک صندوق رکھا رہتا۔ اس میں دینی کتابیں بھری ہوئی تھیں‘ انہی میں نہایت عمدہ کتابت کا قرآن مجید بھی تھا۔ ایک مرتبہ رات کے وقت سراج السالکین کا مطالعہ کر رہا تھا کہ والد نے نیچے سے آواز دی کہ آدھی رات ہو گئی‘ چراغ گل کرو اور سو جاؤ میں نے اس اندیشے سے کہ والد کہیں اوپر نہ آجائیں جلدی سے چراغ بجھا دیا اور گھبراہٹ میں سراج السالکین وہیں صندوق کے اوپر رکھ دی حالانکہ میں ہمیشہ ایسی کتابیں صندوق میں مقفل کر کے رکھا کرتا تھا ابھی میں نے چراغ بجایا ہی تھا کہ والد اوپر آ گئے اور کہنے لگے: مجھے بتاؤ اس وقت کیا کر رہے تھے؟ میں نے دوبارہ چراغ جلایا اور کہا کہ ایک ضروری کتاب دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ان کی نظر سراج السالکین پر پڑ گئی جھٹ کتاب اٹھالی۔ اسے دیکھ کر ایک دم آگ بگولا ہو گئے فوراً میرے چھوٹے بھائی کو بلایا اور اس سے پوچھا یہ کتاب کس کی ہے؟ بھائی نے گنگا جل کی قسم کھاتے ہوئے میرے بارے میں کہا کہ یہ کتاب ان کی نہیں اور نہ ان کے پاس کبھی دیکھی۔ اگر ان کی ہوتی تو کسی نہ کسی وقت میری نظر بھی پڑتی کیونکہ ان کی اکثر کتابیں میں دیکھا کرتا ہوں۔ یہ سن کر والد نے اسی وقت باہر سے اس مسلمان منشی کو طلب کیا جو ہمارے ہاں ملازمت کرتا تھا والد نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: تو نے اپنی کتاب یہاں لا کر کس لئے رکھی ہے؟ منشی جی اگرچہ مجھ سے ہمدردی رکھتے تھے اور بارہا انہوں نے مجھے والد کے غیظ و غضب سے بچایا تھا‘ لیکن اس روز منشی جی بھی گھبرا گئے اور ان کے منہ سے نکل گیا کہ یہ کتاب میری ہے نہ میں نے یہاں لا کر رکھی ہے بس یہ جواب بہت تھا۔ والد نے کتاب اٹھائی اور نیچے لے جا کر اسے آگ دکھا دی میں اپنی محبوب اور قیمتی کتاب نظروں کے سامنے جلتے دیکھتا رہا اور دم نہ مار سکا۔ تاہم آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو نہ روک سکا۔ والد نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے سامنے کتاب اچھی طرح خاکستر کرنے کے بعد پھر میرے کمرے میں آئے اور مطالبہ کیا: یہ صندوق کھول کر دکھا! اس میں کون کون سی کتابیں ہیں؟ اب تو میرا خون خشک ہو گیا۔ جانتا تھا اگر صندوق کھول دیا تو کتاب بچے گی .... اور نہ قرآن مجید بے حرمتی سے محفوظ رہے گا۔ غرض اس لمحے اللہ کو یاد کیا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو صندوق تو نہ کھولوں گا۔ والد نے جب دیکھا کہ میں صندوق کی کنجی دینے پر تیار نہیں تو انہوں نے لکڑی اٹھا کر مجھے مارنا شروع کیا اور اس وقت تک پیٹتے چلے گئے جب تک لکڑی ٹوٹ نہ گئی پورے گھر میں کہرام مچ گیا‘ پاس پڑوس والے بھی جاگ گئے۔ والدہ ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی پشت پناہ بن گئیں اور والد سے کہنے لگیں آپ کو شرم نہیں آتی جوان بیٹے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے؟ جب اسے پڑھنا لکھنا سکھایا ہے تو وہ کتابیں نہیں پڑھے گا تو اور کیا بھاڑ جھونکے گا؟

” والد اس وقت تو بکتے جھکتے نیچے اتر گئے‘ مگر یہ بھی کہہ گئے کہ صبح صندوق نہ کھولا تو اسے بھی یونہی

Marfat.com

آگ لگادوں گا۔ میں جانتا تھا وہ بے حد ضِدّی شخص ہیں اور ایسا یقیناً کر گزریں گے چنانچہ میں نے منشی جی سے کہا کہ اس صندوق میں دینی کتابوں کے علاوہ قرآن مجید بھی بند ہے۔ اگر اسے کچھ صدمہ پہنچا تو قیامت کے روز تم اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گے؟ جس طرح بھی ممکن ہو یہ کتابیں اور قرآن مجید یہاں سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر پہنچاؤ۔ خدا منشی جی کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے منہ اندھیرے موقع پا کر تمام کتابوں اور کلام پاک کی ایک گٹھڑی سی بنائی اور سر پر اٹھا کر لے گئے۔ اس کے بعد میں نے صندوق میں ہندی' حساب اور سنسکرت وغیرہ کی کتابیں بھر دیں تاکہ والد اسے کھولیں تو انہیں اطمینان ہو جائے' لیکن اگلے روز والد نے صندوق نہ کھولا' مجھے حکم دیا کہ ان کے ساتھ مہیوڑ چلوں۔ مہیوڑ ' رڑکی سے دس بارہ کوس دور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ وہاں ان کے ماتحت سینکڑوں کاریگر کام کیا کرتے تھے۔ والد خود تو گھوڑے پر سوار ہوئے اور مجھے اذیت دینے کے لئے پیدل چلنے کا حکم دیا۔ میرے لئے یہ بھی راحت ہی تھی۔ مہیوڑ پہنچ کر انہوں نے اپنے آدمیوں کو تاکید کہ کہ یہ لڑکا دن رات تمہارے ساتھ رہے گا اور کوئی شخص یا مسلمان اس کے قریب بھی پھٹکنے نہ پائے۔ اس کا کھانا پینا بھی تمہارے ساتھ ہی ہو گا اور تم اسے بڑھئی کا کام سکھاؤ۔ ان لوگوں نے والد کے حکم کی تعمیل کی اور مجھے کام سکھانا شروع کر دیا' ساتھ ساتھ وہ کفرو شرک کی باتیں بھی سناتے رہتے۔ رات کو جب یہ لوگ تھک ہار کر سو جاتے تو میں نگرانی کرنے والوں سے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے نہر پر چلا جاتا اور دن بھر کی نمازیں رو رو کر ادا کرتا اور بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتا کہ اس مصیبت سے نجات دے۔ چھ برس بعد جب میں نے اپنے اسلام کا اعلان کیا اس وقت تمام نمازوں کی دوبارہ قضا کی۔ بہرحال اس ماحول میں میری جان سخت ضیق اور عجب عذاب میں تھی۔ بہت عرصہ اسی طرح گزارا' پھر ایک روز اللہ نے نجات کی صورت پیدا کر ہی دی۔

"والد' آصف نگر کے مقام پر کسی کام کی انجام دہی کے سلسلے میں نہر پر گھوم رہے تھے۔ اچانک پل کے اوپر سے نیچے گر گئے چونکہ نہر میں کچھ پانی تھا' اس لئے جان تو بچ گئی پھر بھی خاصے زخمی ہوئے۔ بے ہوشی کی حالت میں چارپائی پر ڈال کر گھر لائے۔ ہوش میں آتے ہی انہوں نے میرے بارے میں دریافت کیا اور کہا میرا بڑا لڑکا کہاں ہے؟ اسے جلدی میرے پاس لاؤ' اس کی صورت تو دیکھ لوں۔ آج کل میں نہ معلوم کس وقت میرا دم نکل جائے۔ میں نے اسلام کی کتاب جلائی۔ لڑکے کو مارا پیٹا اور قید کیا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ ادھر تو والد کے خیالات میرے بارے میں نرم ہو رہے تھے' ادھر بعض متعصب ہندو پنڈتوں نے پھر ان کے کان بھرے اور کہا اگر آپ نرم پڑیں گے تو لڑکا یقیناً مسلمان ہو جائے گا۔ اسے ہمارے حوالے کر دیجئے۔ چنانچہ والد نے مجھے حکم دیا کہ پنڈتوں کے پاس بلاناغہ حاضری دیا کروں۔ ان میں ایک پنڈت جی بڑے بھاری وگیان اور جوگی تھے اور ان کے بارے میں مشہور تھا کہ کالا جادو بھی جانتے ہیں اور ہمزاد قبضے میں کر رکھا ہے۔ وہ کبھی کبھار قصبے کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر رعب بٹھانے کے لئے شعبدے اور طرح طرح کے کرتب دکھایا کرتے تھے۔ کبھی بے موسم

Marfat.com

ے پھل منگوار ہے ہیں، کبھی جھاڑ پھونک کر کسی ناقابلِ علاج مریض کو ٹھیک کر رہے ہیں۔ ہندو تو ان کے اس قدر گرویدہ تھے کہ بے تکلف پنڈت جی کو سجدہ کرتے ایک شام وہ مجھے اپنے ساتھ جنگل میں لے گئے وہاں ہُو کا عالم تھا اور اندھیرا تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اگرچہ میں بار بار ادھر سے آ جا چکا تھا لیکن اس شام مجھے خاصا ڈر لگا۔ میں نے دیکھا پنڈت کا رخ مرگھٹ کی طرف ہے۔ جب زیادہ ہی خوف محسوس ہوا تو میں نے دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد شروع کیا۔ اس طرح خوف دور ہوا مرگھٹ سے ادھر یہ پنڈت رکا اور ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے بھی سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے محض انگلی کے شارے سے اپنے گرد دائرہ بنایا اور اس دائرے کے اندر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ پنڈت نے تھوڑی دیر بعد میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا: سچ بتاؤ! تمہارے اندر کون سا کمال ہے؟ اپنے دل کی بات مجھ پر واضح کرو۔ اس کی بات سن کر میں نے پہلے تو مُتوکّلاً علَی اللہ درود شریف پڑھا" پھر جواب میں کہا: پنڈت جی ہوشیار ہو جایئے۔ میں اپنی باتیں آپ کو بتاتا ہوں' سُنیئے! میں حبسِ دم کرتا ہوں اور خنّاس پر قابو پا کر اسے جلا ڈالتا ہوں' پھر اپنے محبوب کے خیال میں کھو جاتا ہوں۔ خود کو بالکل فنا کر دیتا ہوں" صرف اسی کی ذات رہ جاتی ہے اور ہر سمت اسی کا جلوہ نظر آتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی باقی ذات کے سامنے ہمارے فانی وجود کی حقیقت کیا ہے۔ ۔ ہر سانس کے ساتھ اسی کا تصوّر ہے۔ اس کی یاد سے ایک لمحہ غفلت کفر سمجھتا ہوں۔ اگر دل میں محبوب کے سوا کوئی باطل خیال آ بھی جاتا ہے تو اس کو ضربوں سے پامال کر ڈالتا ہوں۔ میری ہستی محبوب کے لئے فنا ہو گئی اور میں نے خود کو مٹا دیا ہے آؤ! ہم دونوں گردن جھکا کر بیٹھیں اور ایک دوسرے کو اپنا اپنا کرتب دکھائیں یہ کہہ کر میں نے لاحول پڑھی اور پنڈت پر دم کر دیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا اور اس کی ساری جادوگری دھری کی دھری رہ گئی۔ جب کچھ سنبھلا تو کہنے لگا: اچھا' اپنے کرتب کا نام تو بتا دو۔ میں نے کہا ایک تو حبس دم ہے اور دوسرا پاس انفاس اور تیسری چیز محبوب کے نام کی ضرب ہے۔ اس نے دریافت کیا ضرب میں تم کس کا نام لیتے ہو؟ میں نے کہا وہ نام تم کو کس طرح بتا دوں' وہ زبان سے دل میں اتر چکا ہے۔ تم لوگ تو جوگ کے بڑے بڑے کرتب دکھاتے ہو' ہمت ہے تو اپنے جوگ سے معلوم کر لو کہ وہ کون ہے۔ میری بات سن کر پنڈت حیران اور ان کا ہمزاد مضمحل ہو گیا۔ ہمزاد نے پنڈت سے پوشیدہ طور پر کہا۔ یہ لڑکا میرے قابو میں آنے والا نہیں۔ اس کے کام میں بہت طاقت ہے اور اس کے مقابلے میں میرے کرتبوں اور تمہارے جادو ٹونے کی کوئی حیثیت نہیں۔

"واپس آن کر وہ پنڈت میرے والد سے ملا اور کہا لڑکا دھرم تیاگ چکا ہے اور اب اس کا مرض لاعلاج ہے۔ والد یہ سن کر رونے لگے اور انہوں نے کہا پھر تم لوگ کس لئے اتنے بڑے بڑے دعوے کرتے ہو اور خود کو بڑا مہا پُرش اور شکتی مان بتاتے ہو؟ وہ پنڈت آئیں بائیں شائیں بکتا چلا گیا۔ اتفاق سے چند روز بعد عید الفطر کی رات آئی۔ میں اس وقت گھر والوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ والد دوسروں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: کل مسلمانوں کی عید ہے۔ یہ لوگ اپنی مسجد میں جمع ہوں گے۔ ہندوؤں کے ہاں اس طرح

Marfat.com

کی یکجہتی بالکل نہیں۔ کبھی تیج تہوار پر اکٹھے نہیں ہوتے۔ میرے منہ سے نکل گیا پتاجی! ہندو تو تین دیوتاؤں کو پوجتے ہیں۔ اسی طرح ان کے راستے بھی تین طرف کو نکل گئے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو دیکھئے وہ ذاتِ واحد کی عبادت کرتے ہیں جو پاک صفات سے موصوف ہے۔"

"میری یہ باتیں سن کر والد کو پھر طیش آیا اور مجھے اس قدر مارا کہ دونوں ہاتھ سن ہو گئے' کہنے لگے: اپنے دھرم کو سب سے اچھا جانو اور مانو۔ اگر تم نے دھرم بدلا تو اپنے باپ کا رویہ بھی بدلا ہوا پاؤ گے۔ اگلے روز انھوں نے میرے بارے میں اپنے قریبی دوستوں سے مشورہ کیا اور کہا کہ اس لڑکے کی بہن کا بیاہ ہونے والا ہے۔ ہزاروں کا خرچہ ہے باہر سے برات آئے گی۔ اگر ان کے سامنے بات کھل گئی اور براتیوں کو احساس ہو گیا کہ لڑکی کا بھائی اپنا دھرم بدل چکا ہے تو کوئی میرے ہاں کھانا کھائے گا اور نہ لڑکی کا ڈولا اٹھ سکے گا۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ناہر سنگھ کو بیاہ کی رسموں کے دوران میں دھنوری گاؤں بھیج دیا جائے۔ یہ نالائق وہاں پوربیوں کی قید میں رہے گا اور جب لڑکی وداع ہو جائے تو اسے رڑکی واپس بلوا لیجئے گا۔ والد کو یہ تدبیر بہت پسند آئی چنانچہ مجھے زبردستی دھنوری لے جا کر ایک مکان میں قید کر دیا گیا۔"

"جب بہن رخصت ہو گئی اور بیاہ کا ہنگامہ ختم ہوا تو قصبے کے بعض مسلمانوں کی طرف سے انگریز مجسٹریٹ کی عدالت میں میری جانب سے اس مضمون کی عرضی داخل کرائی گئی کہ عرصہ ہُوا میں نے برضا و رغبت ہندو دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس لئے میرے والد نے بطور انتقامی کارروائی مجھے دھنوری کے مقام پر سخت قید میں ڈال دیا ہے اور میرے دونوں ہاتھوں کی فصد کھول دی گئی ہے۔ اگر جلد مجھے رہا نہ کرایا گیا تو یہ لوگ مجھے مار کر کہیں دبا دیں گے۔"

"یہ عرضی دیکھ کر انگریز مجسٹریٹ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے فوراً پولیس کو حکم دیا کہ مستری موتھی سنگھ اور اس کے بیٹے ناہر سنگھ دونوں کو فوراً حاضر کرو اور موتھی سنگھ کو ہتھکڑی لگا کر لایا جائے۔ پولیس نے مجھے دھنوری سے برآمد کیا اور والد کی گرفتاری کے لئے مکان پر گئی' مگر انھوں نے تھانیدار کو رشوت دے کر خود کو ہتھکڑی سے بچایا اور تھانیدار سے کہا کہ وہ خود کسی وقت عدالت میں حاضر ہو جائیں گے۔ پولیس نے تنہا مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا۔ اس نے پوچھا: سچ بتاؤ! تمہارے باپ نے تمہیں کیوں قید کیا تھا؟ اپنی بہن کی شادی میں تم کیوں شریک نہ ہوئے اور تمہارے جسم سے بذریعہ فصد خون نکالنے کی کوشش کیوں کی گئی اور کیا یہ عرضی تمہی نے بھجوائی تھی؟' میں نے جواب میں کہا جناب والا! یہ عرضی میں نے نہیں لکھی اور نہ میرے ہاتھوں کی فصد کھولی گئی۔ یہ سب باتیں کسی اور نے اپنی جانب سے لکھ دی ہیں۔ بہن کی شادی کے موقع پر کام بہت بڑھ گیا تھا' اس لئے میں انہی کاموں کی انجام دہی کے سلسلے میں باہر چلا گیا۔ آنسو میری آنکھوں سے خود بخود رواں تھے۔ انگریز مجسٹریٹ بے حد متاثر نظر آیا۔ آخر کہنے لگا: لڑکے! مجھے سب خبر ہے تمہارے باپ نے تم پر کتنا ظلم ڈھایا' اور تم پھر بھی اسے بچا رہے ہو؟ بہرحال اگر تم نہیں چاہتے تو میں تمہارے باپ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں گا۔ آج سے تم اپنے کاموں میں آزاد ہو۔

Marfat.com

تمہیں پورا اختیار ہے جس طرح چاہے زندگی گزارو اور جو مذہب پسند ہے' اس میں داخل ہو جاؤ۔ اس کے بعد مجسٹریٹ نے والد کو طلب کیا اور سخت لہجے میں ان سے کہا: پنڈت موتھی سنگھ! تمہارے ظلم و ستم کا سب حال معلوم ہو چکا ہے۔ تمہارا لڑکا بہت نیک ہے۔ اس نے آج تمہاری عزت بچالی ورنہ میں تمہیں سزا دیئے بغیر نہ چھوڑتا۔ آئندہ اسے ستاؤ گے اور تکلیف دو گے تو سیدھا جیل بھیج دوں گا۔ "

"اس واقعے کے ٹھیک دو ہفتے بعد میں نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ اب ایک اور عجیب بات سنیئے! جس روز صبح کو میں مسلمان کی حیثیت سے ظاہر ہونے والا تھا' اس رات پنڈت نیکی رام نے خواب میں دیکھا کہ لوگ جمع ہیں اور میرے ہاتھ میں ایک نورانی تختی ہے۔ تختی پر سنہرے حروف میں کلمۂ طیبہ لکھا ہوا ہے اور کلمہ دیکھ دیکھ کر لوگ خوش ہو رہے ہیں۔ میں نے پنڈت سے کہا اسے آپ بھی دیکھئے۔ پنڈت نے جواب دیا: اچھی چیز ہے' گم نہ ہونے پائے۔ "

"پنڈت جی کی صبح آنکھ کھلی تو انہیں یہ خواب اچھی طرح یاد تھا اور حقیقت میں ہوش و حواس گم تھے۔ اپنے ہندو احباب سے بھی بیان کیا اور رڑکی کی مشہور معزّز شخصیّت قاضی فصیح الدین کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر کہا: مجھے یقین ہے یہ لڑکا بہت جلد اپنے اسلام کا اعلان کر دے گا اور میرا خواب بس ظاہر ہی ہونے والا ہے۔ "

"وہ رات میں نے دوستوں کے ساتھ گزاری۔ صبح انہوں نے کہا آج ہمارے ساتھ چل کر نماز جامع مسجد میں پڑھو۔ ہم لوگ تمہیں اپنے درمیان لے لیں گے' ابھی اندھیرا ہے' پہچان کون سکے گا چنانچہ میں نے سب کے ساتھ فجر کی نماز جامع مسجد میں ادا کی اور اس طرح شریک جماعت افراد پر تو راز ظاہر ہو ہی گیا۔ پھر کسی نے جا کر والد سے بھی کہہ دیا کہ آپ کا بیٹا آج جامع مسجد میں تھا۔ یہ سن کر انہوں نے مایوسی اور پریشانی کے عالم میں گھر بلوا کر سخت باز پرس کی اور کہنے لگے: سچی بات بتا دے' ورنہ آج تیرا یہاں سے بچ کر جانا مشکل ہے۔ جامع مسجد میں کیا کرنے گیا تھا؟ والد بہت کچھ کہتے رہے اور میں خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا' آخر میں نے صرف اتنا کہا: "مجھے اس وقت چھوڑ دیجئے! بہت تھکا ہوا ہوں" شام تک آپ کی ساری باتوں کا جواب دے دوں گا اور شام بھی بہت دور نہیں' .... میری یہ بات سن کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ میں بھی اٹھا .... اور نہا کر کھانا کھانے لگا۔ نہاتے وقت ہی میں نے نیت کر لی کہ میرا یہ غسل اسلام کے لئے ہے۔ "

"کھانا کھا کر والد تو باہر گئے' میں نے عمدہ اور نیا لباس زیب تن کیا اور اکیلا ہی جامع مسجد رڑکی پہنچ کر باضابطہ اپنے اسلام کا اعلان کر دیا .... رڑکی کی جامع مسجد میں جو کلیر شریف اور حضرت علی احمد صابر رحمتہ اللہ علیہ کے زیر سایہ ہے' میرے اسلام لانے کے اعلان نے ہندوؤں کو مشتعل کر دیا اور وہ اکٹھے ہو کر مجھے مارنے کے درپے ہوئے' لیکن اسی اثنا میں سینکڑوں پُرجوش مسلمانوں کے ہجوم نے مجھے اپنے درمیان لے لیا اور ہندوؤں کو حملہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ اس روز مجھے جو مسرت حاصل ہوئی' وہ

Marfat.com

کسی شہنشاہ ہفت اقلیم کو بھی میسّر نہیں آ سکتی اور ترجمانی الفاظ کے ذریعے ناممکن ہے۔ اس روز ہاتھ میں کلامِ پاک اور زبان پر نعتِ رسول ﷺ تھی اور صرف خدا اور محبوبِ خدا کی باتیں تھیں۔"

اسلام لانے کے بعد مولانا خلیل الرحمٰن کی شخصیت میں ایسا عظیم اور پاکیزہ انقلاب رونما ہوا کہ ان کی ظاہری و باطنی حالت دیکھ کر بڑے بڑے اکابر علماء متوفیاءاور اولیاء بھی رشک کرنے لگے۔ صورت پر وہ نور کہ راہ چلتے لوگ دیکھتے اور ٹھٹھک کر رک جاتے۔ باتوں میں ایسی حلاوت اور سحر کہ ان کے اسلام لانے کے فوراً بعد رڑکی کے ہندوؤں کو خدشہ پیدا ہوا کہ ایک ایک کر کے سبھی مسلمان ہو جائیں گے۔ چنانچہ اکثر لوگ ایمان کی دولت سے مالامال ہوئے اور جن کو کفر نے بری طرح جکڑ رکھا تھا' وہ مسلمان ہونے کے خوف سے رڑکی چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے۔ مسلمان ہونے کے بعد آپ نے اپنے گھر والوں سے کوئی مادی تعلق بھی نہ رکھا' بلکہ یہی شرط پیش کی کہ مسلمان ہو جاؤ تو تمہارا غلام ہوں' ورنہ میرا اور تمہارا واسطہ نہیں۔ والدہ نے بصد اصرار کئی بار بلایا تو آپ ایک آدھ مرتبہ تشریف لے گئے اور جب والدہ نے کہا کہ گھر بار' روپیہ پیسہ' جائیداد سب تیرے لئے موجود ہے تو آپ نے فرمایا مجھے ان کی ضرورت نہیں' اسلام نے سب کچھ عطا کر دیا ہے اور میں اب اپنے زورِ بازو سے رزق حاصل کروں گا' چنانچہ محنت مزدوری کو اپنا شعار بنایا اور کسی کے مرہونِ منت نہ ہوئے۔ بعد ازاں رڑکی اور گردونواح کے مسلمانوں نے اپنے اپنے بچوں کو آپ کے پاس تعلیم و تربیت کے لئے بھیجنا شروع کیا اور مجبور کیا کہ آپ پورا وقت دینی کاموں کے لئے وقف کر دیں۔ آپ نے یہ درخواست منظور فرمائی اور متوکلاً علی اللہ ایک گوشے میں بیٹھ گئے' پھر ایسی فتوحات ہوئیں کہ باید و شاید' فیاضی کا یہ عالم تھا کہ جب آپ حج کے لئے جاتے تو پورا قافلہ ساتھ ہوتا اور سب کا خرچ آپ ہی کے ذمے رہتا۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی نے حرمین شریفین کی زیارت کا شوق ظاہر کیا اور آپ نے فوراً اسے اپنا رفیق سفر بنا لیا۔

ایک مرتبہ سخت قحط پڑا اور خشک سالی سے ہر طرف کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کی آپ نے دوسرے روز نمازِ استسقاء کے لئے نکلنے کا اعلان کر دیا۔ جس وقت آپ ایک جمِّ غفیر کے ساتھ نماز ادا کرنے جا رہے تھے' اس وقت ہندو آپ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ مستری موتھی کالڑ کا آج پانی برسوانے جا رہا ہے' لیکن انہی لوگوں نے دیکھا کہ دعا سے قبل اگرچہ آسمان بالکل صاف تھا اور کہیں بادل کا شائبہ تک نہ تھا: تاہم دعا سے فارغ ہونے کے بعد صرف چند ہی منٹ میں ایسی دھواں دھار بارش شروع ہوئی کہ لوگ واپسی میں گھروں کو جاتے ہوئے شرابور ہو گئے اور بھاگ کر کہیں پناہ بھی نہ لے سکے۔

آپ کے مزاج میں حد درجہ استغنا کے ساتھ ساتھ سخاوت اور فیاضی بھی بے انتہا تھی۔ کسی کی درخواست اور طلب کو رد نہ فرماتے تھے جس زمانے میں سفرپور گاؤں میں بسلسلۂ امامت مقیم ہوئے' وہاں ہریجنوں نے آس پاس پانی نہ ہونے کی شکایت کی۔ آپ نے ان کے لئے ایک کنواں کھدوایا جس میں سے

Marfat.com

شیریں پانی نکلا وہ کنواں آج بھی موجود ہے۔ اسی طرح رسول پور کی مسجد کے لئے لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ کنویں سے پانی نکل آئے۔ کئی جگہ کنواں کھودا گیا' مگر پانی نہ نکلا۔ آپ نے ایک مقام پر اللہ کا نام لے کر پانچ بھاؤڑے مارے اور اللہ نے اسی جگہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔ رسول پور کی گنبد والی مسجد بھی آپ نے بنوائی جو بدستور آباد ہے۔

آپ کے استاد' جن کے ذریعے آپ نے اسلام کی دولت پائی' مولانا عبدالسمیع میرٹھ میں تھے۔ آپ سب سے پہلے ان کی قدم بوسی کے لئے وہاں گئے۔ مولانا نے شاگرد کو سینے سے لگایا اور خوب روئے۔ ان کی علمی و دینی و اخروی ترقیوں کے لئے دعا فرمائی اور کہا کہ میرا خط لے جاؤ مکّہ معظّمہ میں حاجی امداد اللہ تمہارے منتظر ہیں۔ یہ سن کر مولانا خلیل الرحمٰن کی مسرت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اللہ نے غیب سے حج کے اخراجات کے لئے انتظام کر دیا۔ مکّہ معظّمہ پہنچے تو حاجی صاحب اپنے رفقاء کے ساتھ شہر سے باہر آپ کے استقبال کے لئے خود تشریف لائے ہوئے تھے۔ مولانا نے خط پیش کیا۔ حاجی صاحب نے معانقہ کیا اور بہت کچھ عطا فرمایا' پھر اپنے مکان پر لے گئے۔ مولانا خلیل الرحمٰن کو حاجی صاحبؒ سے ایسا انس ہوا کہ وہیں مستقل طور پر قیام کا ارادہ کر لیا' لیکن حاجی صاحب نے فرمایا میاں! خلیل الرحمٰن ابھی تم ہندوستان واپس جاؤ۔ اللہ کو تم سے وہاں بہت کام لینا ہے اور سنو! تم بار بار انشاء اللہ حج کے لئے آؤ گے۔ یہ سن کر آپ خوش ہوئے۔ حاجی صاحب کا ارشاد صحیح نکلا۔ مولانا خلیل الرحمٰن سولہ مرتبہ حج بیت اللہ کے شرف سے مشرف ہوئے اور وہ بھی طویل اقامتوں کے ساتھ اس لئے حاجی صاحب سے برابر فیض یاب ہوتے رہے۔ حضرت نے آپ کو بیعت سے بھی سرفراز کیا اور خلافت عطا فرمائی۔ 1317ھ میں حاجی امداد اللہ واصل بحق ہوئے۔ مولانا خلیل الرحمٰن کو اس قدر صدمہ ہوا کہ حالت غیر ہو گئی۔ مدتوں حاجی صاحبؒ کے فراق میں روتے رہے۔ کسی کل اور کسی پل چین نہ ملتا تھا۔ جنگلوں اور بیابانوں میں مارے مارے پھرتے' لباس پھٹ جاتا' کھانے کا ہوش تھا نہ پینے کا۔ اگر کوئی پوچھتا کہ یہ کیا حال بنا رکھا ہے تو بے اختیار رونے لگتے۔

حاجی صاحب علیہ الرحمتہ کے وصال سے اگلے برس یعنی 1318ھ میں مولانا عبدالسمیع بھی وفات پا گئے۔ اس حادثۂ جانکاہ نے تو بالکل ڈھیر کر دیا۔ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود آپ پر تنگ ہو گئی۔ کسی پہلو قرار نہ آتا تھا۔ آخر لوگوں کی منت سماجت پر بچوں کی تعلیم و تربیّت کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا۔ وعظ و نصیحت' بیعت و ارشاد اور تعلیم و تلقین کا یہ اثر ہوا کہ دور دراز سے طالبین کھنچے آئے۔ بے شمار افراد کو کفر کی تاریکیوں سے نکالا اور اسلام کی روشنی میں لائے۔ تقریباً سترہ برس کی طویل مدّت اسی حالت میں گزر گئی۔ شہر کی معزّز و مقتدر مسلمان شخصیّتوں نے زور دیا کہ ایک دینی مدرسہ قائم کیا جائے جس کی سرپرستی اور نگرانی مولانا خلیل الرحمٰن فرمائیں۔ آپ راضی ہو گئے اور 1305ھ میں اس مدرسے کی بنیاد رکھ دی۔ آج رڑکی اور گردونواح میں جو کچھ علم کے آثار و انوار نظر آتے ہیں وہ اسی مدرسۂ رحمانیہ کے

Marfat.com

زندہ جاوید، جاری فیض کا پَرتو ہیں۔ اب تک لاتعداد حفاظ، قراء، آئمہ مساجد، علماء اور اس عالی شان مدرسے سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔

1319ھ میں مولانا خلیل الرحمٰن دیارِ رحمت اللعالمین کی جانب ہجرت کی نیت سے عازمِ سفر ہوئے اور مدینہ منورہ پہنچ کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔ آپ کے اس سفر سے اہالیان شہر، اراکین مدرسہ اور معتقدین حد درجہ مضطرب ہوئے۔ اسی زمانے میں مدرسۂ رحمانیہ کی روداد میں اس اضطراب کا اظہار ان الفاظ میں ہوا: ”حضرت مولانا مولوی حافظ حاجی مہاجر الی اللہ جناب مخدومنا و مکرمنا خلیل الرحمٰن صاحب کا مدرسے اور اہل مدرسہ سے جدا ہو جانا سخت رنج والم کی بات ہے۔

فی الحقیقت حضرت مولانا مدرسے کے لئے باغبانی اور اہل مدرسہ کے لئے نور ایمانی کا کام فرماتے تھے۔ اب آپ اپنے لگائے ہوئے علمی باغ کی آبیاری اپنی خلوت کی دعاؤں اور مدینۃ العلم کی ضیاء پاشیوں سے فرمائیں گے“ جس ذاتِ اقدس کی محبت میں آپ نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا اسی کے کوچے میں اپنے کو لا کر ڈال دیا۔ آپ 1327ھ تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔ یہاں تک کہ 17ر محرم الحرام 1328ھ مطابق 1919ء کو آپ کا وصال ہوا۔ آپ کی زندہ و تابندہ یادگار، مدرسہ عربیہ رحمانیہ رڑکی، آج بھی علوم و فنون کے خزانے لٹا رہی ہے۔ اسے من جانب اللہ ہر دور میں مخلص، دین دار، صالح اور جفاکش افراد کی خدمات حاصل ہوتی رہیں اور یہ سب بانیٔ مدرسہ حضرت مولانا خلیل الرحمٰن صاحب کے اخلاص کا مظہر ہے۔

Marfat.com

مولانا محمد زکریاؒ

کاندھلہ ضلع مظفر نگر، یوپی میں دہلی...... سہارنپور ریلوے لائن پر ایک بارونق قصبہ ہے مظفر نگر سے چونتیس میل دہلی سے بیالیس میل اور سہارنپور سے پینتالیس میل دور مشرق میں نہر جمن شرقی اور اس کے کنارے حدِ نظر تک باغوں کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ دریائے جمنا ہی کی وجہ سے یہ علاقہ پنجاب کے ضلع کرنال سے کٹتا ہے۔ قصبے کا جنوبی مشرقی علاقہ خاص طور پر بے حد زرخیز ہے آموں کے باغ محلّوں اور آبادیوں تک پہنچ گئے ہیں اور حضرت احسان دانش کاندھلوی مرحوم نے لکھا تھا: "نہر کے گل بار کناروں کا منظر ہر وقت رہٹ چلنے کے باعث گردونواح کے دوسرے مناظر سے نسبتاً شاداب اور روح افزا رہتا ہے مگر شام ہوتے ہی جب آسمان کی نیلی آنکھوں میں سرسوں پھولنے لگتی ہے اس وقت یہ قطعہ اور بھی تیکھا ہو جاتا ہے جنوب میں شاہی وقتوں کا ایک پختہ تالاب ہے جس کے مشرقی کنارے پر پرانی اور مختصر سی مسجد، مغرب میں نہانے کا زینہ دار گھاٹ، شمال میں ایک عالی شان مندر اور پجاریوں کے رہنے کیلئے دو منزلہ عمارت، جنوب میں مویشیوں کے پانی پینے کیلئے کچّا اور ڈھلوان گھاٹ اور اس گئو گھاٹ کی پشت پر دور تک ٹیلے کے پیچھے سرسبز میدان ہے۔

کاندھلے کی آبادی سے ریلوے سٹیشن صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے رات کو ریل گاڑی کی آواز اسی طرح آتی جیسے زمین دردِ زہ میں مبتلا ہو۔ آبادی اور تالاب کا یہ محبوب منظر باغ کے اتنا قریب تھا کہ جب آموں کا موسم جنم لیتا تو بور کی خوشبو اور کوئلوں کی کوک، آبادی میں مندروں کے کلس

Marfat.com

اور مکانوں کی اٹاریاں چومتی پھرنے لگتی اور راستے کی خاموشی میں رکھوالوں کی آواز قصبے کی گلیوں تک مار کرتی۔

کاندھلہ اگرچہ پرانا قصبہ ہے مگر اس میں تاریخی اہمیت کی کوئی عمارت نہیں۔ بعض تاریخی حوالوں سے اتنا پتا چلتا ہے کہ سلطان محمد تغلق رجب 693ھ میں اس قصبے کے قریب شکار کھیلنے آیا اس وقت قصبے کی کسمپرسی کا یہ عالم تھا کہ یہاں کوئی جامع مسجد بھی نہ تھی سلطان نے جامع مسجد کی تعمیر کا حکم دیا اور اس طرح کاندھلے کی ترقی کی بنیاد رکھی گئی۔ شہنشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں یہ قصبہ ایک نمایاں حیثیت اختیار کر گیا جس وقت مسلمانوں کا عہدِ اقتدار ختم ہوا اور اس کی جگہ ہندوستان میں برطانوی استعمار نے سنبھالی تو کاندھلہ اپنی شہری آبادی کے علاوہ اکاون دیہات پر مشتمل تھا۔ 1847ء میں اس کی آبادی تقریباً سات ہزار نفوس تھی اور تقسیم ہند کے وقت خاص کاندھلے کی آبادی چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی جس میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً چودہ ہزار تھی۔ سہارنپور اور مظفر نگر کے اضلاع میں اگرچہ بعض قصبے کاندھلے سے بھی بڑے ہیں مگر بارہویں، تیرہویں اور چودھویں صدی ہجری میں جس قدر اہلِ علم و فضل کاندھلے کی خاک سے اٹھے، وہ شرف کسی اور قصبے کو حاصل نہ ہو سکا۔

مولانا عبدالحیؒ جنہوں نے شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کی دامادی کا شرف پایا اور تحریکِ آزادی میں حضرت سیّد احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کے دست و بازو بنے اس سرزمین سے تعلق رکھتے تھے مفتی الٰہی بخش کاندھلوی جو شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے اسی قصبے کی خاک پاک سے اٹھے۔
مفتی الٰہی بخش وہ باکمال آدمی ہیں جنہوں نے مثنوی مولانائے روم کا تکملہ لکھا ان کے بعد مولانا مظفر حسین کاندھلوی، مولانا کمال الدین، مولانا حکیم شیخ الاسلام، حافظ محمد اسمٰعیل، مولانا محمد یحیٰؒ کاندھلوی اور ان کے نامور فرزند شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا، ان کے چچا مولانا محمد الیاس بانیٔ تبلیغی جماعت ان کے بیٹے مولانا محمد یوسف اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی جیسے علما کے اسم ہائے گرامی نمایاں ہیں۔ مفتی الٰہی بخش کاندھلوی علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل الفن استاد تھے۔

1162ھ میں ولادت ہوئی اور 1245ھ میں وفات پائی شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی کے ممتاز شاگرد اور مرید تھے عالمِ دین ہونے کے ساتھ ساتھ بلند پایہ فقیہہ، طبیب، شاعر اور مصنف تھے اکثر تصانیف پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے بعد کسی شاگرد کو عطا کر دیتے۔ عربی فارسی اور اُردو تینوں زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ قصیدہ بانت سعادٗ کی شرح عربی زبان میں لکھی جس میں ہر شعر کا فارسی اور اُردو میں منظوم ترجمہ ہے۔
1234ھ میں مفتی صاحب سیّد احمد شہیدؒ کی ملاقات و بیعت سے مشرف ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمر بہتر سال اور سیّد صاحب کی عمر چونتیس سال کی تھی ایک ایسے شیخ سے بیعت ہونا جو عمر میں اڑتیس سال چھوٹا اور رسمی طور پر عالم بھی نہ تھا۔ مفتی صاحب کی للّٰہیت، بے نفسی اور خلوص کی دلیل ہے بیعت ہونے کے بعد سیّد صاحب کے طریقے اور افکار میں ایک کتاب فارسی زبان میں "ملہماتِ احمدیہ" کے نام سے

Marfat.com

لکھی جو سیّد صاحب کی تالیف "صراطِ مستقیم" کا خلاصہ مع اضافہ ہے۔ مفتی صاحب کے دو صاحبزادے تھے۔ مولوی ابوالقاسم اور مولوی ابوالحسن، مؤخرالذکر مشہور مثنوی گلزار ابراہیم کے مصنّف ہیں جو ان کی بڑی کتاب "بحرِ حقیقت" کا ایک حصہ ہے مفتی صاحب کا خاندان نہ صرف ضلع مظفّر نگر، بلکہ پوری اسلامی دنیا میں اپنی علمی اور دینی حیثیت سے ممتاز ہے۔

مفتی الٰہی بخش کی حیات ہی میں اور ان کے وصال کے بعد کاندھلے کی جس شخصیت نے علم اور تقویٰ میں بہت اونچا مقام اور نام پایا وہ حضرت مولانا مظفّر حسین کی ذات گرامی ہے مولانا مظفّر حسین مولوی محمود بخش کے صاحبزادے اور مفتی الٰہی بخش کے بھتیجے تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے چچا سے حاصل کی لیکن ابھی پوری نہ کرنے پائے تھے کہ مفتی الٰہی بخش نے دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رحلت فرمائی چنانچہ مولانا مظفّر حسین نے بقیہ ظاہری و باطنی تعلیم دہلی میں حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے اور شاگردِ رشید شاہ محمد اسحٰق سے پوری کی۔ انہیں مولانا محمد یعقوب مہاجر مکّی سے بھی شدید تعلقِ خاطر تھا اور ان سے بیعت بھی تھے۔ سلسلۂ درس و تدریس نہ تھا سیدھی سادی زندگی بسر فرماتے، البتہ کبھی کبھی مسجد میں اور کبھی مستورات میں وعظ کہہ دیا کرتے تھے گاڑھے کا کُرتا، پاجامہ اور نیلی لنگی، یہ آپ کا لباس تھا مولانا مظفر حسین کی صاحبزادی کہا کرتی تھیں کہ ایک بار موٹی ململ کا کُرتا مولانا کیلئے سیا تو پہلے زیب تن فرمانے سے انکار کر دیا بعد میں بیٹی کی خوشنودی کیلئے پہنا مگر جمعہ کی نماز پڑھ کر فوراً اتار دیا اور فرمایا: "میرا گاڑھے کا کُرتا دے دو، ململ کے کُرتے سے طبیعت میں عجب پیدا ہوتا ہے۔"

سواری پر کبھی نہ بیٹھتے، اکثر پیدل سفر کیا کرتے اور سامانِ سفر لوٹا، لنگی، لکڑی اور مشکیزہ ہوتا جہاں شام ہو جاتی وہیں شب بسری کیا کرتے۔ ایک مرتبہ شام ایسے گاؤں میں ہوئی جہاں سب ہندو تھے کوئی مسلمان نہ تھا گاؤں والوں سے مولانا نے کہا کہ رات رہنے کیلئے جگہ بتا دو۔ ایک شخص نے گاؤں کے باہر کولھو پر جگہ بتا دی وہاں آکر مولانا نے رومال میں بندھی ہوئی اپنی روٹی کھائی اور آرام کیا۔ اتفاق سے وہی شخص رات کے وقت جنگل میں آیا اس نے مولانا کو قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے سُنا اس پر محویت طاری ہو گئی تمام شب بے تابی سے گزاری، صبح ہوتے ہی حاضرِ خدمت ہوا اور کہنے لگا: "رات جو تو پڑھ رہا تھا وہ جلدی سے مجھے بھی پڑھا دے۔" اس کے بعد وہ انہیں اپنے گھر لے گیا اور اس کی بیوی بچے سب مسلمان ہو گئے۔

مولانا مظفّر حسین ایک مرتبہ کاندھلہ تشریف لا رہے تھے راہ میں ایک شخص ملا اس سے دریافت فرمایا: "کہاں جاؤ گے؟" اس نے جواب دیا: "کاندھلہ مولوی مظفر حسین کے پاس۔" اس شخص کے پاس سامان تھا اور مولانا خالی ہاتھ تھے آپ نے اس سے سامان لے کر اپنے سر پر رکھ لیا۔ کاندھلہ آکر جب اسے معلوم ہوا یہی مولوی مظفّر حسین ہیں تو بہت پشیمان ہوا۔ مولانا نے فرمایا: "اس میں کیا حرج تھا؟ میں خالی ہاتھ تھا اور تم بوجھ اٹھائے ہوئے آ رہے تھے۔"

Marfat.com

مولانا بیحد محتاط طبیعت رکھتے تھے کبھی مشتبہ مال نہ کھاتے اور اگر بھولے یا غلطی سے کھا لیتے تو فوراً قے ہو جاتی اِن کے زمانۂ طالبعلمی کا قصّہ ہے کہ مولانا نے کئی سال سالن سے روٹی نہیں کھائی۔ دریافت پر فرمایا کہ دہلی کے اکثر گھرانوں میں سالن کے اندر کھٹائی پڑتی ہے اور یہاں لوگ آموں کی بیع ناجائز طریق پر کرتے ہیں اس لئے میں سالن نہیں کھاتا۔ مولانا بجز اپنے گھر کے کسی اور کے ہاں دعوت وغیرہ میں تشریف نہ لے جاتے تھے یوں بھی ان کی دعوت کرتے وقت ہر شخص گھبراتا کہ کہیں فضیحت نہ ہو جائے گھر کے لوگ بھی بڑی احتیاط کرتے۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ نواب قطب الدّین صاحب دہلوی نے اپنے استاد شاہ اسحٰق، مولانا محمدؒ یعقوب، مولانا مظفر حسین کاندھلوی اور چند دوسرے اصحاب کی دعوت منظور کر لی مگر مولانا مظفر حسین صاحب نے منظور نہ فرمائی۔ اس سے نواب صاحب کو ملال ہوا اور انہوں نے شاہ اسحٰق سے شکایت کی یہ سن کر شاہ صاحب نے مولانا پر عتاب فرمایا اور کہا: "اے مظفّر حسین تجھے تقویٰ کی بدہضمی ہو گئی؟ کیا نواب قطب الدّین کا کھانا بھی حرام ہے؟" مولانا نے عرض کیا: "حضرت حاشاو کلاّ، مجھے نواب صاحب پر اس قسم کی بدگمانی نہیں"۔ شاہ صاحب نے فرمایا: "پھر تو کیوں انکار کرتا ہے؟" مولانا نے جواب میں کہا: "حضرت نواب صاحب نے آپ کی دعوت کی ہے اور مولوی محمدؒ یعقوب صاحب کی بھی، اور ان کے علاوہ اپنے آدمیوں کی بھی۔ آپ کو پالکی میں لے جائیں گے اس میں بھی ضرور صرف ہو گا اور نواب صاحب گو بگڑ گئے ہیں پھر بھی نواب زادہ ہیں، دعوت میں ضرور نوابانہ تکلّف کریں گے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب مقروض بھی ہیں جتنا روپیہ وہ دعوت میں صرف کریں گے ان کی حاجت سے زائد ہے۔ یہ روپیہ وہ اپنے قرض میں کیوں نہیں دیتے؟ ایسی حالت میں ان کی دعوت کراہت سے خالی نہیں۔" مولانا کی یہ بات شاہ صاحب کے ذہن میں بھی آ گئی اور انہوں نے فرمایا: "میاں قطب الدّین اب ہم بھی تمہارے ہاں کھانا نہ کھائیں گے۔"

مولانا مظفر حسین نہایت منکسر المزاج تھے اس سادگی سے رہتے سہتے کہ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اتنے بڑے عالم ہوں گے ہر کام خود کرتے بلکہ دوسروں کا کام بھی کر دیا کرتے تھے۔ عادت یہ تھی کہ اشراق کی نماز پڑھ کر مسجد سے نکلتے اور جو جو گھر اپنے اقارب کے تھے وہاں تشریف لے جاتے اگر کسی کو بازار سے کچھ منگانا ہوتا تو پوچھ کر وہ لا دیتے پیسہ اس زمانے میں کم تھا جو شے آتی غلے کی آتی تھی۔ آپ غلّہ کبھی کرتے کے پلے میں لے جاتے اور کبھی لنگی میں۔ مولانا نے چھ حج پیدل کئے ایک مرتبہ مکہ مکرّمہ سے مولانا محمدؒ یعقوب کا خط آیا کہ تم یہاں چلے آؤ۔ خط ملتے ہی وہ فوراً بیت اللہ روانہ ہو گئے۔ یہ روانگی 1282ھ میں ہوئی ابھی مکہ مکرمہ پہنچے تھے کہ اسہال کا مرض لاحق ہو گیا تاہم جوں توں کر کے پہنچ گئے وہاں حضرت حاجی امداد اللہ سے فرمایا: "میرا جی چاہتا تھا کہ مدینہ منورّہ میں موت آئے مگر اب بظاہر میری موت کا وقت قریب آ گیا آپ مراقبہ کیجئے۔" حاجی صاحب نے مراقبے کے بعد فرمایا: "نہیں"

Marfat.com

آپ مدینہ منورہ پہنچ جائیں گے۔" چند روز بعد مولانا اچھے ہو گئے اور مدینہ منورہ کی طرف چل پڑے۔ مدینے پہنچنے میں ایک منزل باقی تھی کہ پھر بیمار ہوئے اور دسویں محرم 1282ھ جمعے کو انتقال کیا۔ مدینہ میں حضرت عثمانؓ کی قبر کے قریب مدفون ہوئے۔

مولانا مظفر حسین کاندھلوی کی صاحبزادی بی امتہ الرحمٰن بھی رابعہ سیرت بی بی تھیں۔ انہیں خاندان میں عام طور پر امّی بی کے نام سے یاد کیا جاتا ان کے بارے میں ایک مرتبہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے فرمایا: "میں نے اپنی نانی کی نماز کا نمونہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی نماز میں دیکھا اور مولانا گنگوہی کی نماز اپنے طبقے میں ممتاز تھی۔ آخر زمانے میں امّی بی کا یہ حال تھا کہ خود کھانا کبھی طلب نہ فرماتی تھیں کسی نے لا کر رکھ دیا تو کھا لیا گھر بڑا تھا، اگر کام کی کثرت اور بے حد مشغولیت کی وجہ سے خیال نہ آیا تو بھوکی بیٹھی رہیں۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا آپ ایسے ضعف کی حالت میں بے کھائی رہتی ہیں فرمایا: "الحمد اللہ! میں تسبیحات سے حظ حاصل کر لیتی ہوں۔" امّی بی کی بیٹی صفیہ کا نکاح کاندھلے کے ایک نوجوان عالم دین اور صدیقی خاندان کے چشم و چراغ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سے ہوا مولانا اسمٰعیل کا جدی نسب چھٹی پشت میں مفتی الٰہی بخش صاحب سے جا ملتا ہے۔

مولانا محمد اسمٰعیل کا اصل وطن جھنجھانہ تھا لیکن آپ دہلی میں مرزا الٰہی بخش کے صاحبزادوں کی دینی تعلیم و تربیت کے فرائض سرانجام دیتے تھے مرزا الٰہی بخش کا نام تاریخ میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ مرزا صاحب، بہادر شاہ ظفر کے سمدھی تھے اور "غدر" 1857ء میں انہوں نے انگریزوں کی خفیہ طور پر بڑی خدمات ادا کیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی اپنی مشہور تالیف "الثورۃ الہندیہ" میں منشی جیون لال کے روزنامچے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"بادشاہ سراسیمہ تھے۔ شہزادوں کی لوٹ کھسوٹ اور تختِ شاہی کی تمنّاؤں نے باہمی رقابت کا میدان گرم کر رکھا تھا۔ عمائدِ شہر میں دو گروہ تھے ایک بادشاہ کا ہمنوا اور دوسرا حکومتِ کمپنی کا بہی خواہ۔ فوجوں میں طمع اور لالچ نے گھر کر لیا تھا جنرل بخت خاں کی سکیموں میں مرزا مغل آڑے آتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ سے سرکار میں معافی کا خط بھی بھجوا دیا تھا کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ مرزا مغل کی وجہ سے پھوٹ پڑ گئی جنرل بخت خان سے بگڑ گئے۔ کمپنی کی فوج نے 14 ستمبر 1857ء کو شہر دہلی پر حملہ کر دیا اور 19 ستمبر کو مکمل طور پر انگریز قابض ہو گئے۔ بادشاہ جو اس درمیان میں قلعے سے نکل کر مقبرہ ہمایوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے اور متعلقین گرفتار کر کے قلعے میں نظر بند کر دیئے گئے تین شہزادوں کو قلعے میں داخل ہوتے ہی گولی کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے سر خوان پوش سے ڈھک کر خوان میں لگا کر بہادر شاہ کے سامنے بطور تحفہ پیش کیے گئے۔ انہی میں مرزا مغل کا سر بھی تھا جنرل بخت خان اپنی فوج اور توپ خانہ نکال کر لے گئے۔ بادشاہ سے کہا آپ بھی میرے ساتھ چلیں مگر وہ زینت محل اور مرزا الٰہی بخش کے ہاتھ میں کھلونا بن چکے تھے۔ آمادہ نہ ہوئے آخر کار بہادر شاہ ظفر پر مقدمہ چلا۔ انہیں رنگون میں نظر بند کیا گیا

Marfat.com

مرزا الٰہی بخش کو انگریزوں نے اعزازات و انعامات دیئے جاگیریں مقرر کیں لیکن مرزا صاحب دہلی والوں کی نظر سے ایسے گرے کہ کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ تھی ان کی خواہش تھی کہ انگریز انہیں دہلی کے بازاروں میں چھ گھوڑوں کی شاہانہ بگھی پر نکلنے کی اجازت دیں مگر انہوں نے ایسی اجازت نہ دی بلکہ کچھ عرصے بعد مرزا الٰہی بخش کو قلعے سے نکال کر بستی نظام الدّین منتقل کر دیا چنانچہ مولانا محمدؒ اسمٰعیل بھی ان کے ساتھ بستی نظام الدّین چلے آئے۔ حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاء کے مزار پُر انوار کے قریب چونسٹھ کھمبے کے نام سے ایک تاریخی عمارت ہے اس کے سرخ پھاٹک پر اوپر کی منزل میں مولانا محمدؒ اسمٰعیل کو رہنے کیلئے جگہ ملی۔ پھاٹک سے متصل ہی ایک چھوٹی سی مسجد تھی اس کے سامنے مرزا الٰہی بخش کی نشست گاہ تھی جس پر ٹین پڑا ہوا تھا اسی باعث اسے بنگلے والی مسجد بھی کہتے ہیں۔

مولانا محمدؒ اسمٰعیل ذاکر و شاغل، متقی اور مستجاب الدعوات آدمی تھے۔ تلاوتِ قرآن اور ادعیہ ماثورہ سے خاص شغف تھا جس کی وجہ سے آپ خاص مقام کے مالک تھے تاہم ہمہ اپنی زندگی عزلت اور گمنامی میں گزار رہے تھے۔ آئے گئے مسافروں کی خدمت، قرآن مجید اور دین کی تعلیم شب و روز کا مشغلہ تھا۔ خدمت و تواضع کا یہ عالم کہ جو مزدور بوجھ لادے ہوئے پیاسے ادھر آنکلتے، مولانا ان کا بوجھ اتار کر رکھ دیتے، اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر انہیں پانی پلاتے پھر دو رکعت شکرانہ ادا کرتے کہ اے اللہ تو نے مجھے اپنے بندوں کی یہ خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائی میں اس قابل نہ تھا۔ عام اجتماع اور ہجوم کے زمانے میں پانی اور لوٹوں کا خاص اہتمام رکھتے اور رضائے الٰہی اور قربتِ خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خلق خدا کی راحت رسانی اور خدمت میں مشغول رہتے۔ مولانا ہر وقت ذاکر و باخدا رہتے۔ مختلف اوقات و حالات کے بارے میں حدیث میں جو اذکار اور اوراد آئے ہیں ان کی پابندی کرتے تھے۔ آپ کو مرتبۂ احسان حاصل تھا۔ امیر شاہ خان صاحب کی روایت ہے کہ جب بھی ان کی ملاقات مولانا محمدؒ اسمٰعیل سے ہوتی وہ یہ ضرور فرمایا کرتے: "حدیث میں آیا ہے کہ جب کسی کو کسی سے محبت ہو تو چاہئے کہ اسے اطلاع کر دے اس لئے میں یہ تعمیل ارشاد نبویؐ تم سے کہتا ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔" یہ مولانا کا ہر ملاقات میں معمول رہا اور کبھی ان کے خلاف نہ ہوا۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے تخلیے میں یوں کہا: "میں بیعت ہوں مولانا محمدؒ یعقوب دہلوی سے اور مولانا مظفر حسین صاحب سے میں نے تعلیم حاصل کی ان کی تعلیم پر عمل کرنے سے میرے لطائف ستہ آٹھ دن میں ایسے پھرنے لگے جیسے پھرکی پھرتی ہے لیکن مجھے ابتدا سے اتباعِ سنّت کا شوق تھا اور جو اوراد احادیث میں وارد ہوئے ہیں ان کا بہت اہتمام کرتا ہوں، اس لئے مجھے اعمالِ مشائخ سے کم دلچسپی تھی کبھی دس دن میں کبھی پندرہ دن میں مراقبہ وغیرہ کر لیا کرتا تھا یہ میری حالت ہے اور اب میری ضعیفی کا وقت ہے میں چلتا ہوں جناب مجھے کچھ تعلیم فرمائیں۔" حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا: "جو اعمال آپ کرتے ہیں ان میں آپ کو مرتبۂ احسان حاصل ہے مزید تعلیم کی ضرورت نہیں، کیونکہ مرتبۂ احسان حاصل ہونے کے بعد اشغالِ صوفیہ میں مشغول

Marfat.com

ہونا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص گلستانِ بوستان پڑھ لینے کے بعد کریما شروع کردے' چنانچہ آپ کیلئے اعمالِ مشائخ میں اشتغال تضیعِ اوقات اور معصیت ہے۔ مولانا محمد اسمٰعیل کی آخر میں یہ حالت تھی کہ قرآنِ مجید کی تلاوت اور درود میں شب و روز گزرتے۔ پرانی تمنا یہ بھی تھی کہ بکریاں چراتا رہوں اور قرآن پڑھتا رہوں۔ رات کو اس کا خاص اہتمام تھا کہ گھر والوں میں سے کوئی نہ کوئی ضرور جاگتا رہے۔ بارہ ایک بجے تک منجھلے صاحبزادے مولانا اسمٰعیل بیدار ہو جاتے اور مولانا یحیٰی سو جاتے۔ پچھلے پہر بڑے صاحبزادے مولانا محمدؒ صاحب کو جگا دیتے۔ مولانا اسمٰعیل کی اہلیہ صفیہ بی بی بھی قرآن کی حافظہ تھیں اور وہ بھی اتنا اچھا یاد تھا کہ کبھی متشابہ نہ لگتا۔ ایک ہفتے میں قرآن مجید پورا کر لیتی تھیں اس کے علاوہ درود اور اسم ذات اور ایک منزل قرآن کی تلاوت روزانہ کا معمول تھا یہی نہیں 'اس گھرانے کی سب بیبیوں کا یہی عالم تھا۔ مولانا ابو الحسن ندوی لکھتے ہیں: "گھر میں بیبیاں عام طور پر نوافل میں اپنے اپنے طور پر قرآن مجید پڑھا کرتی تھیں اور عزیزوں مردوں کے پیچھے تراویح و نوافل میں سنتی تھیں۔ رمضان المبارک میں قرآن مجید کی عجب بہار ہوتی گھروں میں جا بجا قرآن کی تلاوت ہوتی اور دیر تک اس کا سلسلہ جاری رہتا عورتوں کو اتنا ذوق اور علم تھا کہ قرآن مجید پڑھ پڑھ کر مزہ لیتیں اور نماز کے بعد اپنے مقامات کا ذکر کرتیں۔ نمازوں میں ایسی محویت اور استغراق تھا کہ بسا اوقات بعض بیبیوں کو گھر میں پردہ کرانے اور کسی حادثے وغیرہ میں لوگوں کے آنے جانے کا احساس تک نہ ہوتا۔ قرآن شریف ترجمہ واردو تفسیر مظاہر حق مشارق الانوار' حصن حصین' یہ کتابیں عورتوں کا منتہیانہ نصاب تھا اس خاندان کا یہ عام رواج تھا کہ گھر کے باہر اور اندر کی مجلسیں حضرت احمد شہید اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے خاندان کے قصوں اور چرچوں سے گرم رہتیں۔ ان بزرگوں کے واقعات مردوں اور عورتوں کی زبانوں پر تھے تائیں اور گھر کی بیبیاں بچوں کو طوطے مینا کے قصوں کے بجائے یہی روح پرور واقعات سناتیں۔"

مولانا محمدؒ اسمٰعیل کی طبیعت اتنی صلح کل واقع ہوئی تھی کہ کسی کو آپ کی کوئی شکایت نہ تھی۔ بے ہمہ ایسے تھے کہ اللہ نے باہمہ بنا دیا تھا آپ کی للّٰہیت' خلوص اور بے نفسی ایسی آشکار تھی کہ دہلی کی مختلف الخیال جماعتیں جو اس زمانے میں ایک دوسرے سے سخت متوحش اور متنفر تھیں ان کے پیشواؤں کو مولانا محمدؒ اسمٰعیل پر یکساں اعتماد اور آپ کی ذات سے بلا اختلاف عقیدت تھی۔ میوات سے مولانا کا تعلق بھی آپ کی حیات میں شروع ہوا اس کی تاریخ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ اس فکر میں نکلے کہ کوئی مسلمان آتا جاتا نظر پڑے' تو اسے مسجد میں لے آئیں اور اس کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ لیں۔ چند مسلمان نظر آئے ان سے پوچھا کہاں جاتے ہو؟ انہوں نے کہا: "مزدوری کیلئے" پوچھا: "کیا مزدوری ملے گی؟" انہوں نے مزدوری بتائی۔ مولانا نے فرمایا: "اگر اتنی مزدوری یہیں مل جائے تو پھر جانے کی ضرورت۔" انہوں نے منظور کر لیا۔ آپ انہیں مسجد میں لے آئے۔ نماز سکھانے اور قرآن پڑھانے لگے۔ یومیہ مزدوری انہیں دے دیتے اور انہیں پڑھنے اور سیکھنے میں مشغول رکھتے۔ چند دنوں بعد ا

Marfat.com

لوگوں کو نماز کی عادت پڑ گئی یہ بنگلے والی مسجد کے مدرسے کی بنیاد تھی اور یہ پہلے طالبعلم تھے اس کے بعد دس بارہ میواتی طالبعلم برابر مدرسے میں رہتے اور ان کا کھانا مرزا الٰہی بخش کے ہاں سے آتا تھا۔

4 شوال 1315ھ کو مولانا محمدؒ اسمٰعیل صاحب نے انتقال فرمایا۔ "غفرلہٗ" تاریخ وفات ہے۔ مقبولیتِ عامہ کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جنازے کے ساتھ چلنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ اگرچہ اس کے دونوں طرف بلّیاں بندھی ہوئی تھیں تاکہ لوگوں کو کاندھا دینے میں سہولت ہو، مگر اس کے باوجود بہت سے لوگوں کو دہلی سے بستی نظام الدّین تک ساڑھے تین میل کے سفر میں کاندھا دینے کا موقع نہ ملا۔ ہجوم اور کثرتِ افراد کے باعث بار بار جنازے کی نماز پڑھی گئی جس کی وجہ سے دفن میں تاخیر ہوئی اس عرصے میں ایک صاحب اور اک بزرگ نے دیکھا کہ مولانا محمدؒ اسمٰعیل صاحب فرماتے ہیں: "مجھے جلدی رخصت کر دو، میں بہت شرمندہ ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کے ساتھ میرے انتظار میں ہیں۔"

مولانا محمدؒ اسمٰعیل صاحب کے تین بیٹے تھے پہلی بیوی سے مولانا محمدؒ صاحب اور دوسری بیوی سے مولانا محمدؒ یحییٰ اور مولانا محمدؒ الیاس، مولانا نے اپنے بیٹوں کی تعلیم وتربیّت پر خاص توجہ دی۔ اخلاق و کردار سنوارنے پر زور تھا۔ مولانا محمدؒ یحییٰ نے سات برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا خود کہتے ہیں: "والد صاحب کی طرف سے حکم تھا کہ جب تک پورا قرآن شریف ختم نہ کر لو گے روٹی نہ ملے گی، لہٰذا میں عموماً ظہر سے قبل پورا قرآن ختم کر لیا کرتا اور کھانا کھا کر چھٹی کے وقت اپنے شوق سے فارسی پڑھا کرتا۔" بچپن ہی سے اس قدر ذہین وفطین تھے کہ اکثر کتابیں خود ہی پڑھیں کسی استاد کی مدد کی نوبت نہ آئی۔ ارشاد فرماتے تھے کہ مسلم مجھے ازبر یاد تھی اور تسبیح لے کر میں نے اس کی عبارت دو دو سو مرتبہ پڑھی ہے۔ عربی ادب میں اتنی مہارت تھی کہ نظم ونثر بلا تکلّف لکھ لیتے تھے اور ادب و منطق کے علاوہ مولانا محمدؒ یحییٰ نے باقی کتابیں دہلی کے مدرسہ حسین بخش میں پڑھیں اور ارادہ تھا کہ حدیث شریف گنگوہ جا کر مولانا رشید احمد کی خدمت میں پڑھیں گے لیکن جب مدرسے میں سالانہ امتحان کا وقت آیا تو کارکنانِ مدرسہ نے آپ کا نام بھی بخاری شریف کے امتحان میں لکھ دیا، حالانکہ بخاری کا ایک سبق بھی آپ نے نہیں پڑھا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر آپ فکر مند ہوئے لیکن آپ کے والد مولانا محمدؒ اسمٰعیل نے فرمایا: "محمدؒ یحییٰ کیا حرج ہے ابھی امتحان میں پانچ مہینے باقی ہیں، اس عرصے میں بخاری پڑھ لو۔" چنانچہ مولانا یحییٰ فرماتے ہیں: "وہ پانچ مہینے میں نے حضرت خواجہ نظام الدّین اولیاء کے مزارِ پُرانوار کے ایک حجرے میں اس طرح گزارے کہ خود مسجد کے رہنے والوں کو معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں، سوائے ان دو لڑکوں کے جن کے ذمے میری روٹی اور وضو کا پانی لانا تھا، چنانچہ اسی دوران میں کاندھلہ سے میرے نکاح کا تار آیا، تو لوگوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ یحییٰ خاصی مدّت سے یہاں نہیں ہے اور نہ معلوم کہاں چلا گیا۔ غرض اس عرصے میں، میں نے بخاری شریف سیرت ابنِ ہشامؒ طحاوی ہدایہ اور فتح القدیر اس اہتمام سے دیکھیں کہ مجھے خود حیرت ہے۔ اتفاق سے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری ممتحن تجویز

Marfat.com

ہوئے اور تشریف لائے تو میرے جوابات دیکھ کر فرمایا: "ایسے جوابات تو مدرس بھی نہیں لکھ سکتا۔"

1311ھ میں مولانا یحییٰ گنگوہ گئے اور مولانا رشید احمد سے حدیث پڑھی۔ آہستہ آہستہ مولانا رشید احمد گنگوہی سے حد درجہ محبت اور عقیدت ہو گئی اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب تک آپ گنگوہ میں رہے۔ حضرت گنگوہی کے خادمِ خاص بن کر رہے حضرت کی ظاہری بینائی جاتی رہی تھی اور مولانا محمد یحییٰ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ یحییٰ اندھے کی لاٹھی ہے اگر آپ تھوڑی دیر کیلئے بھی کہیں چلے جاتے تو حضرت گنگوہی بے چین ہو جاتے۔ غرض بارہ برس تک ان کی خدمت میں رہے۔ اور پھر ان سے بیعت ہو کر ذکر و شغل بھی شروع کر دیا۔ حضرت کے وصال کے بعد مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے وہ عمامہ جو حضرت گنگوہی کے سر پر حاجی امداد اللہ مہاجر مکی نے باندھا تھا اور جسے اصل پیچوں پر آپ نے سی لیا تھا' مولانا محمد یحییٰ کے سر پر یہ کہہ کر رکھ دیا: "اس کے مستحق تم ہو۔ میں آج تک اس کا محافظ اور امین تھا۔ الحمدللہ! آج حق' حق دار کے حوالے کر کے بارِ امانت سے سبکدوش ہوتا ہوں اور تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ کوئی طالبعلم آئے تو اسے سلاسلِ اربعہ میں بیعت کرنا اور اللہ کا نام بتانا۔"

مولانا محمد یحییٰ کے فرزندِ ارجمند شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا اپنے والد کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان کی زندگی اس قدر سادہ تھی کہ لباس یا طرزِ معاشرت سے کوئی انہیں مولوی بھی نہیں سمجھتا تھا۔ کپڑے زیادہ تر گھر میں دھولیا کرتے تھے کھانے پینے کا ذوق بھی سادہ تھا۔ کبھی گھر میں کوئی خاص چیز کھانے کی فرمائش نہ کرتے۔ جو سامنے رکھ دیا جاتا' رغبت سے کھا لیتے ایک مرتبہ حضرت گنگوہی کے ہاں کہیں سے خمیری روٹی اور قورمہ آیا تناول فرما کر حضرت خانقاہ میں تشریف لائے' اور مولانا محمد یحییٰ سے فرمایا: "میاں مولوی یحییٰ تمہیں بھی کچھ بھاوئے؟" انہوں نے عرض کی: "حضرت ایک ارہر کی دال بھاتی نہیں باقی جو کچھ ملے پسند ہے۔" یہ سن کر حضرت گنگوہی ہنس پڑے اور جرأت کا شعر بے ساختہ پڑھا۔

کیا کہوں جرأت کو کچھ بھاتا نہیں
کچھ تو بھایا ہے جو کچھ بھاتا نہیں

مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے آپ کو مدرسہ مظاہر العلوم بلوالیا تھا جہاں آپ نے درسِ حدیث دیا اور ایک پیسہ تنخواہ نہ لی' بلکہ مولانا خلیل احمد صاحب 1328ھ میں حج پر گئے تب قائمقام بن کر مدرسے میں درس دیا۔ ہماری تنخواہ مولانا خلیل احمد کے گھر پہنچا دیا کرتے تھے ساڑھے پانچ سال تک اسی طرح پڑھایا اور یہ صرف مولانا محمد یحییٰ کی امتیازی شان ہے۔ 1334ھ میں آپ نے وفات پائی۔

مولانا محمد الیاس' مولانا محمد یحییٰ کے چھوٹے بھائی تھے۔ 1300ھ میں پیدا ہوئے الیاس اختر تاریخی نام ہے۔ مولانا الیاس کا بچپن اپنے ننھیال کاندھلہ میں اور والد مولانا محمد اسمٰعیل کے پاس بستی نظام الدین میں گزرا۔ خاندان کے دوسرے بچوں کی طرح آپ نے بھی بچپن ہی میں قرآن مجید حفظ

Marfat.com

کرلیاتھا۔ حفظِ قرآن شریف کا خاندان میں ایسا رواج تھا کہ مسجد کی ڈیڑھ صف میں مؤذن کے سوا کوئی غیر حافظ نہ ہوتا۔ امی بی مولانا الیاس پر بے حد شفیق تھیں۔ فرمایا کرتی تھیں: "اختر! مجھے تجھ سے صحابہؓ کی بُو آتی ہے۔" کبھی پیٹھ پر محبت سے ہاتھ رکھ کر کہتیں "کیا بات ہے کہ تیرے ساتھ مجھے صحابہؓ کی سی صورتیں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں"۔ مولانا الیاس میں ابتدا سے صحابہؓ کرام کی سی والہانہ شان کی ایک ادا اور ان کی دینی بے قراری کی ایک جھلک موجود تھی جسے دیکھ کر شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب فرمایا کرتے تھے کہ میں جب مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں 'تو مجھے صحابہؓ یاد آجاتے ہیں۔ دین کی حمیت آپ کی فطرت میں ودیعت تھی۔ دینی ماحول اور بزرگوں کے واقعات و روایات نے اس چنگاری کو ہوا دی آپ کے ہم عمر و ہم مکتب ریاض الاسلام صاحب کاندھلوی کی روایت ہے کہ جب ہم مکتب میں پڑھتے تھے ایک دن مولوی الیاس لکڑی لے کر آئے اور کہا: "آؤ' میاں ریاض چلو' نمازیوں پر جہاد کریں۔" شوال 1311ھ میں آپ کے بھائی مولانا محمد یحییٰ جب گنگوہ چلے گئے اور وہیں قیام اختیار کیا اس دوران مولانا الیاس کبھی اپنے والد کے پاس نظام الدین میں اور کبھی ننھیال کاندہلہ چلے جاتے تھے اور یوں جیسی ان کی تعلیم ہونی چاہئے تھی نہیں ہو رہی تھی' چنانچہ کچھ عرصے بعد مولانا یحییٰ آئے اور چھوٹے بھائی کو بھی اپنے ساتھ گنگوہ لے گئے اس زمانے میں مولانا الیاس کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی اور جب مولانا رشید احمد گنگوہی نے وفات پائی تب بیس سال کے تھے گویا دس برس کی مدت مولانا الیاس کاندھلوی نے مولانا گنگوہی کی صحبت میں گزاری اور بالآخر انہی سے بیعت کا شرف بھی حاصل کیا۔

مولانا الیاس فرماتے تھے کہ جب میں اللہ کا ذکر کرتا تو مجھے اپنے اوپر ایک بوجھ سا محسوس ہوتا۔ حضرت گنگوہی سے کہا تو وہ تھرا گئے اور فرمایا کہ مولانا محمدؒ قاسم نانوتوی نے بھی یہی شکایت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے فرمائی تھی تو حاجی صاحب نے کہا تھا مولوی قاسم اللہ آپ سے کوئی کام لے گا۔ جذب و شوق نے جس کی لاغری اور قویٰ کی کمزوری کے باوجود ان سے اتنا عظیم الشان اور حیرت انگیز کام کرا دیا جو ان کی جسمانی حالت سے ذرا مطابقت نہ رکھتا تھا۔ ذکر و اشغال' نوافل و عبادات کے ساتھ شروع سے مجاہدانہ جذبات بھی سینے میں موجزن تھے اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ نے مولانا محمدؒ حسین صاحب کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد بھی کی تھی۔ شیوخ و اکابر کے حلقے میں بھی امتیاز و اعزاز کی نظر سے دیکھے جاتے۔ آپ کا خشوع و تقویٰ سب کو معلوم تھا کہ اس لئے کبھی کبھی اکابر کی موجودگی میں امامت کیلئے آپ ہی کو بڑھایا جاتا۔ کچھ عرصہ مولانا الیاس نے مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں کتابیں بھی پڑھائیں۔ اور 1333ھ میں حج بھی کیا اپنے بڑے بھائیوں میں مولانا محمدؒ اور مولانا محمدؒ یحییٰ کی وفات کے بعد آپ مستقل طور پر بستی نظام الدین میں رہنے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ اپنے والد کے قائم کردہ مدرسے کو آباد رکھیں اور قرب و نواح میں دین کی تبلیغ کا سلسلہ جاری رہے۔ اس زمانے میں بستی نظام الدین کے آس پاس کوئی آبادی نہ تھی۔ مسجد کے ارد گرد جنگل ہی جنگل تھا۔ مشکل ہی سے کسی انسان کی صورت دکھائی دیتی۔ چند میواتی اور غیر میواتی

Marfat.com

غریب طالبعلم بس یہ مدرسہ و مسجد کی کل کائنات تھی مولانا الیاس کی کوئی مستقل آمدنی نہ تھی توکّل اللہ قناعت اور ان کی ہمتِ عالی اصل سرمایہ تھا۔ بڑی تنگی اور سختی سے گزر بسر ہوتی۔ اکثر فاقے کی نوبت آ جاتی' مگر مولانا کے ابرو پر بل نہ آتا۔ بعض اوقات اعلان فرما دیتے کہ آج کھانے کو نہیں ہے جس کا جی چاہے رہے اور جس کا جی چاہے چلا جائے' لیکن طلبہ کی ایسی روحانی تربیت ہو رہی تھی کہ کوئی جانے کو تیار نہ ہوتا بعض اوقات جنگلی پھلوں' گولر وغیرہ سے پیٹ بھر لیا جاتا طلبہ خود جنگل سے لکڑی لا کر روٹی پکاتے اور چٹنی سے کھاتے۔ یہ زمانہ مولانا الیاس کے بڑے مجاہدے اور ریاضت کا تھا خدمت کی طرف سے خاص میلان تھا۔ حدیث کا درس دیتے تو پہلے وضو کرتے پھر دو رکعت نماز پڑھتے اور فرماتے کہ حدیث کا حق تو اس سے زیادہ ہے حدیث پڑھاتے وقت کوئی معزّز آدمی آ جاتا تو درس چھوڑ کر اس کی طرف التفات نہ فرماتے۔ آہستہ آہستہ میوات کے وسیع وعریض علاقے میں دینِ حق کی تبلیغ اصلاح و تعلیم کے کام کا آغاز کیا اور اسے اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک اس طرح سرانجام دیا کہ آج پوری دنیا میں تبلیغی جماعت کے افراد پھیلے ہوئے ہیں اور مولانا الیاس کے مشن کی تکمیل میں دل وجان سے مصروف ہیں۔

مولانا محمدؒ اسمٰعیل صاحب کاندھلوی کے پوتے' مولانا محمدؒ یحیٰی کے فرزند اور مولانا الیاس کے بھتیجے مولانا محمد زکریا صاحب جو دنیائے اسلام میں شیخ الحدیث کے باوقار نام سے معروف ہیں' 11 رمضان المبارک 1315ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا حیات تھے۔ انہیں جب پوتے کے پیدا ہونے کی خوش خبری دی گئی تو ان کی زبان سے بے اختیار نکلا: "ہمارا بدل آ گیا" چنانچہ اس مہینے میں مولانا اسمٰعیل نے رحلت فرمائی اور حقیقت ہے کہ دادا نے جس پوتے کو اپنا بدل فرمایا تھا اور وہ اس درجے کا بدل ثابت ہوا کہ اسے سلوک کے اہم اجزا میں سے تجرّد عن الخلائق اور یکسوئی کی نعمتیں بغیر کسی ریاضت کے بچپن ہی میں حاصل ہو گئی تھیں' اور بچپن بھی کیا تین سال کی عمر تھی۔ زکریا کے ذہن سے یہ خیال خارج ہو گیا کہ دنیا میں کوئی چیز میری بھی ہے اس عجیب وغریب واقعے کا ذکر شیخ الحدیث نے خود ان الفاظ میں کیا۔ "میں تین سال کا تھا والدہ صاحبہ نے لال خوبصورت کپڑے کا تکیہ بنایا تھا اور وہ تکیہ مجھے اتنا محبوب تھا کہ بجائے سر کے وہ میرے سینے پر رہا کرتا تھا میں اسے پیار کرتا اور کبھی سینے سے چمٹاتا۔ ایک روز والد صاحب نے آواز دے کر فرمایا: "زکریا! مجھے تکیہ دے دے مجھ میں محبتِ پدری نے جوش مارا اور اپنے نزدیک انتہائی ایثار اور گویا دل پیش کر دینے کی نیّت سے میں نے کہا: "اپنا تکیہ لاؤں۔" فرمایا: "وہ لے آ" میں انتہائی ذوق وشوق میں کہ ابّا جان اس نیازمندی اور سعادت مندی پر بہت خوش ہوں گے۔ دوڑا ہوا گیا۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر دائیں سے میرے منہ پر ایسا زور سے تھپّڑ رسید کیا کہ آج تک تو اس کی لذّت بھولا نہیں اور مرتے دم تک امید نہیں بھولوں گا پھر یوں فرمایا: "ابھی سے اپنے باپ کے مال پر یوں کہتا ہے کہ اپنا لاؤں۔ کچھ کما کر ہی کہتا کہ اپنا لاؤں۔ اللہ کا شکر اور فضل وکرم ہے کہ اس کے بعد

Marfat.com

جب کبھی یہ واقعہ یاد آ جاتا ہے تو دل میں یہ مضمون پختہ ہوتا چلا ہے کہ اپنا اس دنیا میں کوئی مال
نہیں۔" اندازہ فرمایئے کہ جس کا تزکیہ بچپن ہی کی تربیت میں ہو چکا ہو ———
اس کی طویل عمر کی ریاضت و قوت نسبت اور روحانی عروج کا کیا حال ہو گا یہی بات حضرت مولانا
عبد القادر رائے پوری" یوں کہا کرتے تھے کہ ان لوگوں کی جہاں سے ابتدا ہوتی ہے ہماری انتہا ہوتی ہے۔
زکریا کی عمر جب پانچ سال کی ہوئی ان کے والد مولانا محمد یحییٰ کے ایک شاگرد نے خواب دیکھا کہ کسی شخص
نے زکریا کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ مولانا یحییٰ نے یہ تعبیر دی کہ اس بچے کو ثبات فی الدین نصیب ہو گا'
چنانچہ زکریا کی عمر جب تیرہ سال ہوئی تو خود ان کے
ایک خواب کی تعبیر میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے فرمایا: "عنایتِ الٰہی تمہارے شاملِ حال ہے۔"
مولانا یحییٰ نے فرزندِ ارجمند کی تعلیم و تربیت اس طریق سے شروع کی کہ رُورعایت اور محبت و شفقتِ
پدری کو دخل انداز نہ ہونے دیا۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ جو بچہ قطبِ عالم حضرت گنگوہی" کی گود میں
کھیلا ہو اور جس کا بچپن شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری' مولانا خلیل احمد سہارنپوری شیخ الہند مولانا
محمود الحسن اور مولانا اشرف علی تھانوی جیسی عظیم شخصیتوں کی خصوصی توجہات میں گزرا ہو اس کے تعلق
مع اللہ کا درجہ کس قدر بلند ہو گا شیخ الحدیث خود فرماتے ہیں: "مجھے کبھی اپنے بچپن میں اچھا کپڑا پہننا یاد
نہیں' اس زمانے میں ہر جمعے کو سر منڈانا بھی ضروری تھا کہ لمبے بال بھی زینت ہیں۔ کاندھلہ میرا وطن تھا
لیکن عمر بھر میں کبھی تین مرتبہ کے علاوہ ایک دو شب سے زیادہ قیام یاد نہیں۔ بہت کم سنی ہی میں
والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ابتدائی کتابیں شروع کرا دی تھیں اور سبق یاد نہ ہوتا تو مرمت ہوتی۔ خود
فرماتے تھے: "زکریا اگر تم پٹتے پٹتے مر گیا تو شہید ہو گا مجھے ثواب ہو گا' خود سوچئے کہ جس باپ کا نظریہ
اپنے اکلوتے فرزند کے بارے میں یہ ہو وہ تعلیم و تربیت اور اخلاق و کردار کی نگہبانی میں کیا کسر چھوڑے
گا۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ اس نابکار کو بزرگی کا جوش ہوا مغرب کے بعد لمبی نفلوں کی نیت باندھ لی ابا جان
نے آ کر زور سے تھپڑ مارا اور کہا: "سبق یاد نہیں کیا جاتا؟" میرے چچا مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ اس زمانے
میں لمبی لمبی نفلیں پڑھا کرتے تھے۔
اس وقت تو مجھے ابا جان پر بہت غصہ آیا کہ خود تو نفلیں پڑھتے نہیں اور دوسروں کو بھی نہیں پڑھنے
دیتے۔ مگر جلدی سمجھ میں آ گیا کہ ان کی بات صحیح تھی۔ وہ نفلیں بھی علم سے روکنے کے لئے
شیطانی حربہ تھا۔
پندرہ سال کی عمر تھی کہ مولانا یحییٰ نے زکریا کو ظاہری تعلیم کی دولت سے مالا مال کر دیا اور مزید تین
برس میں وہ مقاماتِ باطنی بھی طے کرا دیئے جو اوروں کو برسوں کی ریاضت و مجاہدے کے بعد بھی نصیب
نہیں ہوتے۔ زکریا کا سن اٹھارہ برس کا تھا کہ مولانا یحییٰ نے حضرت شاہ عبد الرحیم رائے پوری کو ایک خط
میں لکھا۔ "اب تک عزیز زکریا کی بیڑی میرے پاؤں میں زنجیر بنی ہوئی تھی کہ میں اس کی وجہ سے کہیں آ جا

Marfat.com

نہیں سکتا تھا اللہ کا شکر ہے اب اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔ "

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہوئے تو رہی سہی کمی پوری ہو گئی مولانا خلیل احمد صدر مدرس تھے انہوں نے زکریا کو بڑی شفقت سے پڑھایا۔ دوسرے اساتذہ میں مولانا عبد اللطیف ناظم مدرسہ مولانا عبد الوحید سنبھلی، مولانا محمدؒ الیاس اور مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ ان اساتذہ سے حدیث منطق، فلسفہ صرف و نحو ادب فقہ اور ریاضی وغیرہ علوم وفنون کی تعلیم پائی اس کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم ہی میں درس وتدریس کی خدمت مل گئی اور پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ قرار پائی۔ مولانا شاہ عبد الرحیم رائے پوری نے مدرسے میں سفارش کی کہ زکریا کی تنخواہ پندرہ روپے کم ہے۔

کم از کم پچیس روپے ضرور ہونی چاہئے اور دوسری طرف زکریا سے شاہ صاحب نے از رہِ شفقت ارشاد فرمایا "مدرسے کی تنخواہ خطرے کی چیز ہے، جب اللہ توفیق دے چھوڑ دیجیو " چنانچہ شاہ صاحب ہی کی توجہ اور شفقت کا اثر تھا کہ کچھ عرصے بعد اللہ نے تنخواہ چھوڑنے کی توفیق عطا فرما دی۔

اسی زمانے میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری سے بیعت کا شرف بھی حاصل ہو گیا 1334ھ میں زکریا کے والد یحیٰ نے وفات پائی۔ اس وقت زکریا کی عمر انیس برس تھی۔ والد نے آٹھ ہزار کا قرض چھوڑا تھا، غمزدہ بیٹے نے بڑی مردانگی اور بلند ہمتی کا ثبوت دیا، جن جن لوگوں کا قرض مولانا یحیٰ کے ذمے تھا۔ ان کو خط لکھ دیئے کہ مرحوم قرضے سے بری ہیں، وہ قرضہ زکریا ادا کرے گا۔

دس برس کی مدت میں حد درجہ تنگی ترشی اٹھا کر والد کا قرضہ ادا کر دیا اسی برس مولانا سہارنپوری حج سے واپس آئے تو ان کے حکم کی تعمیل میں زکریا نے بخاری و ترمذی دوبارہ ان سے پڑھیں اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ خود شیخ الحدیث فرماتے ہیں: "جہاں تک مجھے یاد ہے شب و روز میں دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ سونا میسر نہ آیا تھا۔ " ساری رات شرحِ حدیث کا مطالعہ کرتے اسی محنت اور انہماک، فطری سعادت اور خوش بختی نے حضرت خلیق احمد سہارنپوری کی نظرِ انتخاب کو اپنی طرف متوجہ کیا اور یوں زکریا کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور سچ تو یہ ہے کہ شیخ و مرشدِ کامل کی اسی نگاہ نے زکریا کو قرب و اختصاص بخشا اور بالآخر شیخ الحدیث بنا دیا۔

مولانا خلیل احمد سہارنپوری نے 1325ھ میں ابو داؤد کی شرح بذل المجہود کے عنوان سے لکھنے کا ارادہ فرمایا اور مولانا زکریا کو اس مقدس کام میں اپنے ساتھ شامل کر لیا اس دوران میں وہ مدرسے میں طالبعلموں کو اونچی کتابیں بھی پڑھاتے رہے حالانکہ عمر صرف بیس برس تھی بعض اوقات ان طلبہ کو بھی درس دیا جو حدیث کے اسباق میں ان کے ہم درس تھے یہاں تک کہ ایک دن مدرسے کے ناظم مولانا عنایت الٰہی صاحب نے بھی داد دیتے ہوئے فرمایا: "مولوی زکریا تم نے میری آنکھیں نیچی کر دیں۔ " دو سال کے اندر اندر مولانا زکریا کو مقاماتِ حریری، سبعہ، معلقہ ہدایہ اولین، حماسہ، بخاری اور پھر مشکوٰۃ شریف بھی پڑھانے کو دی گئی اور ان کی کتابوں کے پڑھانے میں ان سے غیر معمولی قابلیت قوتِ مطالعہ

Marfat.com

اور فنی مناسبت کا اظہار ہوا۔ ظاہری درس و تدریس اور اپنے مرشد مولانا خلیل احمد کے زیر سایہ ابو داؤد کی شرح تیار کرنے کے دوران میں باطنی ترقیات کا سلسلہ بھی جاری رہا اور انہوں نے جس سرعت سے سلوک کے مدراج طے کئے وہ انہی کا حصہ تھا۔ خود مولانا زکریا نے خود کو مٹا کر ہر طرح اپنے آپ کو شیخ سہارنپوری کے سپرد کر دیا تھا۔

1335ھ میں ہی مولانا زکریا کا نکاح کاندہلہ میں مولانا رؤف الحسن کی صاحبزادی سے ہوا مولانا رؤف الحسن کی ایک صاحبزادی مولانا زکریا کے چچا مولانا الیاس کے نکاح میں تھیں اس طرح مولانا زکریا اور مولانا الیاس آپس میں ہم زلف بھی تھے۔ 1338ھ میں مولانا سہارنپوری نے پھر حج کا عزم کیا اور اس مرتبہ مولانا زکریا بھی اپنے شیخ کے ساتھ حج پر گئے۔ رمضان المبارک میں پوری پوری رات حرم شریف میں عبادت کرتے ہوئے کٹتی تھی۔ شوال میں مولانا زکریا مدینہ منورہ حاضر ہوئے وہاں صرف تین دن کا قیام کا ارادہ تھا مگر بعض اسباب کی بنا پر ایک ماہ کا قیام رہا اور بے شمار انعاماتِ الٰہی سے سرفراز ہو کر ہندوستان واپس آئے۔ انہی دنوں کرنال میں نواب عظمت علی خان نے ایک بڑا تبلیغی دار العلوم قائم کیا اور مولانا سر رحیم بخش صاحب کے ذریعے خواہش ظاہر کی کہ حدیث پڑھانے کیلئے مولانا زکریا اس دار العلوم میں آ جائیں۔ مولانا رحیم بخش مرحوم ریاست بہاولپور کے صدر کونسل اور ایجنٹ تھے اور ان کا تعلق گنگوہ رائے پور اور سہارنپور سے خادمانہ اور مخلصانہ تھا۔ وہ مظاہر العلوم سہارنپور کے سرپرستوں میں بھی شامل تھے۔ ان کی پیش کش تھی ہر سال تین ماہ کی رخصت بلا وضع تنخواہ کھانے اور رہائش کا بندوبست مفت اور تنخواہ ماہانہ تین سو روپے' اس وقت مولانا زکریا مظاہر العلوم سے صرف بیس روپے ماہوار پاتے تھے۔ ظاہر ہے تین سو روپے ماہانہ کی پیش کش بہت بڑی تھی لیکن ایک نوجوان عالم کیلئے جو ذہانت کے جوہر سے آراستہ اور حدیث و ادب میں شہرت یافتہ تھا ایک زبردست آزمائش بھی تھی مگر توفیقِ الٰہی نے دستگیری کی اور جسے الحدیث کے لقب میں مقبولِ عام ہونا تھا

اور جس سے اللہ کو حدیث کی خدمت طلبائے علومِ دینیہ کی تربیت اور ایک عالم گیر دینی تحریک کی سرپرستی اور مشائخ عصر کی جانشینی کا اہم کام لینا تھا اسے اس معاملے میں صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی گئی اور مولانا زکریا نے نہایت سادگی سے یہ پیش کش قبول کرنے سے معذرت کر دی اگر وہ اثبات میں فیصلہ کرتے تو ان کی زندگی میں نقشہ ہی دوسرا ہوتا ہے اور آج شاید یہ سطور لکھنے کی نوبت نہ آتی۔

1344ھ میں مولانا سہارنپوری نے پھر حج کا قصد فرمایا اور مولانا زکریا کو دوسری بار اپنے شیخ و مرشد کی رفاقت میں دوسرا حج نصیب ہوا حج کا یہ سفر استاد و مرشد کی مسلسل و ہمہ وقت رفاقت' ایک عالی استعداد سرتاپا محبت و اطاعت مسترشد کیلئے جس کے سفر کا اصل مقصد ہی شیخ کی خدمت و اعانت و استفادہ تھا جیسی روحانی و باطنی ترقیاتی اور حصولِ کمالات کا ذریعہ بنا ہوگا اس کا اندازہ کچھ مشکل نہیں۔ مولانا زکریا مدینہ طیبہ کے طویل قیام میں بھی اپنے شیخ کی خدمت میں حاضر رہنے اور "بذل المجہود" کی تالیف میں مدد دینے کے

Marfat.com

علاوہ کسی مشغلے اور دلچسپی سے سروکار نہ رکھا۔اس کام کے ساتھ ساتھ انہوں نے امام مالکؒ کی مشہور کتاب مؤطا کی شرح بھی لکھنی شروع کی جو "اوجز المسالک" کے نام سے بعد میں چھ جلدوں میں مکمل ہوئی یہ کتاب مسجدِ نبویؐ میں عین مواجہ شریف کے قریب لکھی جاتی تھی۔

مولانا سہارنپوری کا ارادہ یہ تھا کہ اب ہندوستان واپس نہ جائیں گے اور مدینہ طیبہ کی خاک ہی کو مرتے دم تک عزیزِ جان بنائے رکھیں گے خود فرماتے تھے کہ "اب تو میں بقیع میں مدفون ہونے کی نیت سے آیا ہوں"۔ مولانا زکریا نے بھی اپنے شیخ کے ساتھ مستقل طور پر مدینے ہی میں رہنے کی اجازت لینا چاہی مگر مولانا سہارنپوری نے منظور نہ فرمایا اور مولانا زکریا کیلئے "شیخ الحدیث" اور "نائب ناظم" کے منصب پر تحریر لکھ کر ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کو بھجوائی مدینے سے رخصت کرنے سے پہلے مولانا سہارنپوری نے چاروں سلسلوں میں بیعت اور ارشاد کی عام اجازت بھی عطا فرمائی اور اس کیلئے بڑا اہتمام کیا اپنے سر سے عمامہ اتار کر مولانا سید احمد صاحب مدنیؒ برادرِ بزرگ مولانا حسین احمد مدنی کو دیا کہ وہ مولانا کے سر پر باندھیں جس وقت وہ عمامہ شیخ الحدیث مولانا زکریا کے سر پر رکھا گیا ان پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ چیخیں نکل گئیں۔ حضرت سہارنپوریؒ بھی آبدیدہ ہو گئے مولانا زکریا نے بعض مجالس میں فرمایا: "عمامہ سر پر رکھتے ہی مجھے اپنے اندر کوئی چیز آتی محسوس ہوئی اس سے میں سمجھا انتقالِ نسبیّت کی شاید یہی حقیقت ہے۔"

حجاز سے واپسی پر آپ ہمہ تن تدریس و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔ ابو داؤد شریف کا درس بھی آپ کے پاس آ گیا تدریس و تصنیف مشاغل کے علاوہ مدرسے کے انتظام میں بھی آپ شریکِ غالب، ناظم صاحب کے قوت بازو اور دست راست تھے۔ مدرسے میں مشائخ عصر اور اکابرِ سلسلہ مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبد القادر رائے پوری، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی جیسے بزرگوں کے علاوہ مولانا فخر الدین پانی پتی اور مولانا اشرف علی تھانوی اور شاہ محمد یٰسین صاحب نگینوں کی بکثرت آمد و رفت رہتی اور شیخ الحدیث سب کے معتمد علیہ، محبوب، مشیر اور محرمِ راز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو فطری جامعیت، اعتدال و توازن، اور بے ہمہ و باہمہ ہونے کی صفت عطا فرمائی، اس کی وجہ سے آپ کی ذات اور آپ کا مستقر اور سب کے لئے نقطۂ جامعہ تھا۔ کلیات سے لے کر جزئیات تک آپ اکثر مشیر و دخیل رہتے

اس کے ساتھ مہمانوں کے ہجوم جو اس مقبولیت کا قدرتی نتیجہ تھے اور واردین اور صادرین کی کثرت سے دسترخوان کی وسعت میں اضافہ ہوتا گیا اور اس نے شیخ الحدیث کی مشغولیت میں اس قدر شدت پیدا کر دی جو بہت سے اکابر کیلئے بھی موجبِ حیرت بن گئی...... ادھر اللہ کا ان کے ساتھ یہ خاص معاملہ رہا کہ جو شیخ و مربی دنیا سے گیا وہ اپنے متعلقین کو خود شیخ کے سپرد کر گیا یا کسی اشارۂ غیبی کی بنا پر یہ لوگ خود شیخ الحدیث کی طرف رجوع کرنے لگے۔ مولانا الیاس صاحب کا معاملہ تو گھر ہی کا تھا لیکن ان سے پہلے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ان کے بعد مولانا مدنیؒ پھر مولانا عبد القادر رائے پوری اور سب سے آخر میں مولانا محمد

Marfat.com

یوسف صاحب کی وفات کے بعد ان سب حضرات کے اکثر اہلِ ارادت اور اہل تعلق نے شیخ الحدیث ہی کو اپنا روحانی سرپرست، مشیر و رہنما اپنے مشائخ کا جانشین اور وارث و امین سمجھا پھر خصوصیت سے مولانا محمد یوسف کی رحلت کے بعد تبلیغی حلقے کا آپ ہی مرجع اور مرکز بن گئے۔ جس نے اب عالمگیر شکل اختیار کر لی ہے اور ہندستان سے متجاوز ہو کر ایک طرف مراکش اور دوسری طرف انڈونیشیا ——————— اور یورپ و امریکہ تک پھیل گیا ہے۔ اس سلسلے کو باقی رکھنے، اسے زمانے کے خطرات اور اس دور کے فتنوں سے بچانے، اس کے مسلک و اصول کی حفاظت، اس کے سرگرم کارکنوں کی دینی نگرانی اور روحانی تکمیل و تربیت کی ساری ذمہ داری کا بوجھ آپ ہی کے کاندھوں پر پڑ گیا تھا۔

تیسرا حج شیخ الحدیث نے 1383ھ میں کیا۔ اس سفرِ حج میں مولانا محمد یوسف بھی آپ کے ساتھ رہے۔ واپسی میں پاکستان بھی کچھ عرصہ قیام رہا اور یہاں کے مہجور و محروم عقیدت مندوں نے سالہا سال سے زیارت کے لئے ترس رہے تھے۔ یہ موقع خداداد نعمت تصور کیا اور شیخ کے سفرِ حج کی برکت سے ان دور افتادہ خدام و محبین کی قسمت بھی جاگ اٹھی انہوں نے پروانوں کی طرح ہجوم کیا۔ چوتھا حج مولانا محمد یوسف کی وفات کے بعد 1386ھ میں ہوا۔ مکہ معظمہ میں قیام حسبِ سابق مدرسہ صولتیہ میں رہا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی زندگی اپنے علمی انہماک، خدمتِ خلق، یکسوئی اور شدید مصروفیت کے اعتبار سے اس بیسویں صدی میں ان علماء سلف کی یادگار تھی جن کا ایک ایک لمحہ عبادت و خدمت اور علم کی نشر و اشاعت کیلئے وقف تھا اور جن کے کارنامے دیکھ کر ان کے اوقات کی برکت، ان کی جفاکشی، بلند ہمتی اور ان کی جامعیت کے سامنے آدمی حیرت کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے ان کی شب و روز کی مصروفیات ایسی تھیں جن سے ایک عامی بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ اللہ والوں کی مصروفیات کیا ہوتی ہیں اور کیا ہونی چاہئیں۔

دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں مخلوق کی خدمت تھی یا اپنے خالق کی اطاعت اور عبادت، نمازِ فجر اول وقت پڑھ کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام فرماتے تھے اور یہی سونے کا ایک وقت تھا۔ دن بھر قرآنِ مجید کا دورہ رہتا عصر کی مجلسیں جمعے کے دن ملتوی رہتیں۔ جمعۃ المبارک کو برسوں سے معمول تھا کہ عصر و مغرب کے مابین دعا میں مشغول اور متوجہ الی اللہ رہا کرتے تھے۔ چوبیس گھنٹے میں برائے نام غذا لیتے۔ مہمانوں کے ساتھ دسترخوان پر شروع سے آخر تک برابر بیٹھتے مگر غور سے دیکھنے والا معلوم کر لیتا کہ شیخ برائے نام شریک ہیں ان کی خوراک اتنی کم ہوتی کہ اس مقدار کے ساتھ اتنی محنت پر تعجب ہوتا، تاہم دسترخوان پر وہ ایسا سماں باندھتے کہ کسی کو پتہ نہ چلنے پاتا کہ کریم النفس اور فراخ دل میزبان خود کس قدر اس کھانے میں شریک تھا۔

جب تک صحت نے ساتھ دیا بلکہ بعض اوقات ضعف اور نقاہت کے عالم میں بھی بخاری شریف کا درس شیخ الحدیث ہی نے دیا اس درس کی کیفیت بھی دیدنی تھی کہ شنیدنی، حدیث کے احترام سنت سے شغف اور ذاتِ نبوی ﷺ سے عشق کی کیفیت کا اثر تمام حاضرین پر پڑتا اور بعض مرتبہ تو پوری مجلس پر ایک

Marfat.com

بجلی سی کوند جاتی خصوصاً ختمِ کتاب اور دعا کے موقع پر تو پیمانہ ہزار وسعت و عالی ظرفی کے باوجود چھلک پڑتا اسی طرح وفاتِ نبوی ؐ کی احادیث پر دامنِ ضبط ہاتھ سے چھوٹ جاتا آنکھیں بے اختیار اشکبار اور آواز گلو گیر ہو جاتی۔

تصنیف و تالیف کی نشست گاہ دیدنی تھی ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں کتابوں کا اس طرح کا ذخیرہ تھا گویا در و دیوار انہی کے ہیں ان کتابوں کے درمیان بمشکل ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ ہوتی۔ شیخ الحدیث جب اپنی جگہ پہنچ جاتے اور ان کتابوں کے درمیان پناہ لیتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں واپس آگیا ہو۔ اگر کسی کو اس وقت کوئی ضروری بات کہنے کیلئے ان کے پاس جانا پڑتا تو بیٹھنے کی جگہ نہ ملتی۔ چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر' ایک آدھ چمڑے یا چٹائی کا فرش' کچھ پرانی شیشیاں اور دواؤں کی بوتلیں گرد' جس میں معلوم نہیں علم کا کتنا جوہر اور اخلاص کی کتنی تب و تاب ہوتی۔

شیخ الحدیث اپنی زندگی کے آخری برسوں میں مستقل طور پر سرزمین حجاز کو ہجرت فرما گئے تھے جہاں بالآخر دلی آرزو بر آئی اور وہ مدینہ منورّہ کی متبرک و مقدّس زمین ہی میں آسودہ ہوئے۔ مبارک ہیں وہ شب و روز جو ایک دھن 'ایک نصب العین اور ایک اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر گزر جائیں شیخ الحدیث کچھ کم سو کے پیٹے میں تھے لیکن ہوش و حواس لمحۂ آخر تک برقرار رہے۔ ان کی سب سے نمایاں صفت اور قرآن و معاصرین میں ان کا امتیاز وہ عالی جوہر بلند استعداد اور ہمّت تھی جو اللہ نے انہیں عطا فرمائی تھی ان کی اس علوئے استعداد کی شہادت بڑے بڑے اہل نظر نے دی اور بلاشبہ اس صفت کے بغیر یہ ترقیات اور کمالات ممکن نہیں۔ علم و تصنیف کا میدان ہو یا عبادت و قرب الٰہی خدمت و مہمانداری کا ہو یا زہد و توکل کا' ہر جگہ شیخ کی بلند ہمتی کے جوہر عیاں ہیں۔ دنیاوی مال و دولت کو انہوں نے کبھی توجہ کے قابل اور لائقِ التفات نہ جانا۔ بیش قدر تنخواہیں اور زرّیں مواقع انہوں نے پائے حقارت سے ٹھکرا دیئے۔ مہمانوں کی کثرت' مصارف کی زیادتی' ہجوم افکار و تردّدات کی روز افزوں ترقی' پے بہ پے جانکاہ حادثات اور جان سے زیادہ عزیزوں اور بزرگوں کی وفات کے داغ اور صدمے ہیں جن کا برداشت کر جانا اور ان سب کے باوجود زندگی کے معمولات طبیعت کی شگفتگی اور مہمانوں کے حقوق کی ادائیگی میں فرق نہ آنے دینا' غیر معمولی استعداد اور ہمتِ خداداد کے بغیر ممکن نہیں۔ انہوں نے اپنے لباس' زہد و توکل' بے اعتنائی اور وارستہ مزاجی سے تمام زندگی کام لیا مروّجہ سیاسیات میں کبھی وقت ضائع نہ کیا کانگریس اور مسلم لیگ کے شدید اختلاف' تھانہ بھون اور دیوبند کے بُعد کے دَور میں بھی شیخ الحدیث دونوں جگہ محترم و محبوب رہے اور ان کی ذات تمام تنازعات اور کشاکشوں سے الگ تھلگ رہی اس کا نتیجہ تھا کہ مختلف مذاق کے لوگ اور مختلف مشایخ سے تعلق رکھنے والے افراد اپنی علمی و عملی مشکلات اور الجھنوں کے موقع پر شیخ الحدیث کی طرف رجوع کرتے جن سے انہیں اطمینان بخش سرزمینِ مقدّس اور دیارِ حبیب ؐ سے ان کی روح اور قلب کو جو تعلق تھا اسے بیان کرنے کیلئے الفاظ نہیں ملتے۔ اسی محبت و اخلاص نے شیخ کے درس ان کی تصنیفات

Marfat.com

اوران کے بیعت وارادت کے تعلق میں وہ تاثیر اور وہ کیفیت پیدا کر دی تھی جو اہلِ عشق کے ساتھ مخصوص ہے۔

زمینِ حرم کی کس قدر عظمت و محبت شیخ الحدیث کے قلب میں تھی اس کے بہت سے واقعات درج کئے جا سکتے ہیں لیکن مشتے نمونہ از خروارے دو واقعات ہدیہ قارئین ہیں: "ایک مرتبہ حج کے زمانے میں شیخ کے معلّم مکّی مرزوقی کی کار حضرت کو حرم لے جانے اور لانے کیلئے مقرر تھی ایک دن نماز کے بعد شیخ حرم شریف سے باہر آئے لیکن وہاں موٹر موجود نہ تھی۔ ڈرائیور کو کہیں دیر ہو گئی تھی خدّام نے دوسری موٹر لانے کیلئے عرض کیا مگر منظور نہ فرمایا اور کہا بعد میں وہ بیچارہ آئے گا تو اسے پریشانی ہوگی ہم انتظار کر لیتے ہیں مگر حضرت شیخ کو ضعف اور معذوری کے باعث کھڑے رہنا دشوار تھا وہیں زمین پر بیٹھنے کا ارادہ کیا تو خدّام نے فوراً اپنے مصلّے بچھانا چاہے مگر شیخ نے اسے قبول نہ کیا اور بلا تکلّف زمین پر بیٹھ گئے خدّام نے جب ا کیا تو فرمایا: "تم اپنے لئے بچھالو میں تو یہاں کا غلام ہوں، زمین پر ہی بیٹھوں گا۔"

مسجدِ نبوی علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ و سلام میں روزانہ کئی کئی گھنٹے بیٹھنا ہوتا۔ حضرت معذوری کی وجہ سے چار زانو ہی بیٹھ سکتے تھے۔ پاؤں پر کمبل ہوتا تھا لیکن حضرت کا شدید اہتمام یہ ہوتا پاؤں کا رخ کسی حال میں بھی روضہ شریف کی طرف نہ ہو، حالانکہ چار زانو نشست میں پاؤں سیدھے ہی نہیں ہوتے جسے عرف عام میں پاؤں سامنے کرنا کہا جاتا ہے صرف انگلیوں کا رخ ہوتا ہے مگر شیخ اسے بھی کسی طرح گوارا نہ کرتے۔

فضائلِ حج میں شیخ الحدیث نے خود لکھا ہے: "مسجدِ نبوی میں سب سے افضل جگہ مصلّی شریف کی ہے جس کے ساتھ استوانہ حنّانہ ہے اگر ممکن ہو تو زائر کو یہاں پہلے دو نفل پڑھنا چاہئیں۔ غور فرمایئے 1344ھ میں شیخ کا قیام یہاں سال بھر رہا، مگر آپ فرماتے ہیں: "مجھے سال بھر میں کبھی وہاں کھڑے ہونے کی جرأت نہ ہوئی" اور اس کے بعد جب برابر حاضری ہونا شروع ہوئی تو دیکھا گیا کہ صرف پہلی بار 1383ھ میں شیخ نے مواجہ شریف پر حاضری دی اس کے بعد اقدامِ عالیہ کی طرف دیوار کے ساتھ جہاں عام طور پر فقراء بیٹھتے ہیں وہیں سے کئی گھنٹے صلوٰۃ و سلام پڑھتے رہتے...... عشاء کے بعد واپسی پر ریاض الجنّۃ میں دو نفل پڑھتے۔ کسی نے خیال کیا شاید حضرت شیخ ہجوم کی وجہ سے مواجہ شریف پر نہیں جاتے اس لئے عشاء کے بعد عرض کیا: "اب وہاں ہجوم نہیں حاضری دے لیں۔" فرمایا: "کل حاضری دے دی تھی۔" اگلے روز دوبارہ عرض کیا گیا تو آب دیدہ ہو کر فرمایا "بھائی! سامنے جانے کی مجھ میں ہمت نہیں، کس منہ سے جاؤں: پہلی دفعہ تو مولانا سیّد اسعد کے ساتھ حاضر ہو گیا تھا۔"

18 محرم 1397ھ کو شیخ نے ایک خط کے جواب میں لکھوایا: "حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی تمنّا تو مبارک ہے، مگر یہ وہبی چیز ہے۔" پھر ایک عزیز سے کہا: "مجھے خواب میں تو کئی دفعہ زیارت ہوئی، لیکن خود اس کی تمنّا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی خیال ہوتا ہے کس منہ سے حضور ؐ کے سامنے

Marfat.com

جاؤں؟" شیخ کے وصال کے بعد ان کے ایک عقیدت مند اور مرید صوفی محمد اقبال صاحب مدنی نے ان چالیس مکاشفات و مبشرات کا ایک پاکیزہ مجموعہ " بہجتہ القلوب " کے عنوان سے ترتیب دیا جو مدینہ منورہ میں قیام کے دوران میں گذشتہ برسوں میں شیخ الحدیث کو نصیب ہوئے اور جنہیں انہوں نے اپنے ذاتی روزنامچے میں درج کر دیا تھا ان مکاشفات و مبشرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کس قدر شفقت اور عنایت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ کو حاصل تھی۔

" آج صبح جمعتہ المبارک ۹ رجب 1401ھ احقر محمد اقبال حضرت شیخ زید مجدہم کی خدمت میں حاضر ہوا دیکھا کہ حضرت بہت خوش تشریف فرما ہیں' فرمایا: " آج بہت اچھا خواب آیا" پھر مندرجہ ذیل خواب سنایا جسے یہاں حضرت کے روزنامچے سے نقل کرتا ہوں۔ "رات کو نیند تو کئی دن سے نہیں آ رہی مگر کسی وقت اونگھ سی آ جاتی۔ شب میں زکریا نے خواب دیکھا کہ میری "اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالک" کا مسوّدہ پورا ہو گیا اور میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرنے کو چلا۔ داہنی طرف علامہ زرقانی اور بائیں طرف علامہ باجی میرے ساتھ ساتھ ہیں میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا تو حضورؐ کے ہاتھ میں "اوجز" کے مطبوعہ فارم تھے اور وہی تھے جن کا مسوّدہ میں لے کر گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت مسرّت فرما رہے تھے اور بہت دعائیں دیں جو مجھے یاد نہیں' اس خواب سے بڑی مسرّت ہوئی۔ "اوجز" کے بارے میں مقبول ہونے کی امید ہوئی۔ "

29 شوال 1395ھ کی شب حضرت شیخ کو سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ ارشاد فرمایا "وہ لاؤ اور سناؤ" رسالے کا نام تو یاد نہیں رہا لیکن وہ عربی زبان کی فوقیت و فضیلت پر تھا' اسی وقت خواب ہی میں رسالہ لکھنے کا ارادہ' بلکہ افتتاح بھی کر دیا۔ بہت روایات اور مضامین ذہن میں آئے اور بڑی اچھی ترتیب بھی آئی' مگر صحیح تفصیل یاد نہ رہی' چنانچہ ارادہ کر لیا کہ انشاء اللہ مدینے پہنچ کر تکمیل کروں گا۔

حضرت شیخ نے ایک رؤیائے صالحہ میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارک سنے: مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند ہے کہ یہ وقت ضائع نہیں کرتے۔" حضرت شیخ عاشقانہ انداز میں تواضع' عاجزی اور تذلّل کے ساتھ حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی جانب بیٹھتے تھے اور سرورِ پیغمبرانؐ آپ کو اپنے قربِ خاص اور دیگر مقاماتِ عالیہ سے مشفقانہ طور پر نوازتے اور سرفراز فرماتے۔ حضرت ہمہ وقت مشغول رہنا اور کوئی لمحہ ضائع نہ کرنا بچپن ہی سے فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ آپ کی مبارک زندگی اس مشغولی کی شاہدِ عادل ہے۔ ایک بزرگ کے مکاشفے میں سرور کائناتؐ نے فرمایا: "وہ یعنی شیخ الحدیث میرے قریب ہیں اور میں ان کے قریب ہوں۔ 4 رجب 1298ھ بروز جمعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مولانا عبدالحفیظ صاحب سے مکاشفے میں فرمایا: " زکریا کی خدمت کرتے رہو اس کی خدمت میری ہی خدمت ہے۔ " یہ بھی ارشاد فرمایا: "میں اکثر اس حجرے میں جاتا رہتا ہوں۔ " 16 رجب 1398ھ بروز اتوار مغرب کے بعد ایک بزرگ نے روضۂ اقدس پر مراقبے میں دیکھا کہ حضورِ اقدس

Marfat.com

صلی اللہ علیہ وسلم نے کنجیوں کا گچھا عطا کیا اور فرمایا: "یہ رحمت کے خزانے کی کنجیاں ہیں شیخ کو دے دو۔"

10 صفر 1400ھ دوپہر کو نبی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدرسہ علوم شرعیہ کے کمرے میں تشریف لائے۔ حضرت شیخ الحدیث کا قیام اس مدرسے میں نہیں تھا۔ حضورؐ نے فرمایا "انہیں ظہر کی نماز پڑھانے آیا ہوں" 28 ذی الحج 1399ھ شنبہ کی رات صلوٰۃ وسلام کے بعد ایک بزرگ نے دیکھا کہ شیخ الحدیث ٗ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بیٹھے ہیں اور حضورؐ بہت محبت سے ان کی طرف دیکھ کر فرما رہے ہیں "ہذا شیخ المشائخ المحبین۔"

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے: "جب میں ہندوستان میں تھا اور بارگاہِ نبویؐ میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل نہ ہوئی تھی ٗ البتہ اشتیاق از حد تھا اس زمانے میں خواب میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجھے زیارت ہوئی۔ دیکھا مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہیں انہوں نے آپؐ سے شکایت کی کہ زکریا کو آپ کی خدمت میں حاضری کا اشتیاق بہت ہو رہا ہے لیکن میرا یوں جی چاہتا ہے کہ کچھ اور کام اس سے لیا جائے۔ حضورؐ نے فرمایا: اسے آنے کا اشتیاق تو بہت ہے مگر میرا بھی خیال ہے کہ اس سے کچھ اور کام لے لیا جائے اس کے بعد میں حیرت میں پڑ گیا کہ میں کسی کام کا نہیں۔ ساری عمر یونہی بیکار ضائع کی اب کیا کام کروں گا؟ اور یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری کا اشتیاق میں کیا کروں؟ میرا منہ حاضری کا ہے ہی نہیں مگر چند دنوں کے بعد چچا جان کا واقعہ یاد آیا کہ جب چچا جان مولانا محمد الیاس صاحب مدینہ منورہ آئے تو ان کا ارادہ یہیں رہ جانے کا ہوا۔ روضۂ مقدس سے اشارہ ہوا کہ ہندوستان واپس جاؤ تم سے کام لینا ہے چچا جان نے فرمایا: "میں بہت دن تک پریشان رہا کر بولنا مجھے نہیں آتا۔ تقریر مجھے نہیں آتی میں ضعیف کیا کام کروں گا؟ کچھ عرصے بعد حضرت شیخ السلام مولانا حسین احمد مدنی کے بڑے بھائی مولانا سید احمد صاحب نے جب چچا جان کو پریشان دیکھا تو فرمایا: "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے یہ تو نہیں کہا گیا کہ تم کام کرو ٗ بلکہ یہ کہا گیا کہ تم سے کام لیا جائے گا کام لینے والا خود کام لے لے گا۔" اس کے بعد چچا جان کو اطمینان ہوا ہندوستان واپس آ کر تبلیغی کام شروع کیا اور ماشاء اللہ خوب چلا۔ میں نے بھی سوچا کہ حضورؐ نے یوں نہیں فرمایا کہ تو کام کر ٗ بلکہ یہ فرمایا کہ تجھ سے کام لیا جائے۔

حضرت شیخ الحدیث کو اللہ تعالیٰ نے جن خصائص و امتیازات سے نوازا ان میں ایک اہم نعمت آپ کی تصانیفِ عالیہ اور تالیفِ مبارکہ ہیں جن کی تعداد سو کے قریب ہے یہ کتابیں دو مختلف قسم اور طرز کی ہیں۔ اول: خالص علمی و تحقیقی ٗ دوم خالص دعوتی و اصلاحی ٗ اکثر عربی زبان ہیں اور ان سے راسخین فی العلم فیض اٹھا سکتے ہیں ان کتابوں کے مباحث بڑے عالمانہ اور محققانہ ہیں۔ ان میں اوجز المسالک شرح مؤطا امام مالک پندرہ جلدیں لامع الدراری شرح بخاری شریف دس جلدیں کوکب الدراری شرح ترمذی شریف چار

Marfat.com

جلدیں' بذل المجہود ' شرح ابو داؤد بیس جلدیں اور تراجم بخاری جیسی کتب نصف صدی سے زائد مدت کے اشتغالِ حدیث میں یہ بیش خدمت ——————

——— شروحاتِ حدیث وجود میں آئیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ ان کے لکھنے اور مرتّب کرنے میں کیسی کیسی قربانیاں حضرت شیخ الحدیث کو دینی پڑیں' کیسے کیسے اونچے عہدے اور بیش قیمت تنخواہوں کے وعدے ان کتابوں کی خاطر ٹھکرائے گئے اور کس قدر لذّاتِ دنیا جوانی کی امنگوں اور خواہشوں کو پامال کر کے حدیث شریف کے ان جواہر پاروں کو اہلِ علم تک پہنچایا گیا یہ امر کس قدر حیرت کا باعث ہے کہ شیخ الحدیث کے دونوں طرزِ تصنیف حد درجہ مؤثر اور کامیاب ثابت ہوئے پہلے طرز کے نمونے کی مثالیں اوپر درج کی گئیں۔ دوسرے طرز کا نمونہ حکایاتِ صحابہ اور فضائل کی مقبولِ عام کتابیں ہیں۔ فضائلِ نماز' فضائلِ اذان' فضائلِ ذکر' فضائلِ قرآن' فضائلِ حج' فضائلِ صدقات' فضائلِ تبلیغ اور فضائلِ درود وغیرہ وغیرہ۔ ان دونوں طرزوں کی جامع شمائل ترمذی کا ترجمہ و شرح خصائلِ نبوی ہے۔

حضرات اہل علم کے بعد دوسرا طبقہ دیندار اور دین پسند عوام کا ہے ان کیلئے شیخ الحدیث کی بہت سی تصانیف عام فہم اردو زبان میں ہیں۔ تبلیغی نصاب ان سب میں ممتاز اور عالم گیر ہے جو نو کتابوں پر مشتمل ہے ان میں قرآن و حدیث سے دین کا شوق پیدا کرنے والے مضامین اور واقعات ہیں۔ اس نصاب کی اشاعت لاکھوں سے متجاوز ہے ملکی اور غیر ملکی سب زبانوں میں اس کے ترجمے ہو گئے ہیں۔ اس نوع کی تصانیف کا سلسلہ شیخ کے انتہائی معذوری اور ضعیفی کے دور میں بھی جاری رہا۔ کتابوں کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں علمی و اصلاحی خطوط کا سلسلہ بھی ہے جن سے لاکھوں لوگ بقدرِ ضرورت فائدہ اٹھا رہے ہیں یہ تمام علمی و عملی کمالات ظاہر و باہر ہیں اسی طرح بے مثال یہ ریاضت' اتباعِ سنّت' زہد و قناعت' تقویٰ و تواضع ایثار و قربانی" سخاوت و تحمل اور متضاد کمالات کا جمع وغیرہ...... واقعات حضرت شیخ الحدیث کی سوانح میں بے شمار ہیں بلکہ یہ کہنا قطعی مبالغے سے پاک ہو گا کہ خود حضرت کی زندگی ایک کرامت تھی اور یہ واقعہ ہے کہ ان سب کمالات کا حقیقی تعلق اللہ اور قبولیتِ عند اللہ پر ہے اور یہی چیز ولایت کہلاتی ہے۔

Marfat.com

قاری عبدالرحمٰن پانی پتیؒ

آج سے سات سو برس پہلے غیاث الدّین بلبن شہنشاہِ ہند کے دورِ حکومت میں صحابیٔ رسولؐ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی انصاری" ہرات سے نکلے اور سیروسیاحت کرتے ہوئے پانی پت تشریف لائے۔ ارادہ صرف یہ تھا کہ اس دور کے مشاہیر علماء' بزرگانِ دین اور صوفیاء کرام سے ملاقات کریں' اس لئے پانی پت میں قیام فرمالیا تھا۔ غیاث الدّین بلبن کو آپ کی آمد کا علم ہوا تو اس نے ایک خاص سفیر کے ذریعے خواجہ کو پیام بھیجا کہ دہلی میں بھی قدم رنجہ فرمائیے۔ میں دست بوسی کا خواہشمند ہوں۔ آپ نے سفیر سے فرمایا: "فی الحال تو ہم پانی پت میں علماء' صلحاء اور اولیاء اللہ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ فرصت ہوئی اور جی چاہا تو دہلی بھی پہنچیں گے اور اس سفر میں ہماری نیّت بادشاہ سے ملاقات نہ ہوگی"۔ اتنا فرمادینا ہی بہت تھا بلبن کا سفیر خوش خوش واپس گیا اور جو کچھ خواجہ صاحب نے ارشاد کیا تھا من وعن عرض کر دیا۔ اس زمانے میں پانی پت باکمال بزرگوں اور اولیاء اللہ کا مرکز تھا۔ حضرت خواجہ شریف الدّین بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ' حضرت خواجہ علاؤ الدّین صابر کلیری قدس سرّہٗ العزیز کے خلیفہ حضرت خواجہ شمس الدّین ترک' پانی پتی اور حضرت مخدوم جلال الدّین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ جیسے عالی قدر بزرگ بقیدِ حیات تھے۔ خواجہ ملک علی ان سب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے اور خواجہ صاحب سے مل کر یہ سب بزرگ اتنے خوش ہوئے کہ دن رات صحبتیں اور مجلسیں رہنے لگیں۔ خود حضرت خواجہ علم وعمل میں ایک بلند مقام پر فائز تھے اور آپ کی پاکیزہ سیرت کا چرچا

Marfat.com

ہر طرف ہوتا تھا۔ انہی دنوں پانی پت میں ایک شخص شیخ علی فقی نے حضرت بو علی قلندر کے خلاف ایک فتوے کا محضر تیار کیا اور اس میں یہ ظاہر کیا کہ قلندر صاحب کے بعض اعمال شریعت کی نفی کرتے ہیں' لہٰذا یہ سزا کے حقدار ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ قلندر صاحب بحالتِ جذب دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ قصّہ مختصر کہ اس فتوے پر اس دور کے علماء نے جو قلندر صاحب کے مقام و مرتبے سے آگاہ نہ تھے اپنی اپنی مہریں ثبت کر دیں۔ یہ فتویٰ خواجہ ملک علی کے پاس بھی آیا اور کہا گیا کہ اس پر تصدیق فرمائیے۔ آپ نے دیکھا مسکرائے اور فرمایا:

"یہ بتائیے قلندر صاحب مالک ہیں یا مجذوب؟

عرض کیا گیا: "مجذوب ہیں۔"

یہ سنتے ہی خواجہ صاحب نے محضر چاک کر دیا ایک روز جب قلندر صاحب پر محو کی حالت طاری ہوئی۔ خدّام نے اس محضر اور اس کے چاک کیے جانے کا ذکر کیا اس پر قلندر صاحب اپنی جگہ سے اٹھے اور خواجہ ملک علی کے پاس تشریف لائے۔ فرمایا:

"اگر خدا کو منظور ہوا' تو تمہاری اولاد قیامت تک پانی پت میں آباد رہے گی۔ بڑے بڑے علما صلحا اور ذی اقتدار لوگ تمہاری نسل سے پیدا ہوں گے۔ خواجہ صاحب نے عرض کیا: "حضرت ہم لوگ مسافر ہیں سفر کی ماندگی دور کرنے کیلئے چند روز قیام کا ارادہ تھا۔ یہاں سے دہلی جائیں گے کچھ مدّت وہاں رہ کر اپنے وطن واپس ہو جائیں گے۔"

یہ سن کر حضرت شرف الدّین بُو علی قلندرؒ نے بڑے زور سے فرمایا:

"اب تو تمہارا وطن یہی جگہ ہے......یہی جگہ ہے......یہی جگہ ہے۔" تین بار یہ فقرہ دہرانے کے بعد زبانِ حقیقت سے ارشاد ہوا: "اب دہلی جاؤ اور بلبن سے ملاقات کر کے یہیں واپس چلے آؤ۔"

اس حکم کی تعمیل میں خواجہ صاحب دہلی تشریف لے گئے۔ غیاث الدّین بلبن بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا منصب قضا آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ عیدین کی خطابت بھی اس کے ساتھ تھی۔ چند مواضع اور زمینیں بھی ان عہدوں کے ساتھ ملیں۔ ہر چند آپ کو ان دنیاوی چیزوں سے دلچسپی نہ تھی لیکن بحکم قلندر صاحب قبول کیا۔ دہلی کے علما اور اولیا کے بارے میں ملاقاتوں کے بعد خواجہ صاحب واپس پانی پت تشریف لے آئے۔

کچھ عرصے بعد حضرت قلندر صاحب اور حضرت خواجہ شمس الدّین ترک پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ کے مشورے سے حضرت شیخ جلال الدّین کبیر الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک صاحبزادی فردوسہ کا عقد' خواجہ ملک کے بڑے صاحبزادے خواجہ نصیر الدّین سے کر دیا اور حضرت کبیر الاولیاء کی دوسری صاحبزادی زبیدہ کی شادی چھوٹے صاحبزادے خواجہ محمد مسعود سے ہو گئی۔ پانی پت کے انصار خواجہ نصیر الدّین کی اولاد میں سے ہیں۔ اس جلیلُ القدر انصاری خاندان میں سینکڑوں سپوت ایسے ہوئے ہیں جو اپنے اپنے دور

Marfat.com

میں آسمانِ علم وہدایت پر آفتاب بن کر چمکے۔ تیرہویں صدی ہجری میں خواجہ الطاف حسین حالی اور ان کے استاد حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی محدث انصاری دو ایسی ہستیاں ہوئی ہیں جن کے نام اور کام سے برِّ صغیر کا کونا کونا روشن ہوا۔ اس صحبت میں ہم زبدۃ الاتقیاء امام الفقہا راس المحدثین مجود اعظم حضرت مولانا قاری عبدالرحمٰن قدس سرّہٗ العزیز کا تذکرہ کریں گے جن کے تلانذہ میں برِّ صغیر کے مشاہیر کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔

آپ 1227 ہجری میں یعنی آج سے ایک سو اڑسٹھ برس پہلے اس عالمِ آب وگل میں تشریف لائے۔ آنکھ کھولتے ہی خانوادہ ولیُ الٰہی کی بہاریں دیکھیں۔ والد ولیِ کامل تھے تو نانا سلسلۂ چشتیہ صابریہ جلالیہ کی پشتینی جانشین...... طفولیت کا دور اپنے نانا حضرت پیر محمد ماہ رحمتہ اللہ علیہ کے سایہ میں گزرا۔ پانچ سال کی عمر میں والد صاحب نے بسم اللہ کرائی اور خود تعلیم دینی شروع کی۔ حضرت کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ وہ دن اور آج کا دن...... اللہ کے فضل سے اس کام میں لگا ہوا ہوں جس کی طرف والد صاحب نے ارشاد فرمایا تھا یعنی دین کا کام...... والد صاحب نے پہلے قرآن مجید تجوید کے ساتھ حفظ کرایا، پھر فارسی کی درسی کتابیں اور علم صرف کے چند رسالے بھی انہوں نے پڑھائے۔ حضرت نے یہ واقعہ بھی بیان کیا کہ بچپن میں ایک دن میں نے اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا تھا اس پر والد صاحب نے سبق نہیں پڑھایا مجھے اتنا رنج ہوا کہ رات کو کھانا نہ کھایا۔ والدہ رونے لگیں۔ والد کو معلوم ہوا تو والدہ سے کہنے لگے کہ یہ رنج کی بات نہیں بلکہ خوشی کا مقام ہے کہ اسے پڑھنے سے لگاؤ ہو گیا۔ والد کے مستقل طور پر دہلی میں قیام کے باعث آپ کا زمانۂ تعلیم اکثر و بیشتر وہیں بسر ہوا۔ آپ اپنے والد کی انگلی پکڑے بارہا حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی خدمت میں جایا کرتے۔ حضرت شاہ صاحب کے مواعظ بھی بہت سنے لیکن کم سنی کے سبب مضامین نہ سمجھ سکتے تھے۔ ابھی آپ کی عمر 13 سال کی تھی کہ والد نے رحلت فرمائی۔ آپ پانی پت چلے آئے۔ آپ کے ایک چچا قادری قادر بخش صاحب قلعۂ معلّیٰ دہلی میں مغل شہزادوں کے استاد تھے اور یہاں پانی پت میں والدہ کے سوا کوئی تربیت کرنے والا نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم سے طبیعت اچاٹ ہو گئی۔ شکار کا شوق جنگلوں میں لئے پھرنے لگا۔ بے پروائی یہاں تک بڑھی کہ ایک سال تراویح میں قرآن بھی نہ سنایا۔ والدہ یہ حالت دیکھ کر سمجھاتیں، کڑھتیں، ناراض ہوتیں اور جب کوئی حربہ کارگر نہ ہوتا تو رونے لگتیں۔ آخر ایک رات خواب میں والد کی زیارت ہوئی۔ انہوں نے ہاتھ پکڑا اور فرمایا: "میرے ساتھ آؤ۔" پھر وہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے اور عرض کیا: "فداک ابی وامی یارسول اللہ یہ عبدالرحمٰن حاضر ہے......" حضورِ پرنور ؐ اس وقت ایک چوکھٹ پر بحالتِ قیام جلوہ افروز تھے چنانچہ آپ نے دستِ مبارک بڑھایا اور عبدالرحمٰن کو آغوش میں لے کر سینۂ پرفیض گنجینہ سے چمٹا لیا۔ حضرت فرماتے تھے کہ بیداری کے بعد اتنا شرح صدر ہوا کہ مشکل سے مشکل کتاب کے معرکتہ الاراء مسائل پانی معلوم ہونے لگے۔ دقیق سے دقیق کتابیں معمولی مطالعے کے بعد

Marfat.com

آسانی سے حل ہو جاتیں اس واقعے کے بعد عجیب بات یہ ہوئی کہ آپ جس استاد کے پاس جاتے وہ نہایت لطف اور مہربانی سے پیش آتا حالانکہ اس سے پہلے بعض قریبی عزیزوں نے بھی پڑھانے یا نگرانی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

مشہورِ عالم قاری حضرت عبیداللہ عرف قاری لالہ ؒ ان دنوں میں پانی پت میں تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن نے دورِ قرآن مجید اور تجوید کا استفادہ ان سے کیا پھر دہلی چلے آئے اور اپنے چچا قادری قادر بخش سے قرآن کا دور بھی کرتے اور تجوید بھی سیکھتے۔ اس کے علاوہ آپ نے مولانا رشید الدّین خاں دہلوی سے فنِ نحو کی تحصیل فرمائی۔ ادب فقہ اصول اور معقولات کی کتابیں سرسری طور پر استاد العلماء مولانا مملوک علی نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔ پھر امروہہ تشریف لے گئے اور حضرت مولانا قاری شاہ امام الدّین صاحب سے قرأت کے علوم سیکھے۔ شاہ صاحب بزرگ آدمی تھے حضرت شاہ غلام علی دہلوی ؒ کے خلیفۂ مجاز تھے اور قصبے سے باہر ایک ویرانے میں قیام تھا جہاں کھانے پینے کو کئی کئی دن کچھ نہ ملتا۔ ایک دن اسی ویرانے میں بھوک سے بے تاب تھے کئی وقت کا فاقہ ہو چکا تھا یکایک ایک نامعلوم شخص آیا اور نہایت لذیذ کھانے دے گیا۔ جاتے ہوئے کہہ گیا کہ برتن فلاں جگہ رکھ دینا۔ آپ نے شاہ امام الدّین سے قرأت سبع تحصیل کی، پھر پوری مشکوٰۃ شریف اور صحیح بخاری کے نو پارے بھی آپ سے پڑھے۔ اس کے بعد آپ مولانا محمد قلندر صاحب محدّث جلال آبادی کی خدمت میں گئے اور ثلث بخاری اور کئی دوسری کتب ان سے پڑھیں۔ یہ بزرگ بڑے پائے کے عالم تھے۔ جلال آباد سے فارغ ہونے کے بعد مولانا عبدالرحمٰن پھر دہلی آ گئے۔ اور علومِ تقلید و عقلیہ کی جو کتابیں مولانا مملوک علی صاحب سے ناتمام پڑھیں تھیں اب پوری توجّہ اور انہماک سے دوبارہ پڑھیں۔ حضرت بعد میں فرمایا کرتے تھے کہ مولانا مملوک علی کی تعلیم میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی تھی ان کے جتنے تلامذہ ہوئے سب اپنے اپنے دوائر میں نامور اور فضل و کمال تھے اور ان کی فہرست بہت طویل ہے۔

1253 ہجری میں آپ حضرت شاہ محمد اسحٰق محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ درس میں داخل ہوئے جو حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے نواسے اور جانشین تھے۔ تحصیلِ علم میں مولانا عبدالرحمٰن کو اتنا انہماک تھا کہ بقول مولانا حالی: "زمانۂ طالبعلمی میں اگر کوئی ہم عمر یا عزیز دہلی سے ملاقات کیلئے جاتا تو اس سے السلام و علیکم یا سرسری ملاقات کے بعد صاف طور پر فرما دیتے کہ اس سے زیادہ فرصت نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ بامراد ملائے گا اس وقت ملیں گے۔"

حضرت شاہ اسحٰق کی مجلسِ درس میں دَورۂ حدیث ظہر کی نماز کے بعد ہوا کرتا تھا ایک روز دھواں دھار بارش ہونے لگی۔ جو طلبہ اس وقت حاضر تھے انہوں نے حضرت شاہ صاحب سے عرض کیا کہ قاری عبدالرحمٰن کی قیام گاہ دور ہے اور بارش تھمتی نظر نہیں آتی۔ غالباً وہ نہ آ سکیں حضرت سبق شروع کرا دیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا: "ابھی ٹھہرو، وہ ضرور آئیں گے۔" ابھی یہ الفاظ آپ نے کہے ہی تھے کہ

Marfat.com

قاری صاحب پائینچے چڑھائے اور کتاب ایک گھڑے میں حفاظت سے بند کئے مقررہ وقت پر پہنچ گئے۔ شاہ صاحب نے انہیں دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا: "لو دیکھو میں نے کیا کہا تھا! قاری صاحب آ گئے' آؤ اب سبق پڑھو۔"

ایک مرتبہ شاہ اسحٰق سخت علیل ہو گئے تو اس خیال سے کہ طلبہ کا حرج نہ ہو آپ نے قاری صاحب کو حکم دیا کہ مرزا حسن علی محدّث دہلوی سے سبق پڑھ لیا کرو چنانچہ آپ نے صحیح مسلم' ابو داؤد اور ترمذی مرزا صاحب سے پڑھیں۔ صحتیاب ہونے کے بعد شاہ صاحب نے ایک عظیم الشان جلسہ کیا اور اپنے دستِ مبارک سے حضرت قاری صاحب کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی اور فرمایا: "یہ سند و دستار مولوی صاحب کو علومِ ظاہری کی دی گئی ہے ارشاد اور خلافتِ باطنی کی سند مع خرقہ ہم ان کو پہلے دے چکے ہیں۔" ایک اور روایت یہ ہے کہ جب شاہ اسحٰق" قاری عبدالرحمٰن کو سندِ حدیث دینے لگے تو فرمایا: "میں قاری صاحب کو الفاظِ حدیث کی تحصیل سند دے رہا ہوں۔ معانیٔ حدیث میں نے خود ان سے اخذ کئے ہیں۔" یہ یقینی امر ہے کہ حضرت شاہ اسحٰق کا یہ ارشاد محض تواضع سے تھا لیکن اس سے شاگرد کی اہلیت اور وقعت جو استاد کے دل میں تھی ظاہر ہوتی ہے۔ خود قاری صاحب کا یہ حال تھا کہ جب شاہ اسحٰق" نے ہندوستان سے ہجرت کر کے مکّہ معظمہ تشریف لے جانے کا ارادہ فرمایا' تو آپ نے عرض کیا: "مجھ سے حضور کی مفارقت گوارا نہیں ہو سکتی اگر اجازت ہو تو ساتھ ہی چلا چلوں۔" مگر حضرت شاہ صاحب نے یہ فرما کر روک دیا کہ نہیں' تمہیں ابھی یہاں بہت سے کام انجام دینے ہیں یہ حکم سن کر اس وقت خاموش ہو گئے مگر چند ماہ بعد ایک قافلے کے ساتھ حج کیلئے حجاز روانہ ہو گئے اور ایک سال تک مکہ معظمہ میں قیام فرمایا' اس دوران شاہ صاحب سے دوبارہ ظاہری و باطنی استفادہ کیا اور حدیث کی تمام کتابوں کی مکرّر قرأت و سماعت کی۔ اس ایک سال میں جو درس آپ نے شاہ اسحٰق" سے لیا اس میں مشہور محدّث حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری بھی آپ کے ساتھ شریکِ درس رہے۔ مکّہ معظمہ میں جو کتب آپ نے شاہ صاحب سے پڑھیں ان سب کے آخر میں حضرت شاہ اسحٰق" نے اپنے قلم سے مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہے:

"یہ کتاب مولوی عبدالرحمٰن نے مکّہ معظمہ' عظیم حرمِ محترم میں مجھ سے پڑھی۔ مولانا الطاف حسین حالی سے ایک مرتبہ انہی دنوں کا ذکر فرماتے ہوئے قاری صاحب نے ایک واقعہ حضرت شاہ اسحٰق" کا سنایا۔ آپ فرطِ محبت سے شاہ عبدالعزیز دہلوی کو بڑے میاں صاحب اور اپنے استاد حضرت مولانا شاہ اسحٰق کو میاں صاحب کہا کرتے تھے۔ فرمایا: "حضرت میاں صاحب کی خدمت میں جب کبھی حاضری کی سعادت مجھے نصیب ہوتی' تو حضرت بالعموم فرما دیا کرتے کہ کھانا میرے ساتھ کھانا' لیکن حضرت کے ہندوستان سے ہجرت فرما جانے کے بعد جب میں مکّہ مکرّمہ پہنچا تو حضرت نے اس مرتبہ بالکل خلافِ معمول مجھ سے کھانے کیلئے نہ پوچھا مگر ویسے نہایت تپاک اور محبت سے ملے۔ میں سوچنے لگا نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ آج حضرت نے کھانے کے واسطے نہ فرمایا حالانکہ میں ہندوستان سے چل کر ہزاروں کوس کا فاصلہ

Marfat.com

طے کر کے حضرت کی خدمت میں پہنچا ہوں تاہم میں خاموش رہا اور دل میں خیال کر لیا کہ کوئی خاص وجہ ہو گی۔ ہندوستان سے چلتے وقت نواب صاحب باندہ حضرت کی نذر کیلئے ایک ہزار روپے مجھے دیئے تھے جب میں نے وہ رقم حضرت کی خدمت میں پیش کی تو آپ نے اسے قبول فرمانے کے بعد مجھ سے ارشاد فرمایا: قاری صاحب آپ کھانا ہمارے ساتھ کھایا کیجئے۔ " مجھے حضرت کے ارشاد پر بھی تعجب ہوا کہ روپے دینے سے پہلے تو کھانے کیلئے نہ پوچھا مگر روپے دیتے ہی فوراً کھانے کیلئے ارشاد فرما دیا۔ اس کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی اور وہ یہ کہ جب میں حضرت کی خدمت میں پہنچا تو اس وقت کئی دن سے حضرت کے ہاں فاقہ تھا اور کھانے کیلئے گھر میں کچھ بھی نہ تھا اس لئے حضرت نے مجھ سے کھانے کیلئے شروع میں نہ فرمایا:

"جب میں نے رقم پیش کر دی اور کھانے کا انتظام ہو گیا تو اس وقت معمول کے مطابق مجھے اپنے ساتھ کھانا کھانے کی عزت بخشی۔ " شاہ اسحٰق دہلوی جب ہجرت کیلئے دہلی سے روانہ ہو کر قطب صاحب میں ٹھہرے تو تمام عمائدِ شہر دہلی حضرت شاہ کی مشائعت کو وہاں تک گئے ایک عالم نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضرت دہلی کو علم سے خالی کئے جا رہے ہیں اپنا کوئی جانشین مقرر فرما دیجئے دوسرے حضرات نے بھی یہی گزارش کی مگر شاہ صاحب خاموش رہے جب بار بار عرض کیا گیا تو فرمایا:

" ہم نے قاری عبدالرحمٰن اور نواب قطب الدین خاں کو حدیث پڑھا دی ہے ان سے استفادہ کرو۔ "

نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی جب قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: "جو کتب خانہ شاہ اسحٰق نے ہجرت کرتے ہوئے اپنے ساتھ لیا اس کا وزن نو من تھا اس کے علاوہ جتنا ذخیرہ باقی رہا اس کے متعلق مجھے اور نواب قطب الدین خاں صاحب کو حکم دیا کہ یہ سب نیلام کر دیا جائے چنانچہ ہم دونوں نے یہ خدمت انجام دی۔ "

نواب ذوالفقار بہار والی ریاست باندہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے بیعت تھے انہوں نے حضرت شاہ اسحٰق سے درخواست کی تھی کہ حضرت اپنا کوئی خلیفہ باندہ کیلئے مقرر فرما دیں جو وہاں کے لوگوں کو فیوضِ ظاہری اور باطنی سے مستفید فرمائیں۔ شاہ صاحب نے وعدہ فرما لیا اور جب چند ماہ بعد ہندوستان سے ہجرت کا موقع آیا تو قاری صاحب کو بلا کر ارشاد کیا کہ آپ باندہ چلے جائیے' چنانچہ آپ اس حکم کی تعمیل میں باندہ چلے گئے نواب صاحب نے بہت قدر و منزلت کی اور جب آپ کے علم و فضل اور تقویٰ و طہارت کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو بہت مسرور ہوئے فوراً ایک مدرسہ حضرت کیلئے قائم کیا اور بے شمار طلبہ آپ سے درس لینے کیلئے آنے لگے۔ آپ کے شاگرد مولانا الطاف حسین حالی اپنے ایک مضمون میں قاری عبدالرحمٰن کی علمی قابلیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"ایک ایک کتاب کو بیس بیس تیس تیس مرتبہ اوّل سے آخر تک پڑھایا تھا۔ اس لئے یہ کتابیں ایسی منجھ گئیں تھیں کہ مشکل سے مشکل درسی کتاب بلا تردد اور بغیر مطالعہ کے نہایت عمدگی سے پڑھا دیتے تھے۔

Marfat.com

صحاح ستہ کو جس محدثانہ احتیاط کے ساتھ وہ پڑھاتے تھے اس کی نظیر کہیں نہیں دیکھی گئی۔"

نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو بھی حضرت قاری صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل ہے ان کی روایت ہے کہ میں حدیث سنانے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا چہل حدیث حضرت شاہ ولی اللہ اور اطرافِ بخاری سناتے وقت حضرت کے سامنے کوئی کتاب نہ تھی لیکن آپ نے مطالب کی تقریر جس جامع اور محدثانہ انداز میں فرمائی وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ پہلی حدیث پڑھ کر جب میں آگے بڑھا تو فرمایا: "ابھی ٹھہرو جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اسے دہراؤ۔" پہلی اور دوسری مرتبہ دہرانے میں جو کمی مجھ سے ہوتی اسے مکرّر تقریر فرما کر آپ دور کرتے۔ آخر تیسری بار میں نے پورا مضمون دہرا دیا۔ اب ارشاد ہوا آگے پڑھو۔ نواب صدر یار جنگ نے حضرت قاری صاحب کے حالات "معارف" اعظم گڑھ کے شمارہ مارچ 1931ء میں تحریر فرمائے تھے اس میں لکھتے ہیں:

"9 رجب 1311 ہجری کو زیارتِ قاری صاحب کی غرض سے دہلی سے روانہ ہوا پانی پت پہنچ کر بعد نماز عصر مسجد محلہ انصار میں قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ برادرم مولوی یونس خاں بھی ساتھ تھے بعد سلام و پرسش مزاج قاری صاحب کے جواب میں، میں نے کہا: "بھیکن پور میں رہتا ہوں اور محمد خاں زماں کا پوتا ہوں۔ جنہوں نے مسائل اربعین کے جواب لکھوائے تھے" خوش ہو کر فرمایا: "جس زمانے میں مولوی امین الدّین جواب لکھوا رہے تھے میں طالبعلم کی حیثیت سے حاضر مدرسہ ہوا کرتا تھا۔" بعد مکالمے کے میں نے شاہ ولی اللہ صاحب اربعین پڑھی جو میں ساتھ لے گیا تھا اس کے ختم ہونے پر برادر موصوف نے صحیح بخاری کی حدیث اوّل پڑھی۔ قاری صاحب کی تقریر مطالب کے بیان میں بہت نپی تُلی تھی۔ الفاظ بے تکلف ایک ایک ہو کر علیحدہ علیحدہ زبان پر آتے تھے بیان صاف تھا۔ الفاظ بقدر معانی محدثانہ احتیاط کلام سے ہویدا تھی۔ اثنائے گفتگو میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا ذکر فرمایا کہ شباب میں بینائی بالکل جاتی رہی تھی اکثر تصانیف حالتِ نابینائی کی ہیں اپنے تلمذ کے متعلق فرمایا کہ میں نے صحاح ستہ شاہ اسحٰق صاحب سے پڑھیں پھر سالہا سال تک مدرسے میں صبح سے عشا تک حاضر رہا۔ اس حاضری میں بہت سی کتابیں سماع میں آئیں۔ کلامِ مجید کی تفسیر تمام و کمال جناب میاں صاحب موصوف کی زبان سے وعظ میں سنی...... قاری صاحب کو اجازتِ حدیث مشائخ عرب سے بھی تھی جن میں سے بعض کی سند کا سلسلہ شیخ ابراہیم کُردی سے تھا اور بعض کا شیخ ابو طاہر سے۔"

فنِ تجوید و قرأت سبع کے معاملے میں حضرت قاری صاحب فردِ فرید تھے۔ علمائے بالعموم اس فن کو عملاً بالکل چھوڑ رکھا تھا حضرت نے اس طرف توجّہ فرمائی اور مدرسوں میں اسے عام کیا حتیٰ کہ علماء بھی اس فن کی تحصیل کو ضروری جاننے لگے۔ حضرت نے نماز تراویح میں تجوید کے ساتھ قرآن پڑھنے کی مثال قائم فرمائی اور یہ اسی کا فیض ہے کہ اب بکثرت ایسے حفّاظ اور قراء پائے جاتے ہیں جو قرآن مجید تراویح میں تجوید و ترتیل کے ساتھ سنا سکتے ہیں۔ حضرت کے پاس ذی وقار اور نامور علماء کا ہجوم رہتا، مگر جس وقت تجوید

Marfat.com

کا سبق ہوتا آپ کسی طرف التفات نہ فرماتے اس کے برعکس کیسی ہی معمولی قابلیت کا آدمی ہوتا اور یہ فن حاصل کرنا چاہتا آپ بڑے شوق اور فیاضی سے اسے پڑھاتے۔

مولانا اشرف علی تھانوی بھی آپ کے تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں اور آپ نے حضرت قاری صاحب سے تجوید کے اسباق پڑھے تھے ان کا ارشاد ہے کہ حضرت مولانا شاہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی قدس سرہٗ بالکل سادگی سے ارشاد فرماتے تھے جن قراء کا علم ناقص ہوتا ہے وہ اینٹھ مروڑ کر الفاظ ادا کرتے ہیں اور جو اس فن میں کمال رکھتے ہیں وہ بالکل سادہ طور پر پڑھتے ہیں۔ حتیٰ کہ عوام کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ قاری ہیں۔ مولانا تھانوی نے اپنے وعظ میں یہ لطیفہ بھی بیان فرمایا کہ ایک گنوار نے حضرت قاری عبدالرحمٰن پانی پتی سے قرآن مجید سنانے کی درخواست کی۔ حضرت نے اپنے سادہ انداز میں سنا دیا تو وہ کیا کہتا ہے "جیسا میں پڑھوں ویسا ہی تو پڑھے ہے فرق صرف یہ ہے کہ میں مردانی بولی میں پڑھوں ہوں تو جنانی (زنانی) بولی میں پڑھے ہے"۔ گویا اس نے حضرت کے علم تجوید اور باریک آواز کی یہ قدر کی۔ اس واقعے سے حضرت کا غایت درجہ اخلاص ثابت ہوا کہ مرجع خلائق ہونے کے باوجود جہلا تک کی خواہش رد نہ فرماتے تھے۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے بھی بچپن میں حضرت قاری صاحب سے قرآن پڑھا اور تجوید سیکھی تھی اس کے علاوہ حدیث کی تمام کتابیں بھی خواجہ صاحب نے حضرت قاری صاحب سے پڑھیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ قرآن مجید جس کی تلاوت و خدمت میں تقریباً اسی برس گزرے تھے گویا حضرت کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اس میں سرِ مو مبالغہ نہیں کہ اگر بالفرض تمام قرآن وہ سوتے سوتے ختم کر دیتے تو ان کو ایک جگہ بھی متشابہ نہ لگتا اور ایک حرف قواعدِ ترتیل و تجوید کے خلاف حضرت کے منہ سے نہ نکلتا۔ تمام حروف کو ان کے مخارج سے ادا کرنا حضرت کا سلیقہ اور طبیعت بن گیا تھا۔ حضرت قرآن مجید ذرا جلدی پڑھتے تھے مگر کیا امکان تھا کہ تجوید و ترتیل کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکلے۔

1857ء میں جب جنگ آزادی کا آغاز ہوا جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا تو آپ ریاست باندہ میں تھے ان دنوں بعض بے عقل لوگوں نے جوش و جذبے سے مغلوب ہو کر انگریزوں کے بے گناہ بچوں اور عورتوں پر دست درازی کی تو آپ ایسی حرکتوں سے نہایت ناراض ہوئے اور لوگوں کو علی الاعلان سمجھایا کہ ہمارے دین میں یہ باتیں سخت گناہ ہیں۔ انگریزوں سے جہاد یا جنگ کے جو طریقے دین نے تعلیم کئے ہیں ان پر بے شک عمل کرو مگر بے گناہ بچوں اور عورتوں کے قتل سے کیا فائدہ ہے؟ اتفاق ایسا ہوا کہ رات کی تاریکی میں پچھتر انگریز عورتیں بچے اور کچھ بوڑھے پناہ لینے کیلئے حضرت کے مکان پر آئے آپ نے انہیں اپنے مدرسے میں ٹھہرایا اور خدام اور طلبہ کو ہدایت فرما دی کہ ان بے کس انگریزوں کی مدد اور حفاظت خدا اور رسول ؐ کے حکم کے مطابق کرو۔ فتنہ فرو ہونے کے بعد یہ سب پناہ گزین حفاظت سے جانیں سلامت لے کر چلے گئے کچھ عرصے بعد کمشنر کی چٹھی آپ کے پاس پہنچی جس میں لکھا تھا کہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی جائیداد کے آپ مستحق سمجھے گئے ہیں کیونکہ آپ نے غدر میں سرکار انگریزی کی خیر خواہی فرمائی ہے۔ تشریف

Marfat.com

لا کر درخواست پیش کریں مگر حضرت نہ خود تشریف لے گئے نہ خط کا کوئی جواب بھیجا۔ آخر وہ خود حاضر خدمت ہوا اور اصرار کیا کہ جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اسے ضرور قبول فرمالیں۔ آپ نے فرمایا: "ہم نے ان پناہ گزین انگریز بچوں اور عورتوں کی مدد کسی دنیوی طمع اور لالچ سے نہیں کی تھی بلکہ مذہباً اور اخلاقاً ہمارا فرض تھا کہ مصیبت زدوں کو بچاتے۔ مجھے انگریزی حکومت سے کسی صلے کی ضرورت نہیں اور تمہاری ذاتِ خاص سے بھی کچھ نہیں چاہتا۔ مجھے معاف رکھو۔" اس واقعے کے راوی اور چشم دید گواہ مولانا الطاف حسین حالی ہیں۔

غدر کے بعد حضرت باندہ کا قیام ترک فرما کر مستقل طور پر پانی پت تشریف لے آئے اور دینی فیوض و برکات سے خلقت کو سیراب فرمانے لگے۔ حضرت کے ہاں حدیث تجوید اور قرات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ حضرت کے مشہور و معروف تلامذہ کی فہرست طویل ہے ان میں حضرت مولانا احمد علی صاحب مکی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی ابن مولانا مملوک علی حضرت مولانا قاری علی حسین صاحب رامپوری، حضرت مولانا راغب اللہ پانی پتی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سندھی مدنی، حضرت مولانا افضل احمد صاحب افغانی حضرت مولانا قاری عبدالهادی بھوپالی مولانا محمد ابراہیم صاحب کورنالی مولانا سیّد پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوری خواجہ الطاف حسین حالی حضرت گل حسن صاحب خلیفہ غوث علی شاہ صاحب قلندر پانی پتی شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حبیب الرحمٰن شروانی صدر یار جنگ کے اسمائے گرامی سرفہرست ہیں۔

حضرت کو احکامِ شرعیہ کی ترویج اور سنّتِ رسول علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کے اتباع کا از حد خیال رہتا۔ آپ جس مسلمان کو شریعت کے اصولوں کے خلاف عمل کرتا دیکھتے تو اسے اپنے قول و فعل کے ذریعے راہ راست پر لانے کی پوری کوشش کرتے اور اس مقصد کے سامنے کسی بڑے سے بڑے آدمی کی پرواہ نہ کرتے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ حضرت کے مواعظ اور آپ کی صحبتوں سے جن لوگوں کو استفادے کا موقع ملتا تھا انہوں نے صدہا رسوم اور بدعات صرف حضرت کی ہدایت کیلئے ترک کر دی تھیں اس کے علاوہ آپ حق بات کہنے میں بھی بے حد دلیر تھے چنانچہ اس کی ایک مثال تو وہ واقعہ ہے جس میں آپ نے حق گوئی کا ایسا نمونہ پیش فرمایا جو اس دور میں خال خال ہی نظر آتا تھا۔ روایت مولانا حالی مرحوم کی ہے اس لئے شک شبہے سے بالاتر سمجھی جائے گی۔ جامع مسجد دہلی میں کسی اندرونی تحریک سے بُلّی دار لال ٹینیں صلیب کے مشابہ لگائی گئی تھیں۔ حضرت عبدالرحمٰن پانی پتی نے یہ حرکت خلافِ ادبِ مسجد سمجھ کر عدمِ جواز کا بے دھڑک فتویٰ دیا۔ 1857ء کے غدر کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور انگریز حکّام ذرا ذرا سی بات پر مسلمانوں کے خلاف آتش زیر پا ہو جاتے تھے پھر مسلمانوں میں کئی جماعتیں ایسی تھیں جنہوں نے دنیاوی دولت اور اعزاز کے لالچ میں غیرت و حمیت تج دی تھی اور ایک دوسرے کے خلاف مخبریاں کرتے تھے۔ حضرت نے جونہی یہ فتویٰ دیا کہ ان صلیب نما قندیلوں کا جامع مسجد میں لٹکانا شریعتِ اسلامیہ کی رو سے

Marfat.com

ناجائز ہے ایک دینی جماعت کو حضرت کے خلاف سازش کا موقع مل گیا اور کمشنر دہلی کے کان بھر کر یہ رپورٹ کرا دی کہ قاری عبدالرحمٰن پانی پتی گورنمنٹ کے خلاف مسلمانوں کے جذبات بھڑکانے کی تگ ودو کر رہے ہیں۔ مگر قدرت کا انصاف دیکھئے کہ خود انگریز حکّام کے دل میں یہ بات آگئی کہ ان صلیب نما قندیلوں کا مسجد میں لگانا ہی غلط بات ہے۔ چنانچہ فوراً احکام جاری ہوئے اور وہ قندیلیں وہاں سے ہٹا دی گئیں۔

ایک مرتبہ حضرت نے سر سید احمد خاں کو ٹوک دیا تھا جیسا کہ سب کو معلوم ہے سر سید احمد خاں جدید تعلیم کے بیحد دلدادہ تھے اور حضرت سے ان کو بیحد عقیدت بھی تھی ایک روز آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جدید تعلیم کے فوائد بیان کرنے لگے آخر میں یہاں تک کہہ دیا کہ افسوس میں اس جدید تعلیم کے حصول میں ناکام رہا یہ سن کر حضرت نے فرمایا: "میاں، میں تمہیں کج رو تو سمجھتا تھا مگر اتنا نہیں، جتنا آج کی تمہاری گفتگو نے ثابت کیا ہے تم اپنی محرومی پر افسوس کرتے ہو اور مجھے تمہارے اس افسوس پر افسوس ہے۔"

حضرت دیانتداری سے جانتے تھے کہ یہ جدید تعلیم گاہیں کس قسم کے افراد پیدا کر رہی ہیں جو دین کے اخلاق و آداب سے کوسوں دور ہوتے ہیں لیکن اس جہالت کے باوجود آپ اپنے آپ کو دینی مسائل میں رائے زنی کا اجارہ دار سمجھ کر نت نئے فتنے پھیلانے کا باعث بنتے ہیں ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ جب سے مجلے (انگریزی مدارس) کھل گئے ہیں، قرآن حکیم اور علوم دین کا پہلا سا شوق نہیں رہا۔

سنت رسول ﷺ کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی جزئیات کا حضرت خیال رکھتے۔ ایک نوجوان عشاء کی نماز کے بعد حضرت کو گھر چھوڑنے جاتے ان کا بیان ہے کہ میں نے کئی بار یہ کوشش کی جب حضرت اندر تشریف لے جائیں گے تو میں پہلے السّلام و علیکم عرض کروں، مگر میری ہر ممکن سعی کے باوجود آپ نے ایسا موقع مجھے کبھی نہ دیا پہلے خود السّلام و علیکم کہتے اور پھر اندر تشریف لے جاتے۔ لوگوں کا' اپنے پیچھے پیچھے چلنا سخت ناپسند تھا۔ گلی یا بازار میں سے گزر ہوتا تو ایک طرف گردن جھکائے اور نیلی لنگی سر پر رکھ کر چلتے تعظیم کیلئے کوئی کھڑا ہوتا تو منع فرماتے اور کہتے کہ مجھے متکبروں کا یہ شیوہ پسند نہیں، بیٹھے کیوں نہیں رہتے؟

خواتین آپ سے بیعت ہونا چاہتیں تو اس کا طریقہ یہ تھا کہ تقریباً ڈھائی گز کا ایک عمامہ الگنی کے اندر ڈال دیا جاتا عورتیں اس عمامے کا دوسرا سرا پکڑ لیتیں، پھر آپ انہیں کلماتِ بیعت کی تلقین فرماتے۔ مولانا حالی لکھتے ہیں: "نماز سے حضرت نے عجیب طرح کا تعلق پیدا کیا تھا کہ اس کا وقت آتے ہی بے چین ہو جاتے اور جب تک نماز با جماعت اوّل وقت ادا نہ کر لیتے تو دنیا و مافیہا سے کچھ سروکار نہ رکھتے تھے۔ سخت سے سخت مرض میں بھی رمضان کے روزے اور ایک قرآن تراویح میں سنانا کبھی ترک نہ ہوا، حتیٰ کہ وفات سے چھ ماہ قبل رمضان المبارک میں باوجود کمال پیری و ناتوانی سارا قرآن تراویح میں سنایا اور تمام رمضان

Marfat.com

کے روزے رکھے۔ حضرت ان مشائخ میں سے تھے جن کی نسبت یجاھدون فی سبیل اللہ لا یخافون لومۃ لائم ارشاد ہوا ہے۔ جو کچھ حضرت کے دل میں تھا وہی زبان پر آتا جس بات میں خدا رسولؐ کی مرضی دیکھی، گو سارا زمانہ اس کے خلاف ہو، حضرت کو اس کے کرنے میں کچھ باک نہ تھا اور جس امر کو حکمِ الٰہی کے خلاف سمجھا گو ساری برادری اور کنبہ اسے اچھا جانے، آپ ہمیشہ اس کے مخالف رہے اور جہاں تک ممکن ہوا اس کے مٹانے کی کوشش کی۔ ملک کے ہر حصے سے سینکڑوں آدمی بیعت کیلئے روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ بظاہر مولویت کے لباس میں تھے لیکن در حقیقت بہت بڑے شیخ تھے۔

دنیوی شان و شوکت اور کرّوفر سے آپ کو سخت نفرت تھی غرباء اور مساکین سے بڑھ کر ملتے کسی بڑے سے بڑے شخص کی یہ مجال نہ تھی کہ آنکھیں چار کر سکے۔ قاری محی الاسلام صاحب اپنی تالیف "طبقات القرا" میں بیان کرتے ہیں: "خوش نما اور دلفریب چہرے سے ہیبتِ الٰہی برستی تھی ہر شخص کا جی چاہتا کہ رخِ انور کی بار بار زیارت کرے مگر خوف دوبارہ نظر ڈالنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ رعب اور دبدبہ بادشاہوں سے زیادہ تھا۔"

حضرت کی طبیعت میں استغنا حد درجہ تھا روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت لاہور تشریف لائے نواب محمد علی خاں والئ ریاست ٹونک کو پتہ چلا تو حضرت کی فرودگاہ پر حاضر ہوا اور جب تک حضرت کا لاہور میں قیام رہا، نواب صاحب اکثر زیارت کو آتے ...... لیکن اپنا مدعائے دلی ظاہر کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ آخر ایک روز باتوں باتوں میں کہہ ہی بیٹھے: "حضرت میں چاہتا ہوں کہ اپنی آخری زندگی کسی یادگارِ سلف بزرگ کی خدمت میں گزار دوں۔" حضرت نے یہ سن کر اس وقت تو کوئی جواب نہ دیا اور باتیں کرتے رہے جب نواب صاحب اٹھ کر تشریف لے جانے لگے تو حضرت نے ایک جذب و جوش کے ساتھ فرمایا: "آپ کے کلام کا مطلب یہ ہوا کہ عبدالرحمٰن آپ کی نوکری کرے؟ خبردار، ایسا خیال خام کبھی دل میں نہ لائیے گا تم اگر نوّاب ہو، تو ہم بادشاہ ہیں اگر کسی بادشاہ نے نواب کی نوکری کی ہو تو بتاؤ؟" اس گفتگو سے نواب پر ایسا رُعب طاری ہوا کہ بید کی مانند کانپنے لگے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی پھر معذرت کے بعد تشریف لے گئے۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے احوال و اعمال مخفی رکھنے کا بڑا اہتمام تھا۔ آپ کے ایک با اخلاص مرید مولانا محمد ابراہیم کا بیان ہے کہ ہم نے خود دیکھا ہے حضرت اپنے اذکار و اشغال اور نوافل و مستحبات تک کو ظاہر نہ ہونے دیتے تھے ایسا متعدد بار دیکھا گیا کہ حضرت تہجّد کے وقت ذکر و شغل اور مناجات میں مشغول ہیں۔ خدام و رفقا میں سے کسی کا کروٹ بدلنا بھی محسوس ہو گیا تو اسی وقت خاموش ہو کر وہیں لیٹ گئے اور سونے والوں جیسی شکل بنالی۔

جب تراویح میں قرآن سناتے یا ہزاروں کے مجمع میں وعظ فرماتے، تو ایک سناٹا سا چھا جایا کرتا، حالانکہ آواز بہت بلند تھی مگر یہ معلوم کر کے لوگوں کو بڑی حیرت ہوتی کہ دور والوں کو ایسا محسوس ہوتا جیسے قریب ہی سے بول رہے ہیں سامعین میں ہر طبقے میں لوگ ہوتے ہیں مگر کیا مجال کہ کوئی چوں بھی کرے۔ بڑے

Marfat.com

بڑے مشائخ اور علماء خواہ کتنی ہی بارُعب شخصیت کے مالک ہوں، حضرت کے سامنے مؤدّب اور چپ چاپ بیٹھتے تھے۔ ذی وجاہت اہلِ دنیا میں سے کوئی آتا تو وہ بھی آہستہ آہستہ مؤدبانہ عرضِ مدعا کرتا۔ فہم حدیث میں یہ کمالِ باطن حضرت ہی کو نصیب تھا کہ جس حالت یا جس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات فرمائی یا کی، حضرت اس حالت کا ایسا ہوبہو نقشہ کھینچتے کہ سامعین کی آنکھوں کے سامنے وہ منظر گویا جیتا جاگتا گھومنے لگتا۔ جنگِ بدر اور جنگِ احد کا وعظ میں جب تذکرہ کرتے تو سامعین محسوس کرنے لگتے گویا جنگ ان کے سامنے ہو رہی ہے حضرت کے مواعظ میں ہمیشہ غوث علی شاہ صاحب قلندر پانی پتی تشریف لاتے اور ادب سے دوزانو بیٹھ کر اوّل تا آخر وعظ سنا کرتے، حالانکہ خود بہت بڑے شیخ، عالم اور صوفی تھے۔ عصر کی نماز کے بعد روزانہ درگاہ حضرت بو علی قلندر" میں مولانا غوث علی کی مجلس ہوا کرتی تھی ایک روز انہوں نے فرمایا: "ہمیں خبر نہ تھی کہ ایسا باکمال صاحبِ باطن بزرگ پانی پت میں موجود ہے جس کی ایک ایک بات سے وہ علومِ باطن و معارف ہم پر منکشف ہوئے جو سالہا سال بڑے بڑے اشخاص کے پاس رہنے سے بھی نہیں کھلے تھے سیر و سیاحت میں عجیب عجیب شان کے مردانِ حق ہم سے ملے ہیں لیکن یہ کمال علمِ باطن ہم نے قاری صاحب کے سوا کہیں نہیں دیکھا۔"

معاصرینِ اولیائے کرام اور مشائخ آپ کا بیحد اکرام فرمایا کرتے تھے۔ حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی بڑی دوستی تھی اور حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز ہجرت سے قبل برابر پانی پت تشریف لاتے تھے۔ ہجرت کا جب ارادہ فرمایا اور انگریزوں کے جاسوس آپ کے تعاقب میں تھے تو حاجی صاحب، پانی پت محض حضرت قاری صاحب کی ملاقات کیلئے آئے اور چند روز موضع عزیز اللہ پور میں حضرت کے خادمِ خاص پیر محمد صاحب کے مکان پر قیام فرمایا اور بعد ازاں بخیر و عافیت مکّہ معظمہ پہنچ گئے۔

پانی پت کے حجاج جب حضرت حاجی امداد اللہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ ان سے ارشاد فرماتے کہ میں نے عالمِ باطن میں قاری صاحب کا بڑا رتبہ پایا ہے پھر زائر سے کہتے: "بھائی! السّلامُ و علیکم کے بعد میری طرف سے قاری صاحب کے دونوں پاؤں تعظیماً پکڑ لینا۔" قاری محمد ابراہیم صاحب کا بیان ہے کہ ایک شخص نے میرے سامنے پہلے تو حاجی صاحب کا سلام پہنچایا۔ پھر حضرت کے دونوں پاؤں پکڑ لئے اس پر حضرت اچھل کر فوراً پیچھے ہٹ گئے اور فرمایا: "ہائیں، کیا کرتے ہو؟ حاجی صاحب ہی اس قابل ہیں۔ میں نہیں ہوں۔" اللہ اکبر! ان بزرگوں میں کس قدر تقویٰ اور کتنی کسرِ نفسی تھی اپنے آپ کو بالکل مٹا رکھا تھا اور متکبّرین کو غربا نوازی کا طریقہ اپنے عمل سے سکھاتے تھے۔ خواجہ محمد صادق پانی پتی نے اپنا چشم دید واقعہ بیان کیا کہ حضرت کے ہاتھ پر ایک حلال خور نے اسلام قبول کیا۔ آپ نے اس کا اسلامی نام عبداللہ رکھ دیا تھا یہ شخص اسلام لانے کے بعد بھی پاک صاف اور اُجلا نہیں رہتا تھا اس لئے محلے کے شرفا اس کی میلی کچیلی حالت سے گھن کھا کر مسجد کے لوٹے چھپا دیا کرتے تاکہ یہ شخص انہیں ہاتھ نہ لگا سکے۔ حضرت نے یہ بات محسوس کر کے ایک دن سب محلے والوں کی موجودگی میں عبداللہ کو بلایا اور فرمایا: "میاں عبداللہ ذرا

Marfat.com

پانی مجھے پلانا۔" وہ انگلیاں ڈبوتا ہوا ایک پیالہ بھر لایا: فرمایا: "یہ تو زیادہ ہے اس میں سے کچھ تم پی لو اور باقی مجھے دے دو۔" وہ بے تامّل پی گیا اور اس سے بچا ہوا آپ نے پی لیا۔ اگرچہ آپ نے زبان سے کچھ نہیں فرمایا، مگر طرزِ عمل دیکھ کر سب حاضرین اور اہلِ محلہ نے ندامت اور شرم سے گردنیں جھکالیں۔

محلہ مخدوم زادگان پانی پت میں اللہ بخش نام کا ایک کہار رہتا تھا ایک مرتبہ وہ بیمار ہو گیا اس کی حالت سن کر آپ عیادت کیلئے تشریف لے گئے اس وقت آپ کے ہمراہ محلے کے ذی اثر شرفا اور باوقار علما کی ایک جماعت تھی اللہ بخش کا مکان نہایت تنگ اور ایسی جگہ تھا جہاں اکثر گندہ پانی اور کیچڑ جمع رہتی۔ حضرت نے ساتھیوں سے فرمایا: "آپ سب صاحبان یہیں ٹھہریں میں اللہ بخش کی طبیعت پوچھنے اس کے ہاں جاتا ہوں۔" چنانچہ آپ تنہا اس کے گھر تشریف لے گئے اور پوچھا: "میاں اللہ بخش کیسے ہو؟" اس نے پہچان کر عرض کیا: "حضرت اب تک تو بیمار تھا لیکن آپ کے تشریف لانے سے اچھا ہو گیا ہوں۔" کچھ دیر اس کی دلجوئی کر کے آپ باہر تشریف لائے ہی تھے کہ اللہ بخش کا انتقال ہو گیا۔

ایک بار کسی سادہ لوح دیہاتی مسلمان نے بڑے شوق و محبت سے حضرت کی دعوت کی اور کھیر جو آپ کیلئے پکائی اس میں بجائے کیوڑے کے کافور ڈال دیا۔ گویا اپنی دانست میں یہ بڑا تکلّف کیا تھا حضرت کے صاحبزادے مولانا عبدالسلام بھی دعوت میں ہمراہ تھے۔ انہوں نے جب کھیر میں کافور کی بُو پائی تو منہ بنایا اور اس دیہاتی کو زجر و توبیخ کرنے ہی والے تھے کہ حضرت نے اشارے سے انہیں فرمایا اور اپنے میزبان کا جی خوش کرنے کیلئے بظاہر وہ بدمزا کھیر مزے لے لے کر کھاتے رہے۔ دعوت کے بعد جب گھر آئے تو بیٹے کو تنہائی میں بہت سرزنش کی اور کہا کہ مسلمان کی محبت کا یہی صلہ ہے جو تم نے دیا؟ اس بیچارے نے تو سادگی اور لاعلمی میں ازراہِ تواضع یہ تکلف کیا تھا مگر تمہارے اتنے مزاج بگڑے کہ ذرا ضبط سے کام نہ لے سکے۔ یہ کام بھی حضرت میں تھا کہ نہایت لطیف طبع اور نازک مزاج ہونے کے باوجود آپ کو اپنی طبیعت پر پورا قابو تھا۔

آپ کی فطری عادت تھی کہ صدقات، خیرات، زکوٰۃ بالکل پوشیدہ ادا ہوں تاکہ جو شرفا اعلان پسند نہیں کرتے اور حقیقی طور پر مستحق ہیں ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگے اس کے علاوہ آپ ایسی نیکیوں کا اعلان بھی خلوص کے خلاف سمجھتے تھے۔ طبیعت میں لطافت بہت تھی اور اس کی بے شمار مثالیں دیکھنے سننے میں آئی ہیں مولوی حبیب اللہ صاحب پانی پتی کے صاحبزادے فوت ہو گئے تو حضرت تعزیت کیلئے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ مولوی حبیب اللہ کے بھائی حکیم امین اللہ کا بیان ہے کہ جب حضرت نے آواز دی تو میں آواز پہچان کر فوراً چارپائی باہر لایا جس پر آپ بیٹھ گئے۔ دوسری چارپائی آپ کے سامنے ٹیڑھی بچھی ہوئی تھی۔ اتنے میں بھائی حبیب اللہ بھی اندر سے آ گئے۔ السلام و علیکم اور مزاج پُرسی کے بعد بھائی صاحب نے حضرت کو پورا ملتفت نہ پایا، تو سبب پوچھا آپ نے فرمایا: "چارپائی اس طرح بچھائی گئی ہے کہ میری طبیعت متوجہ نہیں ہوتی پہلے اسے سیدھا کر دو پھر کچھ بات چیت کروں گا۔"

Marfat.com

یہ بھی عادت تھی کہ جس سے ایک بار تعلق ہو گیا پھر اسے ہمیشہ نبھاتے اہلِ حق کے مسلک پر کوئی چلنا چھوڑ دیتا تو خواہ کتنا ہی محبوب ہوتا پھر اس سے کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے اس لئے اپنے معتمد لوگوں پر زیادہ گرفت ہوتی تھی ہاں غیر متعلق لوگوں میں سے کوئی کسی عقیدے اور خیال کا کیوں نہ ہو اس سے نہایت گرمجوشی کا برتاؤ کرتے تھے۔ غیبت جوئی سے سخت نفرت تھی اول آپ کی مجلس میں کسی کو غیبت کرنے کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی لیکن اگر کوئی شخص ذکر چھیڑ دیتا تو فرماتے: "میں نہیں سنتا کسی کا نام میرے سامنے مت لو۔" اس امر کا اہتمام خلوت و جلوت دونوں موقعوں پر فرمایا کرتے۔ بحث مباحثہ بھی ناپسند تھا مسائلِ متنازعہ میں اپنے شیخ کے مسلک سے سرِ مُو انحراف نہ کرتے اور صاف کہہ دیتے میں نے حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے اور یہی میرا معمول ہے۔"

حضرت کی سادہ زندگی دیکھ کر ناواقف لوگ آپ کو معمولی شخص سمجھتے تھے آپ کی رفتار' گفتار اور کردار سے مسکنت نمایاں تھی۔ مولوی محمد ابراہیم صاحب کرنالی جنہیں سفروحضر میں مدتوں حضرت کی مصاحبت حاصل رہی لکھتے ہیں: "کبھی آپ کی زبان سے شاگردوں یا مریدوں کی نسبت شاگرد یا مرید کا لفظ نہیں سنا گیا ہمیشہ یہ فرماتے کہ فلاں صاحب میرے دوست ہیں یا مجھے ان سے تعارف حاصل ہے۔ جب کسی خادم یا شاگرد کو سفر میں ساتھ لیتے تو اسے "رفیق" کے لفظ سے یاد کرتے اگر کسی کے پاس کوئی پیغام بھیجتے تو فرماتے: "ان سے السلام علیکم کے بعد کہنا کہ عبدالرحمٰن نے یہ بات کہی ہے" اپنے شاگردوں' مریدوں اور مستفیدین سے اپنا ادنیٰ کام لینا بھی گوارا نہ فرماتے' ہاں کوئی شخص اگر تعلقِ استفادہ کے بغیر ازراہِ عقیدت کسی خدمت کا خواہش مند ہوتا تو بشرطِ بے تکلفی اس کی خدمت قبول کر لیتے تھے۔" شیخ محمد ابراہیم حسن صاحب جو پانی پت کے ایک معزز بزرگ ہوئے ہیں انہوں نے اپنی منظوم تصنیف "درۂ مُرتشی" میں حضرت قاری صاحب کا ایک واقعہ نظم فرمایا ہے جس کا خلاصہ نثر میں درج کیا جاتا ہے:

"میں حضرت کے پاس بیٹھا تھا آپ نے ایک خط لکھا اور اس انتظار میں تھے کہ کوئی خادمِ خاص نظر پڑے تو اس سے ڈاک میں ڈلوا یا جائے کسی شاگرد نے حاضرِ خدمت ہو کر عرض کی: "لائیے یہ خط میں ڈال آؤں اور بے حد اصرار کیا۔" حضرت نے فرمایا: "میں تم سے یہ کام لینا نہیں چاہتا' کیونکہ تمہارا تعلق میرے ساتھ تعلیم کا ہے میرا حقِ استادی سمجھ کر تم یہ خط ڈاک میں ڈالو گے میرے نزدیک یہ بھی ایک گونہ رشوت ہے اس کے بعد بوجہ اللہ تعلیم کا خلوص باقی نہ رہے گا لہٰذا میں تم سے یہ معمولی کام لے کر اپنا ثواب بھی کیوں ضائع کروں؟"

اللہ اکبر' کس قدر تقویٰ تھا! اس زمانے میں تو اتنی باریک بات کی طرف خیال بھی نہیں جا سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ تقوے سے وہ نورِ عقل مسلمان کو نصیب ہوتا ہے جس کی روشنی میں وہ صراطِ مستقیم سے بال برابر ادھر ادھر نہیں ہو سکتا۔

حضرت کو اپنی اور اپنے عزیزواقربا کی اولاد سے بڑی محبت تھی بچوں کو دیکھ کر خوش ہوتے اور ان

Marfat.com

سے ہنستے بولتے آپ کا معمول تھا کہ ہر جمعے کو صبح سویرے سب بچوں کو اپنے پاس بلاتے اور انہیں ایک ایک دو دو پیسے دیتے، بعض اوقات ہمسایوں کے یتیم بچوں کو بھی اپنے بچوں میں شامل فرمالیتے اور ہر ایک کے سر پر ہاتھ پھیر کر پیسے دیتے جاتے۔ آخر عمر تک یہی حال رہا آپ کی چھوٹی صاحبزادی جب بیوہ ہو گئیں تو حضرت کو ان کے ننھے ننھے بچوں کا بہت خیال تھا کوئی عمدہ چیز گھر میں آتی تو بچوں کو پاس بلا کر اپنے ہاتھ سے کھلاتے۔

آپ ہر جمعے کے جمعے وعظ بیان فرماتے۔ مولانا حالی کا ارشاد ہے کہ حضرت کے وعظ میں لغو داستانیں اور فضول قصے بالکل نہ ہوتے تھے اول قرآنِ مجید کی آیت تلاوت فرماتے پھر اس کے صاف اور سیدھے معنی بیان کرتے پھر اس کے بعد ضروری تفسیر اور مسائلِ فقہ جو آئمہ مجتہدین نے اس آیت سے استنباط کئے ہوں دراصل آپ کا وعظ درسِ قرآن ہوتا تھا۔ میرٹھ کے ایک بڑے رئیس جو پانی پت میں آئے ہوئے تھے مولانا گل حسن کے ساتھ وعظ میں بیٹھے تھے جب حضرت کا وعظ ختم ہو گیا اور سامعین مصافحے بھی کر چکے تو ان رئیس نے دریافت کیا: ''حضرت کو اس طرح وعظ فرماتے کتنا عرصہ گزر گیا؟'' مولانا گل حسن رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا: ''پچپن برس''

حضرت کو اپنے مرشد و استاد مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی رحمتہ اللہ علیہ سے اتنی محبت و عقیدت تھی کہ اخلاق و عادات تک میں شاہ صاحب کا اتباع فرماتے تھے: چنانچہ دیگر اُمور کے ساتھ تصنیف و تالیف کے معاملے میں بھی آپ نے اپنے شیخ کے مسلک کی پوری پیروی کی اور اپنے زمانے میں مرجعِ خلائق ہونے کے باوجود کوئی ایسی مہتم بالشان علمی یادگار نہ چھوڑی جسے آج پیش کیا جا سکے۔ بعض لوگوں نے حضرت سے یہ بات دریافت بھی کی تھی کہ آپ نے کوئی اہم کتاب تصنیف نہیں فرمائی اس کا کیا سبب ہے حضرت نے ارشاد فرمایا: ''بزرگوں نے تصنیف و تالیف کا اتنا ذخیرہ فراہم کر دیا ہے کہ اس کے بعد ہم جیسوں کو تصنیف کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔'' تاہم ضروریاتِ زمانہ کے مطابق آپ نے چند مختصر مگر مفید رسالے فارسی زبان میں تحریر فرمائے ہیں ان کے نام یہ ہیں رسالہ تحفہ نذریہ' فیوضِ رحمانی' کشفُ الحجاب' اور محو الفساد فی تلفظ الضاد وغیرہ ان رسائل کے علاوہ فتاویٰ کا ایک معقول ذخیرہ بھی ہے۔

جب حضرت کا سن چھیاسی برس کا ہوا تو قوائے جسمانی مضمحل ہونے لگے اور طرح طرح کے عوارض نے آپ کو گھیر لیا اوّل اوّل نقرس کا دورہ پڑنے لگا اس لئے پاؤں پر پٹی بندھی رہتی تھی پھر آنکھوں میں پانی اتر آیا چنانچہ آپ تے ماہر علاجِ چشم ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب سے مظفر نگر جا کر آنکھ بنوائی۔ یہی وہ سفر تھا جس میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب اور علماء دارالعلوم دیوبند نے حضرت سے شرفِ تلمذ حاصل کیا ہے۔ مظفر نگر میں آنکھ کا اپریشن نہایت کامیاب رہا اس کے بعد آپ قلمی کتاب آسانی سے پڑھ لیتے تھے۔

نقرس کی تکلیف اور آنکھوں کی اس کمزوری کے باوجود آپ اپنے سب مشاغل برابر انجام دیتے

Marfat.com

رہے۔ سلسلۂ فیوض وبرکات جاری رہا حتیٰ کہ جب آخری وعظ آپ نے جامع مسجد میں جمعے کے روز فرمایا اس وقت تک کسی کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ اجلِ مسمّٰی کا وقت آن پہنچا ہے مولانا حالی فرماتے ہیں:

"آپ کی عادت مستمرہ اس کلمے پر وعظ ختم کرنے کی تھی باقی بیان انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ ہو گا۔" اور اس آخری وعظ میں حضرت نے موت، تجہیز و تکفین اور تدفین کے مسائل بیان فرمائے اور باقی بشرطِ زندگی کہہ کر وعظ ختم فرمادیا۔ حضرت پر یکایک پیچش کے مرض کا دورہ پڑا جس کی شدت سے بعض اوقات آپ بے ہوش ہو ہو جاتے تھے۔

آناً فاناً بیماری کا چرچا سارے شہر میں پھیل گیا اولوگوں کے گروہ مزاج پرُسی کیلئے آنے لگے۔ مردانہ مکان کے ایک حصے میں اگنی ڈال کر پردے لٹکا دیئے گئے تاکہ عیادت کرنے والوں کو سہولت رہے اور زائرات بھی حضرت سے الگ نہ ہونے پائیں۔ ایک دن آپ کو مرض سے کچھ افاقہ ہوا تو دیکھا کہ ڈاکٹر کریم اللہ پاس بیٹھے ہیں ڈاکٹر صاحب مہاراجہ پٹیالہ کے معالجِ خصوصی تھے اور حضرت سے کمال درجے کی محبت اور عقیدت تھی۔ آپ بھی انہیں دیکھ کر بیحد خوش ہوئے اور فرمایا: "کیوں نہ ہو آخر محبت ہی تو ہے۔" غرض علاج ہوتا رہا لیکن حضرت کی حالت روز بروز گرتی چلی گئی۔ تیسری مرتبہ مرض کا ایسا حملہ ہوا کہ سب معالج بھی مایوس ہو گئے زائرین کا تانتا بندھ گیا پیر بقا اللہ صاحب کا بیان ہے کہ میں نے مولانا الطاف حسین حالی کو اس وقت بہت بے تاب دیکھا وہ ایک طرف بیٹھے زاروقطار رو رہے تھے۔ حضرت نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا میں نے فوراً حضرت کے قدم چوم لئے۔ مولانا حالی نے بھی اپنے استاد کی قدم بوسی فرمائی۔ آناً فاناً سارا شہر سوگوار ہو گیا۔ بازار بند کر دیئے گئے اور سب لوگ حضرت کے مکان پر سمٹ آئے۔ 5 ربیع الاوّل 1314 ہجری بمطابق 13 دسمبر 1896ء بروز دوشنبہ عصر سے ذرا پہلے علم وفضل اور زہدوتقویٰ کا یہ آفتاب ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا۔ اناللہ وانا علیہ راجعون ○ ۔ اس اندوہناک موقع پر مخلوق کی بے تابی اور رنج کا اندازہ مولانا حالی کے اس ارشاد سے ہوتا ہے کہ ہزاروں مرد عورتیں دھاڑیں مار مار رو رہے تھے اگرچہ تجہیز و تکفین میں بہت زیادہ جلدی کی گئی پھر بھی جنازے کے ساتھ پانچ ہزار آدمی تھے۔ پانی پت میں اس سے پہلے کسی میّت کے ساتھ اتنا ہجوم دیکھنے میں نہیں آیا۔ جنازے کے ہمراہ علماء، صلحاؒ اور نامور رؤسا کی بڑی تعداد تھی اور سب بے قرار نظر آتے تھے۔ حضرت کی میّت گھر کی چارپائی پر لے جائی گئی تھی اور گھر ہی کی چادر اس پر پڑی تھی۔ عشاء کی نماز سے ذرا قبل یہ گنجینۂ علم وفضل سپردِ خاک کر دیا گیا۔ قدس اللہ سرہٗ۔

مولانا حالی نے حضرت کے انتقال پر ایک پرُسوز مضمون تحریک فرمایا تھا اس کے آخری جملے یہ ہیں:

"نہایت افسوس ہے کہ پانی پت ایک ایسے بزرگ سے خالی ہو گیا جو نہ صرف پانی پت کیلئے بلکہ تمام مسلمانوں کیلئے قابلِ فخر تھا اور جس کا مثل آئندہ زمانے میں پیدا ہونا محالاتِ عادیہ میں سے معلوم ہوتا

Marfat.com

کردار کے غازی

مقبول جہانگیر

297.992
69 ک
96323

Marfat.com